عقیدۂ حاضر و ناظر پر معرکۃ الآرا کتاب
الشاہد
تصنیف
بحر العلوم مفتی عبد المنان صاحب اعظمی
تقدیم و تخریج
محمد حنیف خان رضوی بریلوی
امام احمد رضا اکیڈمی

عقیدۂ حاضر وناظر پر معرکۃ الآراء کتاب

الشاہد

تصنیف

بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب قبلہ اعظمی

علیہ الرحمۃ والرضوان

تقدیم وتخریج

محمد حنیف خاں رضوی بریلوی

ناشر

امام احمد رضا اکیڈمی، صالح نگر بریلی شریف

سلسلۂ اشاعت...................(۶۴)

نام کتاب..الشاہد

مؤلف...............................بحرالعلوم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ علیہ الرحمۃ والرضوان

کمپوزنگ وسیٹنگ...............................محمد نعیم نوری، محمد منیف رضا

اشاعت..بارسوم

سنہ..۱۴۳۴ھ/۲۰۱۳ء

بتعاون.......جماعت رضائے مصطفیٰ، حاجی علی ناتھا۔ بلیک برن (یو۔کے)

امام احمد رضا اکیڈمی، صالح نگر، بریلی شریف

E-mail.mohdhanif92@gmail.com

www.imamahmadrazaacademy.com

Mob: 8410236467

ملنے کے پتے

☆ کتب خانہ امجدیہ، مٹیا محل جامع مسجد دہلی ۶

☆ المجمع الاسلامی، ملت نگر مبارک پور ضلع اعظم گڑھ

☆ حق اکیڈمی، مبارک پور ضلع اعظم گڑھ

مختصر سوانح مصنف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

استاذ گرامی وقار شیخ الاساتذہ بحرالعلوم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ علیہ الرحمۃ والرضوان چودھویں صدی کے آخر میں ایک عظیم استاذ، ماہر مفتی، مایۂ ناز خطیب، صاحب طرز انشاء پرداز، ناشر رضویات، مصلح قوم وملت اور معمار سنیت وغیرہ اوصاف کثیرہ کے حامل بن کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔ اور پھر دنیائے سنیت میں آپ بحرالعلوم کے لقب سے جانے پہچانے گئے۔ ۱۴۲۰ھ کے بعد سے بحرالعلوم کی ذات تھی جو بقیۃ السلف اور حجۃ الخلف جیسے باوزن القاب کی مصداق اور اسلاف کرام کی روایات کی امین تھی۔ افسوس کہ آپ بھی ۱۴۳۴ھ کے شروع ہوتے ہی دار فانی سے دار جاودانی کی طرف انتقال فرما گئے۔

نام ونسب:

آپ کا نام: عبدالمنان، والد کا نام: عبدالغنی، دادا کا نام: عبدالرحیم، اور پردادا کا نام: دوست محمد ہے۔

آپ کے القاب میں دو لقب خاص طور پر مشہور ہوئے: بحرالعلوم۔ شیخ الاساتذہ۔ اول الذکر کی شہرت زباں زد خاص وعام ہے۔

مولد ومسکن:

آپ کی ولادت ۷/ربیع الآخر ۱۳۴۴ھ/ ۲۶/نومبر ۱۹۲۵ء کو ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ مبارک پور میں ہوئی۔ اور آخر عمر تک آپ کا یہی وطن رہا۔

وطن مبارک پور:

یہ قصبہ اپنے ضلع اعظم گڑھ سے شمال مشرق میں تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، اوراب روڈ کی مسافت کے حساب سے پندرہ کلومیٹر ہے۔

اس قصبہ کا قدیمی نام "قاسم آباد" ہے۔ جب اس بستی میں ویرانی کے آثار پیدا ہوئے تو چارسو چوراسی (۴۸۴) سال پہلے ۹۵۰ھ میں اس کو راجہ سید مبارک شاہ نے دوبارہ آباد کیا۔ آپ خاندان سادات سے حضرت امام باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سلسلہ چشتیہ حامدیہ کے بزرگ ہستی تھے، آپ کا وطن کڑا مانک پور ضلع پرتاب گڑھ تھا، ۲ر شوال ۹۶۹ھ کو مانک پور میں آپ کا وصال ہوا اور وہیں اپنے دادا راجا سید نور بن راجا سید حامد علیہما الرحمہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

قصبہ کا نام آپ ہی کے نام پر "مبارک پور" ہوا، اور آپ ہی کی طرف منسوب یہاں ایک عظیم الشان جامع مسجد ہے جہاں عموماً پورے قصبہ کے لوگ جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں۔

والد ماجد اور جد امجد:

بحر العلوم نے ایک دین دار گھرانہ میں آنکھ کھولی، آپ کے دادا جناب عبد الرحیم صاحب علیہ الرحمہ صوم وصلاۃ کے پابند اور ذاکر وشاغل بزرگ تھے، سلسلۂ عالیہ قادریہ میں صاحب کرامت بزرگ حضرت چمن شاہ صاحب گورکھپوری علیہ الرحمہ کے سجادہ نشین شاہ امان اللہ صاحب علیہ الرحمہ سے مرید اور صاحب اوراد ووظائف تھے۔ متصلب سنی تھے، آپ کے زمانہ میں محلّہ کی مسجد میں مقامی امام دیو بندی تھا مگر کبھی اس دیو بندی امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھی، ہمیشہ اپنی نماز مسجد میں تنہا ادا کرتے رہے۔ ۱۳۳۹ھ میں انتقال ہوا۔

والد ماجد عبد الغنی صاحب علیہ الرحمہ اردو فارسی کے تعلیم یافتہ تھے، ذریعہ معاش کے ساتھ کتابوں کا مطالعہ آپ کا مشغلہ تھا۔ پچاسوں کتابیں ان کے مطالعہ میں تھیں اور ضروری یادداشتوں کے لیے انہوں نے اپنی ایک کاپی بھی بنا رکھی تھی جس میں اہم باتوں کو نوٹ کرتے رہتے تھے۔

حضرت بحر العلوم سوانح خود نوشت میں تحریر فرماتے ہیں:

ان میں بھی مذہبیت اور دین داری کا غلبہ تھا۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور اوراد ووظائف کے عادی، حرام وحلال کی سخت احتیاط رکھتے تھے، کمزوروں اور ضرورت مندوں کی اعانت ان کا

محبوب مشغلہ تھا۔ تصلب فی الدین ان میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھا، گجرات کے شہر سورت میں کافی زمانہ رہے، حضرت مولانا حشمت علی خان صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور حضور سید شاہ علی حسین صاحب اشرفی کچھوچھوی علیہ الرحمۃ والرضوان کا آنا جانا بہت تھا، والد صاحب ان دونوں بزرگوں سے بہت متاثر اور ان کے معتقد تھے، ان کی کتابوں کے مجموعہ میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ''حسام الحرمین'' کا گجراتی میں حامل متن ترجمہ اور ایک دوسری گجراتی کتاب بھی تھی۔

چونکہ شروع سے ہی انہیں اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا خیال تھا، اس لیے کتابوں کے مجموعہ میں بوستاں سعدی کا ایک اچھا نسخہ اور پنج گنج وزبدہ کا ایک نسخہ بھی تھا، جب ضرورت پڑی تو میں نے ان دونوں کتابوں کو پڑھا۔ رحمهم الله تعالىٰ وجزاهم خير الجزاء۔

(سوانح خودنوشت مشمولہ فتاویٰ بحر العلوم ج ۱/ ۱۷)

تعلیم وتربیت:

اس سلسلہ میں بحر العلوم نے یوں تحریر فرمایا:

۴۹ھ یا ۵۰ھ میں جب میری عمر پانچ یا چھ سال کی ہوئی، قاعدہ بغدادی لے کر میں اشرفیہ میں داخل ہوا، اور سولہ سترہ سال بعد ۱۳۶۶ھ میں درس نظامیہ کی تعلیم مکمل کر کے فراغت حاصل کی، اول وآخر ساری تعلیم اشرفیہ کی دین ہے۔ میرے داخلہ کے وقت مدرسہ کی ایک دو منزلہ نیم پختہ سفالہ پوش ذاتی عمارت محلّہ پرانی بستی میں تھی جس کے پچھّم رخ صدر دروازہ پر تار کول سے ''مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم'' لکھا تھا۔ اور ابھی میں پرائمری درجات میں ہی تھا کہ حضور حافظ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تشریف آوری مبارک پور میں ہوئی، اور انہی کی تحریک اور کوشش سے قصبہ کے مرکزی مقام گولہ بازار میں اس کی دو منزلہ وسیع وعریض عمارت تعمیر ہوئی، اور اس کے صدر دروازہ پر ''دار العلوم اہل سنت مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم'' کندہ ہوا جو بعد میں کثرت استعمال سے ''دار العلوم اشرفیہ'' ہو گیا اور اس کا تاریخی نام ''باغ فردوس'' (۱۳۵۳ھ) تجویز ہوا۔

(سوانح خودنوشت فتاویٰ بحر العلوم ج ۱ص ۱۸)

اساتذۂ کرام:

آپ کے اساتذہ ... یہ ہیں:

(۱) جناب صوفی عبدالرحمٰن صاحب مرحوم ومغفور، پرانی بستی مبارک پور

آپ سے قواعد بغدادی اور قرآن کریم کے ابتدائی پاروں کا درس لیا۔ آپ مبارک پور پرانی بستی کے باشندے تھے اور سلسلۂ اشرفیہ کے تاج دار حضرت سید شاہ علی حسین اشرفی میاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مرید وخلیفہ۔

(۲) جناب حافظ عبدالغفور صاحب علیہ الرحمہ

آپ سے قرآن کریم ناظرہ مکمل کیا۔ آپ بھی مبارک پور محلّہ پورہ صوفی کے رہنے والے تھے۔

(۳) جناب منشی جواد علی خاں صاحب مرحوم

آپ سے پرائمری درجہ اول کی کتابیں پڑھیں، آپ بھی مبارک پور محلّہ پرانی بستی کے باشندے تھے۔

(۴) جناب منشی ممتاز احمد صاحب مرحوم

آپ نے پرائمری درجۂ دوم کا درس دیا، آپ محلّہ املو کے رہنے والے تھے۔

(۵) حضرت مولانا سید شمس الحق صاحب گجہڑوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

آپ نے فارسی کی تمام نصابی کتابیں اور عربی کی ابتدائی کتابوں کا درس دیا۔ آپ گجہڑا ضلع اعظم گڑھ کے باشندے تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل تھے، اس لیے ابتداء دیوبندی رہے، مگر آپ کے آباء واجداد روحانی بزرگ گزرے ہیں، ان کے تصرفات سے دیوبندی مذہب چھوڑ کر متصلب سنی ہو گئے، اور مصباح العلوم میں درس دینا شروع کیا۔

(۶) حضرت مولانا ظفر علی صاحب نعمانی بلیاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

آپ نے فصول اکبری کے چند اوراق کا درس دیا۔ آپ نے دارالعلوم اشرفیہ میں ہی درس نظامی کی تکمیل کی، پھر اشرفیہ ہی میں درس دینا شروع کیا۔ ۱۹۴۸ء میں کراچی پاکستان چلے گئے اور وہاں دارالعلوم امجدیہ قائم فرمایا، مدۃ العمر اس کے ناظم رہے اور ۲۰۰۳ء میں وہیں رحلت فرما گئے۔

(۷) حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب گھوسوی علیہ الرحمہ

آپ نے ہدایۃ النحو، شرح تہذیب اور تجوید کی متعدد کتابوں کا درس دیا۔ آپ نے درس نظامی کی تکمیل جامعہ سبحانیہ میں کی، ۱۹۳۵ء میں دارالعلوم اشرفیہ آئے اور دورۂ حدیث کیا۔

فراغت کے بعد اشرفیہ میں ہی درس دینا شروع کیا۔اس کے بعد بہت سے مدارس کو اپنے علمی فیضان سے سیراب کیا۔۱۹۹۵ء میں انتقال ہوا۔

(۸) حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب مئوی علیہ الرحمہ

آپ نے شرح وقایہ، کافیہ، شرح جامی بحث فعل، مقامات بدیع، مقامات حریری، مختصر المعانی، اصول الشاشی، حسامی، اور قطبی تصدیقات کا درس دیا۔آپ مئوناتھ بھنجن کے باشندہ تھے، مکمل تعلیم مئو کے مدرسہ اسلامیہ میں حاصل کی، ۱۹۳۵ء میں فارغ التحصیل ہوئے، ۱۹۳۶ء میں دارالعلوم اشرفیہ میں مدرس ہو کر آئے اور نائب شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔آٹھ سال تک اشرفیہ میں رہے، اس کے بعد ملک کے دوسرے عظیم مدارس میں درس دیا، بریلی شریف مدرسہ مظہر اسلام میں دو مرتبہ تقرر ہوا، دوسری مرتبہ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۵ء تک، اسی درمیان مجھے بھی شرف ملاقات حاصل ہوا جب میں کافیہ کی جماعت کا طالب علم تھا۔۱۵ر اگست ۱۹۹۰ء میں رات ۹ر بجے انتقال ہوا۔

(۹) رئیس المتکلمین حضرت علامہ حافظ عبدالرؤف صاحب بلیاوی

آپ سے قطبی تصورات مع المیر ، میر زاہد، ملا جلال، تشریح الافلاک، میبذی کا درس لیا۔اور فتویٰ نویسی سیکھی۔

آپ حافظ جی کے لقب سے مشہور تھے۔بھوج پور ضلع بلیا آپ کا وطن ہے، ۱۹۱۲ء میں ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ حنفیہ شاہی چبوترہ امروہہ ضلع مراد آباد میں داخل ہوئے۔پھر دارالعلوم اشرفیہ آئے اور آخر تک یہاں ہی رہے، ۱۹۴۲ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔جامعہ عربیہ ناگپور، پھر مظہر اسلام بریلی شریف میں رہے، حضور مفتی اعظم سے افتا کی مشق کی، اس کے بعد حافظ ملت نے حضور مفتی اعظم سے درخواست کی اور آپ کو اشرفیہ لے آئے، اور نائب شیخ الحدیث کے منصب پر فائز کیا، سارا نظم ونسق آپ سے متعلق کر دیا۔"دسنی دارالاشاعت" مبارک پور کا قیام آپ ہی نے فرمایا جس سے فتاویٰ رضویہ کی اشاعت ہوئی۔

(۱۰) حضرت علامہ محمد سلیمان صاحب بھاگلپوری

آپ سے قطبی کے چند اوراق اور ہدیہ سعیدیہ پڑھی۔

آپ کی ولادت مانجھی پور ضلع بھاگلپور میں ۱۹۱۰ء میں ہوئی، ابتدائی تعلیم کے بعد دارالعلوم اشرفیہ کچھوچھہ حضور محدث اعظم ہند کی خدمت میں رہ کر تعلیم حاصل کی، پھر

جامعہ نعیمیہ مراد آباد صدر الافاضل کی خدمت میں، اس کے بعد اجمیر مقدس صدر الشریعہ سے پڑھا حضرت صدر الشریعہ اجمیر مقدس سے بریلی شریف منظر اسلام تشریف لائے تو آپ بھی ساتھ آئے، اور یہاں سے فارغ التحصیل ہوئے، فراغت کے بعد جامعہ نعیمیہ مراد آباد، پھر ۱۹۳۷ء میں دار العلوم اشرفیہ آئے۔ ۱۹۷۷ء میں انتقال ہوا۔

(۱۱) حضرت علامہ عبد المصطفیٰ صاحب اعظمی

آپ سے مشکوٰۃ شریف کے ابتدائی اوراق، ہدایہ اولین اور میر زاہد رسالہ پڑھا۔

۱۳۳۳ھ میں محلہ کریم الدین پور گھوسی میں آپ کی ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ محمدیہ حنفیہ امروہہ میں داخلہ لیا۔ پھر صدر الشریعہ کے پاس منظر اسلام آئے، اور یہاں حجۃ الاسلام، صدر الشریعہ، مفتی اعظم ہند سے اکتساب فیض کیا۔ جب صدر الشریعہ مدرسہ حافظیہ دادوں ضلع علی گڑھ گئے تو آپ بھی ساتھ تھے، وہاں سے ہی ۱۳۵۶ھ میں فارغ ہوئے۔ ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء میں اشرفیہ آئے اور دس سال تدریس کے فرائض انجام دیئے، پھر دار العلوم شاہ عالم احمد آباد، مدرسہ منظر حق ٹانڈہ اور آخر میں براؤں شریف رہے۔ ۱۹۸۵ء میں انتقال ہوا۔

(۱۲) فاضل ازہر علامہ عبد المصطفیٰ رضوی ازہری شہزادۂ صدر الشریعہ

آپ سے ہدایہ اخیرین، طحاوی شریف، مسلم شریف، سبعہ معلقہ، دیوان متنبی، حماسہ، مطول، بیضاری اور انشاء کی مشق کی۔

آپ کی ولادت بریلی شریف میں ۱۹۱۸ء میں ہوئی، سیدنا اعلیٰ حضرت نے آپ کا نام عبد المصطفیٰ رکھا۔ والد ماجد سے اجمیر مقدس میں مکمل تعلیم حاصل کی، منظر اسلام سے فارغ ہوئے، پھر جامع ازہر مصر تشریف لے گئے اور ۳ رسال تحصیل علم میں مصروف رہے۔ مدرسہ سعیدیہ دادوں ضلع علی گڑھ سے درس کا آغاز کیا، ۱۹۴۴ء میں دار العلوم اشرفیہ آئے، تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے، وہاں جامعہ رضویہ منظر اسلام بھاگلپور، اس کے بعد دار العلوم امجدیہ کراچی میں شیخ الحدیث رہے۔ ۱۹۸۹ء میں انتقال ہوا۔

(۱۳) حافظ ملت علامہ شاہ عبد العزیز محدث مراد آبادی

آپ سے شرح جامی اسم، نور الانوار، توضیح تلویح، مسلم الثبوت، ملا حسن، حمد اللہ، قاضی مبارک، صدرا، جلالین شریف، مدارک شریف، مشکوٰۃ مکمل، ترمذی شریف اور بخاری شریف کا درس لیا

حافظ ملت کی ولادت ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء قصبہ بھوج پور ضلع مراد آباد میں ہوئی۔ قرآن

مجید کی تعلیم والد ماجد حضرت حافظ محمد غلام نور سے حاصل کی، جامعہ نعیمیہ میں چند سال تعلیم حاصل کر کے صدر الشریعہ کی خدمت میں اجمیر مقدس پہونچے، مکمل تعلیم وہیں حاصل کی، آخری سال میں بریلی شریف منظر اسلام صدر الشریعہ کے ساتھ آئے اور سند فراغ حاصل کی۔

۱۳۵۴ھ/۱۹۴۳ء میں مبارک پور مصباح العلوم مدرسہ اشرفیہ بحیثیت صدر المدرسین تشریف لائے۔ یہاں گیارہ ماہ بعد دار العلوم اشرفیہ قائم کیا، ۱۹۷۲ء میں قصبہ سے باہر الجامعۃ الاشرفیہ قائم فرمایا۔ ۱۹۷۶ء میں آپ کا وصال ہوا۔

ان حضرات کے علاوہ حضرت بحر العلوم کے دو استاذ اور ہیں جن سے آپ نے رمضان المبارک کی چھٹیوں میں فارسی کی کتابیں پڑھیں۔

(۱۴) حضرت مولانا نور محمد صاحب خطیب جامع مسجد مبارک شاہ، مبارک پور

(۱۵) حضرت مولانا محمد حاتم صاحب، محلّہ پورہ رانی، مبارک پور

امتحان وفراغت:

بخاری اور مسلم کی آخری حدیثیں آپ نے صدر الشریعہ سے پڑھیں، اس موقع پر صدر الشریعہ نے فرمایا: جس طرح ہمارے اساتذہ نے ہمیں کتب صحاح احادیث اور دیگر کتب حدیث کی روایت وتدریس کی اجازت دی، میں تم لوگوں کو بھی اجازت دیتا ہوں کہ احادیث کی روایت کرو، پڑھو اور پڑھاؤ۔

اس طرح آپ کے آخری استاذ حضرت صدر الشریعہ قرار پائے اور اساتذہ کی تعداد (۱۶) ہوئی۔

بخاری شریف کا امتحان محدث اعظم پاکستان حضرت مولانا سردار احمد صاحب شیخ الحدیث دار العلوم مظہر اسلام بریلی شریف نے لیا۔ حضرت بحر العلوم امتحان میں اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوئے۔

آپ کے رفقائے درس کی تعداد حسب ذیل ہے۔

(۱) اشرف الاولیا حضرت مولانا سید مجتبیٰ اشرف کچھوچھوی

(۲) حضرت مولانا مطیع الرسول صاحب گورکھپوری

(۳) حضرت مولانا مفتی عبد الرشید صاحب چھپراوی

(۴) حضرت مولانا قاری محمد یحییٰ صاحب مبارک پوری

(۵) حضرت مولانا عثمان صاحب حیدرآبادی
(۶) حضرت مولانا محمد ایوب صاحب جنید پوری
(۷) حضرت مولانا مفتی لطف اللہ صاحب علی گڑھی
(۸) حضرت مولانا عرفان احمد صاحب کلکتوی
(۹) حضرت مولانا مجیب اللہ صاحب بھاگلپوری
(۱۰) حضرت مولانا تاج الدین صاحب پنجابی
(۱۱) حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب حیدرآبادی
(۱۲) حضرت مولانا طفیل الدین صاحب

یہ بارہ رفقائے درس ہیں اور تیرہویں بحرالعلوم، اس طرح کل تعداد ۱۳ ہوئی۔

یہ نام رجسٹر معائنہ اور محصلہ نمبروں کے اندراج رجسٹر سے ماخوذ ہیں۔

راقم الحروف کی معلومات میں اب فقط حضرت مفتی لطف اللہ صاحب مدظلہ العالی ہی موجود ہیں اور فی الحال شہر متھرا کے مفتی اور وہاں کی جامع مسجد کے خطیب و امام ہیں۔

درس و تدریس:

آپ فارغ التحصیل ہونے کے بعد فوراً ہی شوال میں گورکھپور کے مدرسہ ضیاء الاسلام میں صدر المدرسین کے عہدہ پر فائز ہوئے اور ایک سال تک وہاں قیام فرمایا۔ اس زمانہ میں آپ نے وہاں سے ایک ماہنامہ ''الضیاء'' چار ورقی شائع کرنا شروع کیا۔

بحرالعلوم خود فرماتے ہیں:

مدرسہ کے سکریٹری جناب حافظ نیاز احمد اشرفی مرحوم کے مشورہ سے ایک چار ورقی رسالہ بنام ''الضیاء'' ہر ماہ شائع کرنا شروع کیا، مضامین عموماً فقیر کے ہی ہوتے تھے اور مصارف میں ہم دونوں شریک تھے، اشاعت اس کی مفت ہوتی تھی، اس میں شائع ہونے والے ایک طویل مضمون کو اس وقت بہت پسند کیا گیا، کئی پرچوں میں شائع ہوا، اور مبارک پور کی ایک دینی انجمن نے اسے مستقل رسالہ کی شکل میں شائع کر کے مفت تقسیم کیا۔ عنوان اس کا ''اسلام کا چوتھا رکن'' تھا۔

مدرسہ ضیاء الاسلام سے مستعفی ہو کر آپ نے مبارک پور اپنے گھر پہ ہی ایک سال گزارا۔ اس کے بعد تلسی پور ضلع گونڈہ مدرسہ انوار العلوم تشریف لے گئے۔

حضرت بحرالعلوم نے سوانح خودنوشت میں اس کی تفصیل یوں تحریر فرمائی:

سال بھر بعد وہاں سے علیحدہ ہوکر گھر رہا۔ شوال ۱۳۶۸ھ میں میرے ہم وطن اور رفیق مولانا محمد شفیع صاحب مرحوم مبارک پوری کے مشورہ سے تلسی پوری ضلع گونڈہ کے مدرسہ اہل سنت انوار العلوم قائم کردہ حضرت مولانا عتیق الرحمٰن خاں صاحب بستوی علیہ الرحمۃ والرضوان کی ملازمت اختیار کی اور ساتھی ہونے کی وجہ سے مولانا محمد شفیع صاحب کی تنخواہ میں کچھ اضافہ کر کے برابری کردی گئی اور عہدہ میں بھی صدارت اور نیابت کی کوئی تفریق قائم نہیں کی گئی، جب میں وہاں گیا تو تعلیم صرف کافیہ تک تھی جس میں ترقی ہوکر معیار تعلیم مدارک شریف اور ملاحسن تک اونچا ہوا۔ مدرسہ کے تعمیری اور تبلیغی شعبوں میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا اور مدرسہ فی الحقیقت دار العلوم ہوگیا۔ اس علاقہ میں پہلے سے ہی غیر مقلدین کا بڑا زور رہا تھا۔ ادارہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ مذہب حق اہل سنت و جماعت کو بھی غیر معمولی فروغ ہوا۔ اس وقت وہاں تین مصاحی جمع ہوگئے تھے۔ (فقیر، مولانا محمد شفیع صاحب اور مولانا حافظ قاری رحمت اللہ صاحب ادروی) وقت بہت اچھا گذرا بلکہ وہ یادگار دن تھے۔

دار العلوم اشرفیہ میں تقرری:

تلسی پور انوار العلوم میں آپ ۱۳۷۵ھ تک رہے۔ اس کے بعد آپ دار العلوم اشرفیہ تشریف لائے، یہاں کی ذمہ داریوں اور مناصب کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے تفصیل سے لکھا۔ فرماتے ہیں:

تقریباً آٹھ نو سال کے بعد اشرفیہ میری واپسی بصورت تدریس ہوئی۔ ۱۳۷۵ھ میں مولانا غلام جیلانی صاحب گھوسوی کے اشرفیہ چھوڑنے کے بعد ان کی جگہ حضرت حافظ ملت اور دیگر احباب کے مشورہ سے درجۂ عالیہ کے سربراہ کی حیثیت سے میرا تقرر ہوا۔

دار الافتاء کا قیام اور آپ کے فتاویٰ: اشرفیہ میں فتویٰ نویسی کا شعبہ قائم ہوا اور پہلے مفتی آپ ہی قرار پائے اور اس منصب پر آپ اکیس سال فائز رہے۔ اس لیے کہ فتاویٰ بحر العلوم میں درج فتاویٰ کے لحاظ سے پہلا فتویٰ آپ نے ۱۶؍ربیع الآخر ۵ ۷ھ میں تحریر فرمایا۔ پھر آپ نے اشرفیہ میں ۱۳۹۶ھ تک مسلسل فتاویٰ تحریر فرمائے۔ ان میں سے اکثر فتاویٰ پر حضور حافظ ملت اور استاذ العلما حضرت علامہ عبد الرؤف صاحب (عرف حافظ جی) علیہما الرحمہ کی تصدیقات ہیں۔

اس لیے کہ فتاویٰ کی تعداد جو فتاویٰ بحر العلوم میں درج ہیں (۱۳۴۹) ہے۔ ان میں سے (۷۸۴) فتاویٰ پر حافظ ملت اور حافظ جی دونوں حضرات کی تصدیق ہے اور (۶۱۰) فتاویٰ پر صرف حافظ جی کی۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے فتاویٰ تھے جن کو حضرت نے حذف فرمادیا، یا تو مکرر تھے یا پھر ان کو لائق اشاعت نہیں سمجھا۔ ایسے فتاویٰ بھی محتاط اندازہ کے مطابق ایک ہزار سے کم نہیں ہوں گے۔

۱۳۹۶ھ سے ۱۴۰۴ھ تک آپ نے الجامعۃ الاشرفیہ میں فتویٰ نویسی نہیں فرمائی۔ بلکہ صدر المدرسین اور شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے۔

شمس العلوم گھوسی میں تقرر:

۱۴۰۴ھ میں آپ الجامعۃ الاشرفیہ سے سبک دوش ہو کر گھوسی تشریف لے گئے، یہاں شیخ الحدیث اور صدر شعبۂ افتاء کے منصب پر فائز ہوئے اور تا حین حیات یہ مناصب علیا آپ سے ہی متعلق رہے۔ آپ نے یہاں کثیر فتاویٰ تحریر فرمائے، فتاویٰ بحر العلوم میں درج فتاویٰ کی تعداد (۳۳۴۵) ہے جب کہ یہ ۱۴۲۶ھ تک کے فتاویٰ ہیں، اس کے بعد بھی سات سال تک فتاویٰ لکھے، مولانا زینی دحلان صاحب جو آپ کے پوتے ہیں ان کا بیان ہے کہ ایک جلد کا اضافہ ضرور ہوگا۔ جب کہ چھ ضخیم جلدوں میں راقم الحروف نے ان تمام فتاویٰ کا مبیضہ کر کے فقہی ابواب پر مرتب کیا اور امام احمد رضا اکیڈمی بریلی شریف سے شائع کر دیا ہے اور مارکیٹ میں عام طور پر دستیاب ہے۔

مشاہیر تلامذہ:

آپ کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں میں ہے جو اس وقت ہندوپاک اور ان کے علاوہ دوسرے ممالک برطانیہ، امریکہ، افریقہ، ہالینڈ وغیرہ میں دینی خدمات انجام دے رہے ہیں، ان میں بڑی تعداد ان حضرات کی بھی ہے جو آج اساطین اہل سنت و جماعت شمار کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں:

محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری، شیخ الاسلام علامہ سید مدنی میاں، خیر الاذکیا علامہ محمد احمد مصباحی، مفکر اسلام علامہ قمر الزماں خاں اعظمی، شیخ المعقولات مفتی شبیر حسن رضوی،

مولانا اسرار احمد مصباحی، مولانا سید محمد جیلانی اشرف کچھوچھوی، مولانا نعیم اللہ خاں بستوی، مولانا سید محمد حسینی اشرفی مصباحی، مولانا سید رکن الدین اصدق مصباحی، مولانا بدر القادری مصباحی، مولانا محمد عبد المبین نعمانی مصباحی، مولانا یٰسین اختر مصباحی، نصیر ملت مولانا نصیر الدین مصباحی ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی، مولانا محمد ادریس بستوی مصباحی، مولانا قمر الحسن قادری، سراج الفقہاء مفتی نظام الدین رضوی، مولانا ممتاز احمد اشرف القادری، مولانا انور علی مصباحی، مولانا بہاء المصطفیٰ امجدی، مولانا مفتی عبد المنان کلیمی، مولانا محمد حسین ابو الحقانی مصباحی، مولانا ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم مصباحی، مولانا صغیر احمد جوکھن پوری، مولانا معین الحق علیمی، مولانا حبیب اللہ خاں مصباحی، مولانا رضوان احمد نوری شریفی مصباحی۔

آپ کے وہ قابل فخر تلامذہ جو اس دار فانی سے رخصت ہو گئے:

شیخ القرآن علامہ عبد اللہ خاں عزیزی، شیخ اعظم مولانا سید شاہ اظہار اشرف کچھوچھوی، شہزادۂ شیر بیشۂ اہل سنت حضرت مولانا مشاہد رضا خاں صاحب پیلی بھیتی۔

فتاویٰ رضویہ کی اشاعت:

استاذ العلما حضرت علامہ حافظ عبد الرؤف صاحب بلیاوی عرف حافظ جی نائب شیخ الحدیث اشرفیہ فراغت کے ایک سال بعد مظہر اسلام بریلی شریف میں درس وتدریس کے منصب پر فائز ہوئے، انہی ایام میں آپ نے حضور مفتی اعظم ہند کی خدمت میں رہ کر فتویٰ نویسی کی مشق کی اور خوب فیضیاب ہوئے۔ حضور حافظ ملت ایک موقع پر خود بریلی شریف حاضر ہوئے اور حضور مفتی اعظم سے عرض کیا: حافظ عبد الرؤف صاحب کو مجھے عنایت کر دیجیے، میرے یہاں ان کی سخت ضرورت ہے۔ حضرت نے حافظ ملت کی دلی خواہش اور اشرفیہ کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے اجازت عنایت فرما دی۔

پھر کسی موقع پر حضور مفتی اعظم جب اشرفیہ تشریف لے گئے تو حضرت حافظ صاحب نے عرض کیا، حضور کیا فتاویٰ رضویہ کی اشاعت کی کوئی سبیل نکلی، فرمایا: آپ لوگوں کے علاوہ کس سے اس کی توقع ہے، حضرت کا یہ جملہ حافظ جی کے دل میں ایسا جاگزیں ہوا کہ آپ بریلی شریف حاضر ہوئے اور حضرت سے گزارش کی کہ فتاویٰ رضویہ کا مخطوطہ عنایت فرما دیں، ہم اس کی اشاعت کا پروگرام بنا چکے ہیں۔ حضرت نے تیسری جلد سے آٹھویں جلد تک کل چھ جلدوں کا مخطوطہ عنایت فرمایا

حضرت حافظ جی نے مبارک پور جا کر سنی دار الاشاعت کے نام سے ایک مستقل نشریاتی ادارہ اسی کام کے لیے قائم فرمایا اور تیسری اور چوتھی جلد اپنے اہتمام سے شائع فرمائی۔

پانچویں جلد حضرت حافظ جی کے اہتمام میں لکھنؤ پریس جا چکی تھی کہ اسی زمانہ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ بہت سے کام اس جلد کے تعلق سے باقی تھے وہ حضرت بحر العلوم نے انجام دیے اور کتاب کی اشاعت عمل میں آئی۔

چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جلدیں حضرت بحر العلوم کی تحقیق و تقدیم اور آپ کے اہتمام سے شائع ہوئیں۔ حضرت حافظ جی اور حضرت بحر العلوم کی کاوشوں اور محنتوں سے یہ عظیم دینی سرمایہ چونتیس سال کی مدت میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ حضرت بحر العلوم نے اپنی گو ناگوں مصروفیات کے ساتھ بیس سال کا زمانہ اس میں صرف فرمایا۔

یہ دونوں حضرات کا اتنا عظیم کارنامہ ہے جس کی اہمیت کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو فتاویٰ رضویہ کے مطالعہ سے مشرف ہو رہے ہیں، آج ایک جہان فتاویٰ رضویہ سے استفادہ میں مشغول ہے اور اس کی مقبولیت کا آفتاب نصف النہار پر ہے، خدا نا خواستہ یہ خزانہ اگر پردۂ خفا میں رہ جاتا، یا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کی اکثر تصانیف کی طرح ضائع ہو جاتا تو یہ اہل سنت کا بڑا خسارہ اور نقصان تھا، بلا شبہ یہ ان دونوں حضرات کا ہم سب اہل سنت پر احسان عظیم ہے۔

تصانیف و تراجم:

آپ مسند تدریس کے بادشاہ تو تھے ہی ساتھ ہی ایک عظیم مصنف اور صاحب طرز ادیب و انشاء پرداز بھی تھے۔ درجنوں کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترجمہ و ترتیب کے تعلق سے علمی اور ادبی کارنامے انجام دیے۔ سیکڑوں مضامین و مقالات اور اصحاب تصنیف کے علمی جواہر پاروں پر تقاریظ بھی رقم فرمائیں۔ فتاویٰ بحر العلوم چھ جلدوں کے علاوہ آپ کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) محمد المثل الکامل عربی کا اردو ترجمہ

(۲) اعلیٰ حضرت کی عربی تصنیف شمائم العنبر کی تحقیق و تقدیم اور اردو ترجمہ

(۳) الشاہد۔ مسئلہ حاضر و ناظر پر

(۴) ازالۂ اوہام

(۵) مضامین بحر العلوم

(۶) مسئلہ آمین کی تحقیق قرآن وحدیث کی روشنی میں

(۷) عیدین کی تکبیرات زوائد

(۸) حیات صدر الشریعہ

(۹) تذکرۂ دعا گو درویش بابا

(۱۰) انوکھی لڑائی (واقعہ کربلا سے متعلق)

(۱۱) مختار الاحادیث (مجموعہ احادیث مع اردو ترجمہ)

(۱۲) خطبات بحر العلوم

(۱۳) حیات صدر الافاضل

(۱۴) اسلام کا چوتھا رکن (ماہ نامہ الضیاء کے مضامین کا مجموعہ)

مندرجہ بالا تصانیف وتراجم میں اکثر مطبوعہ ہیں۔ اور ابھی بہت سی کتابیں نامکمل تھیں کہ آپ ہم سب سے رخصت ہوکر دنیا سے تشریف لے گئے۔

حضرت بحر العلوم نے قلم وقرطاس کے ذوق کے آغاز اور تدریجی مراحل سے گزرنے اور پھر اس میں پختگی کے منازل سے ہم کنار ہونے پر اپنے انداز سے بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ سوانح خود نوشت میں تحریر فرماتے ہیں:

بچپن سے ہی مجھے قصے اور کہانیوں کا بڑا شوق تھا۔ اسی لالچ میں میں اپنے بچپن میں بھی بڑوں بوڑھوں اور بزرگوں کی مجلس میں بیٹھتا تھا اور ہم جولیوں کے ساتھ کم کھیلتا تھا۔ پڑھنے لکھنے کے بعد پتہ چلا کہ میرا یہ طرز عمل درست تھا، کیوں کہ ہم عمروں کا تو میری ہی طرح یہ حال تھا کہ ”او خویشتن گم است کرا رہبری کند“ وہ خود ہی بے خبر ہیں مجھے راستہ کیا بتائیں۔

جب کچھ پڑھنے لکھنے کی شد بد ہوئی تو اس شوق میں اور اضافہ ہوا، گھر میں جو والد صاحب کی کتابیں تھیں ان سے شوق پورا کرتا اور دوسروں کے ہاتھ میں کوئی کتاب دیکھتا تو اسے بھی دیکھنے لگتا۔

حضرت حافظ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مبارک پور آئے اور جلسوں کا سلسلہ شروع ہوا، ان جلسوں میں عام طور سے امام اہل سنت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نعتیں زیادہ پڑھی جاتی تھیں، ان میں کچھ ایسی دل آویزی تھی کہ ان پڑھ اور پڑھے لکھے، سمجھ دار اور نا

سمجھ سب کا سر ہل جاتا تھا۔ انہی متاخر الذکر لوگوں میں میں بھی تھا۔ کہ سمجھتا کم تھا مگر سننے میں مزہ آتا تھا۔ اتفاق سے حدائق بخشش کا ایک نسخہ میرے ایک ہم سبق کے پاس ملا جو اس کے دادا کا رکھا ہوا تھا، کاغذ اس کا معمولی سرخ اور پیلے اور ہرے رنگ کا تھا، لکھائی چھپائی عمدہ تھی، اور اس پر جگہ جگہ حاشیہ بھی چڑھا تھا۔ اس وقت اس کا معتدبہ حصہ میں نے نقل کر لیا تھا۔

جب فارسی پڑھ رہا تھا تو ایک صاحب نے مجھ سے اردو پڑھنے کی خواہش ظاہر کی، اگر چہ استاذ وشاگرد کی عمر میں بڑا تفاوت تھا، لیکن میں نے منظور کر لیا۔ اس کے والد تاریخی ناولوں کے بڑے دلدادہ تھے، جو کتاب بازار میں آتی اسے خرید لیتے، رات میں ایسے ہی شائقین کی نشست ان کے یہاں ہوتی، اور انہیں میں سے ایک خواندہ آدمی اس کو پڑھتا، اس لیے ان کے گھر اسلامی تاریخی ناولوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا۔ ان صاحب کو تو اردو سیکھنے کی توفیق کم ہی ہوئی میں نے البتہ ان کی کتابوں سے خوب فائدہ اٹھایا، دوپہر کی چھٹی میں روزانہ ان کے گھر جاتا اور وہ کتابیں پڑھتا رہتا، عرصہ تک میرا یہ مشغلہ جاری رہا۔

درس نظامیہ کی تعلیم کے ابتدائی سالوں سے ہی میں اشرفیہ کے طلبہ کی لائبریری اشرفی دارالمطالعہ کا لائبریرین رہا، اس کے نتیجہ میں مجھے پڑھنے کے لیے کتابوں کا وافر ذخیرہ ملا، اور موضوع میں بھی وسعت ہوگئی، ہر قسم کے رسائل اور کتابیں مطالعہ میں آئیں اور میں اس قابل ہو گیا کہ ... میں آنے والوں کو ان کی مطلوبہ کتابوں کے مواد کی خوبی یا خرابی بتاتا، اور انہیں کتابوں کے انتخاب میں مدد دیتا۔

اس سے لاشعوری طور پر مجھے یہ فائدہ ہوا کہ میرے ذہن میں الفاظ کا قابل ذکر ذخیرہ جمع ہو گیا، مختلف جملوں کی ترکیب، اسلوب بیان اور مافی الضمیر کی ادائے گی پر قدرت حاصل ہوئی جس کا علم مجھے بعد میں ہوا کہ "نئے چراغ جلانے کے لیے پرانے چراغ سے اکتساب ضروری ہے"۔

گلستان سعدی پڑھنے کے زمانہ میں اس کا ایک باب نقل کیا کہ بعد میں توفیق ہوئی تو اس کا ترجمہ نقل کریں گے۔ نحو میر پڑھنے کے وقت پوری کتاب کا ترجمہ کیا، اور اسے والد کے پاس جو اس وقت سورت میں تھے بھیجا کہ اس وقت یہ کتاب پڑھ رہا ہوں۔

دروس الادب پڑھنا ہوا تو اس کا کوئی فاضل نسخہ مدرسہ میں نہیں تھا، تو پوری کتاب نقل کر

کے پڑھی۔ اس وقت وعظ اور تقریر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ان ساری تفصیلات کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ اس وقت ہمارے نصاب میں انشاء اور مضمون نگاری کا کوئی گھنٹہ نہ تھا بطور کورس یہ مضمون پڑھایا نہ جاتا تھا۔ پس اس سلسلہ میں جو کچھ ہوا سب لاشعوری طور پر بے قصد وارادہ ہوا، اور اسی سے میرے اندر تحریر کا شعور بیدار ہوا۔

غالباً ۱۳۶۲ھ میں جب میں جلالین شریف پڑھ رہا تھا، طلبہ کی لائبریری میں کئی اخبار آتے تھے، رامپور سے حضرت فضل حسن صابری مرحوم ومغفور کی ادارت میں دبدبۂ سکندری نام کا ایک ہفتہ وار اخبار شائع ہوتا تھا۔

رجب شریف کے موقع پر معراج شریف کے عنوان سے ایک مضمون اپنے مخلص دوست عالی جناب قاری محمد یحییٰ صاحب کے نام سے بھیجا اور دبدبۂ سکندری میں شائع ہو گیا۔ اشاعت سے قبل کسی سے اصلاح نہیں لی تھی۔ مضمون چھپ کر آیا تو حضور حافظ ملت کو پڑھ کر سنایا، آپ بے حد مسرور ہوئے اور ایک روپیہ انعام میں دیا، اسی دوران میرے کئی مضمون دبدبۂ سکندری میں شائع ہوئے، جس میں ایک مضمون کا عنوان ''کربلا کی ضرورت'' تھا جو کافی مقبول ہوا، اور بعد میں کئی اخبار ورسائل میں شائع ہوا۔

حضرت تاج الفحول مولانا ہدایت رسول لکھنوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اولاد واحفاد میں مولانا محمد عمر صاحب علیہ الرحمہ تھے جو لکھنؤ سے ہی ایک دینی پرچہ شائع کرتے تھے، ان کے تقاضا پر ایک مضمون ''فلسفۂ شہادت'' لکھا جس کو انہوں نے ماہنامہ میں شائع کیا، اس سے لکھنو کے شیعہ پریس والوں نے محرم کے موقع پر اپنے مشن کی طرف سے شائع کیا، پھر دو تین سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ الغرض ادارہ میں طلبہ، ان کی انجمن اہل سنت واشرفی دار المطالعہ، اور خود ادارہ کی تحریری ضرورتوں میں ہاتھ بٹاتا رہا اور تعلیم کے ساتھ ساتھ مشق سخن کا مشغلہ بھی جاری رہا۔

تلسی پور پہنچا تو وہاں ایک غیر مقلد مولوی عبد الرؤف جھنڈے نگری اور حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب بستوی مرحوم بانی دار العلوم انوار العلوم تلسی پور میں مسئلہ حاضر وناظر پر تحریری تبادلہ ہو رہا تھا۔ جھنڈے نگری صاحب کی طرف سے ''رسالہ تردید حاضر وناظر'' شائع ہوا تھا۔ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے اس کے جواب کی ذمہ داری میرے سر ڈالی۔ فقیر نے ''الشاہد''

کے نام سے اس کا جواب لکھا جو اس وقت شائع ہوا جب میں مبارک پور آ گیا۔ اس رسالہ کی تردید بستی کے کسی رئیس آزاد صاحب نے ''ابطال شواہد الشاہد'' شائع کی۔

جب ''الشاہد'' کے دوسرے ایڈیشن کی باری آئی تو لامحالہ دھیان ابطال کی طرف بھی ہوا۔ اس طرح اب وہ ایک مبسوط رسالہ ہو گیا جسے حق اکاڈمی مبارک پور نے شائع کیا۔

تلسی پور کے ہی دوران قیام خطیب مشرق حضرت مولانا مشتاق احمد نظامی نے ممبئی سے پاسبان شائع کرنا چاہا اور کچھ لکھنے کی فرمائش کی تو اس کے سب سے پہلے رسالہ میں فقیر کا مضمون ''حدیث شب'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ پھر عرصہ تک اس میں ماہ بماہ لکھتا اور مولانا مرحوم فقیر کا نام رفقائے ادارہ میں شائع کرتے رہے۔

مبارک پور آنے کے دوسرے ہی سال سے میری مصروفیات میں افتاء کا اضافہ ہوا، اس لیے اس زمانہ کی زیادہ تحریریں سوال جواب کے روپ میں ہیں۔ بدعت کے سلسلے میں ایک جواب جو ذرا طویل ہو گیا، مولوی محمد احمد صاحب مصباحی مرحوم نے رسالۂ فیض الرسول براؤں شریف میں شائع کیا، اس کو مولانا مقبول صاحب الہ آبادی نے مکتبہ الحبیب الہ آباد سے رسالہ کی صورت میں شائع کرایا، اور اس کا یہ نام بھی انہوں نے ہی تجویز کیا کہ ''بدعت کیا ہے'' اسی طرح قبر کی اونچائی، اور مسجد میں نماز جنازہ پر بھی طویل تحریریں ہو گئیں جو فیض الرسول میں شائع ہوئیں۔

برجو نالہ کلکتہ کے آس پاس ایک جاہل رٹائر پولیس مین گمراہی پھیلا رہا تھا ادھر عامۃ المسلمین میں بڑی شورش پھیل رہی تھی، برجو نالہ کے رئیس جناب مقبول احمد انصاری نے اس کے بارے میں ایک استفتا کیا جس کے جواب میں ''ازالۂ اوہام'' کے نام سے ایک رسالہ تیار ہو گیا، جسے مبارک پور کی ایک اسلامی انجمن نے شائع کیا اور اس کی کئی سو کاپیاں شورش زدہ علاقہ میں تقسیم کی گئیں، اور جناب مقبول احمد صاحب نے بھی پوری جدوجہد کی جس کے نتیجہ میں وہ فتنہ بھی وہاں سے دفع ہوا۔ فالحمد للہ تعالیٰ۔

مبارک پور میں ایک بار پالن حقانی کا گزر ہوا۔ اور اس نے ندائے یارسول اللہ کے موضوع پر ایک نہایت دل آزار تقریر کی جس سے طبقۂ اہل سنت وجماعت میں بڑی بے چینی پھیلی۔ محلّہ سریاں کے سنیوں نے اس کے خلاف جلسہ کیا جس میں بڑا کثیر مجمع ہوا۔ بیان کا موضو

نعرۂ "ندائے یارسول اللہ" ہی تھا جس سے طبقۂ اہل سنت و جماعت کی ساری بے چینی دور ہوگئی اور دیوبندی مولوی صاحبان کو یہ معذرت کرنی پڑی کہ ہمارے علمانے بھی نعرۂ یارسول اللہ کو مطلقاً حرام نہیں کہا ہے۔ اس تقریر کو عزیزی مولوی محمد احمد صاحب مصباحی مرحوم نے قلم بند کر کے شائع کر دیا، پھر پاکستان کے کچھ احباب نے بھی اسے اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رسالہ "انوارالانتباہ" کے ساتھ شائع کیا۔ جسے دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ "بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است"

یعنی

لفظ بلبل کے لیے اتنی ہی بڑی بات ہے کہ گل کا قافیہ ہے۔

۱۹۷۴ء میں سفر حج کے دوران احادیث نبویہ کا ایک منتخب مجموعہ ساتھ تھا، اس مبارک سفر میں اس کا ترجمہ مکمل کیا، مجموعہ میں حدیثیں حروف تہجی کی ترتیب سے مذکور تھیں، خیال ہوا کہ اسے فقہی ابواب کی ترتیب پر کر دیا جائے لیکن اب تک اس کی توفیق نہ ہو سکی۔

سیرۃ النبی پر ایک مفید کتاب "محمد المثل الکامل" کے نام سے نظر سے گذری، بہت پسند آئی، اس کا ترجمہ شروع کیا جس کی چند قسطیں "ہدیٰ" ڈائجسٹ میں شائع بھی ہوئیں، مزید کے لیے فرصت کا انتظار ہے جب کہ فرصت عنقا ہے اور بقول شعرا اس کا شکار مشکل ہے۔

ع عنقا شکار کس نہ شود دام باز چیں

حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان رسالہ پاسبان میں ہر ماہ مستقل طور پر حدیث شریف کا کالم تحریر فرماتے تھے، مستقل عنوان "صراط مستقیم" ہوتا، عام طور سے اس مضمون کے لیے آپ کوئی خاص تیاری نہیں کرتے۔ مضمون کا تقاضہ ہوا اور دو ڈھائی صفحہ کا مضمون لکھ کر بھیج دیا۔ ایک آدھ بار غالباً اسی کے لیے اشعۃ اللمعات ملاحظہ کرتے دیکھا، آپ کے یہ قلم برداشتہ مضامین بھی مفاہیم عالیہ کا گنجینہ اور زبان و بیان کا نمونہ ہیں۔ حضرت نظامی قدس سرہ نے ان کو کتابی صورت میں اپنے مکتبۂ پاسبان سے شائع کرنا چاہا اور اس کے مقدمہ کے لیے مجھے لکھا، اس مقدمہ میں حدیث شریف کی اسنادی حیثیت سے بحث کی گئی ہے اور حضور حافظ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مختصر سوانحی خاکہ پیش کیا ہے، پورا مضمون حضرت کی نظر ثانی کا نور پا چکا ہے اور بالکلیہ

آپ کا مصدقہ ہے، سوانحی خاکہ میں صرف ایک جگہ ایک لفظ کا استدراک ہے جس کو میرے لڑکے محمد احمد مصباحی مرحوم نے اپنی کتاب "حافظ ملت" میں ذکر کیا۔

حضرت مولانا مشتاق احمد علیہ الرحمہ نے کتاب کے ابتدائیہ میں لکھا تھا: میں نے چاہا تو یہ تھا کہ مقدمہ میں خود لکھوں لیکن میری مصروفیتیں آڑے آئیں، پھر بھی مجھے خوشی ہے کہ یہ سعادت مفتی عبدالمنان صاحب کے حصہ میں آئی، یہ بھی خوب ہوا کہ گھر کی دولت گھر ہی میں رہی۔ اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حضرت کے حالات میں یہ سب سے پہلی تحریر ہے، اور (نقش ہے سنگ آستاں پہ ترے۔ داستاں اپنی جبہ سائی کی)

اشرفیہ کی نشاۃ ثانیہ کی پوری تاریخ کا میں عینی شاہد ہوں، بلکہ اس میں شریک وسہیم رہا ہوں، اور میں نے اس کو اپنے طور پر قلم بند بھی کیا تھا۔ جس دور میں عالی جناب قاری محمد یحییٰ صاحب مرحوم ماہنامہ اشرفیہ کے مدیر تھے انہوں نے اس کی کئی قسطیں "اشرفیہ مصباح العلوم سے الجامعۃ الاشرفیہ تک" کے نام سے شائع کی تھیں۔ ان کے وقت میں ہی یہ سلسلہ بند ہو گیا تھا، ورنہ وہ ایک دلچسپ سرگزشت کاروان علم کی ہوتی۔

ہدایہ اخیرین پڑھنے کے زمانے میں حضرت صدر الشریعہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے حالات لکھنے کے لیے رمضان شریف کی چھٹیوں میں گھوسی گیا۔ میرے شفیق وکریم استاذ گرامی حضرت مولانا عبدالمصطفیٰ صاحب ازہری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی سفارش سے حضرت نے حالات املا کرانا منظور بھی کر لیا اور لگ بھگ دس یوم تک وقت کی انتہائی پابندی کے ساتھ حضرت نے قیام اجمیر شریف تک کے حالات قلم بند کرائے بھی، اس کے بعد فرمایا: میں اب اعتکاف میں بیٹھوں گا اور اس کے بعد حالات دوسرے بہت سے لوگوں کو معلوم ہیں، ان سے واقعات کی تکمیل کرا لینا، میں نے خط کے ذریعہ ان لوگوں سے کام نکالنا چاہا، لیکن کچھ نہ ہو سکا، تو آپ کے مشہور تلامذہ کے پاس ہفتوں رہ کر خود ان حضرات کے حالات بھی لکھے اور اسی سبیل سے جستہ جستہ حضرت صدر الشریعہ قدس سرہ کے حالات بھی جمع ہو گئے۔

گویا لخت دل جمع کیے کتنے تو دیوان کیا

اس کا کام عرصہ سے مکمل ہے، خدا توفیق دے تو اپنے ہاتھ سے اسے شائع کرنے کی

نیت ہے۔ میرے بڑے لڑکے محمد احمد مصباحی مرحوم کو تحریر اور اس کی اشاعت کا ذوق ورثہ میں ملا تھا، رات دن لکھنا پڑے تو تھکتے نہیں تھے۔ خود اپنی کاوش سے فقیر کے مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا، دوسرے حصہ کے معتد بہ مقدار کی کتابت کرالی تھی۔ تیسرا مجموعہ میری تقریروں کا بھی لکھوار ہے تھے، لیکن سب چھوڑ چھاڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ غفر اللہ ورحم علیہ۔ افسوس! آب قدح بشکست وآں ساقی نماند۔

جب سے گھوسی میں قیام ہے میری زیادہ تر توجہ فتاویٰ رضویہ کی طرف ہے، پھر بھی ایک رسالہ "مسئلہ آمین، قرآن وحدیث کی روشنی میں" مولوی شکیب ارسلاں سلمہ ربہ کی سعی سے مطبوع ہو چکا ہے۔ دوسرا رسالہ عیدین کی تکبیرات زوائد" کے موضوع پر مبیضہ کے مراحل سے گزر چکا ہے۔

فتاویٰ رضویہ شریف کی چھ جلدیں سنی دار الاشاعت مبارک پور سے شائع ہوئی ہیں، جن میں تیسرا اور چوتھا حصہ حبر الامۃ حضرت مولانا حافظ عبد الرؤف صاحب بانی سنی دار الاشاعت کی حیات میں شائع ہوا۔ اور چار جلدیں فقیر کی کاوش اور سعی سے مرتب ومطبوع ہو کر قوم کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ نویں جلد جو دسویں کے نام سے بریلی شریف یا پیلی بھیت سے شائع ہوئی ہے اس کی ترتیب وتہذیب اور تکمیل کا کام جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی باقاعدہ اشاعت کے دن جلد لائے، آمین۔

اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کچھ قلمی رسالے جواب تک نایاب تھے اب دستیاب ہو گئے ہیں۔ ان میں فتاویٰ رضویہ جلد سوم باب الجمعہ کا ایک عربی رسالہ "شمائم العنبر" جو اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قلم کا ایک شاہکار ہے۔ اس کا ترجمہ وتصحیح بھی مکمل ہے۔ مبیضہ بھی تیار ہے۔ عمر نے وفا کی اور توفیق الٰہی شامل حال رہی تو ان سب کو منصۂ شہود پر لانے کا عزم ہے۔

السعی منی والا تمام من اللہ وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہٖ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔ (سوانح خود نوشت مشمولہ فتاویٰ بحر العلوم/۲۲ تا ۲۷)

راقم الحروف نے آپ کی دو کتابیں مسئلہ آمین اور تکبیرات عیدین کی تحقیق کو فتاویٰ بحر العلوم کے متعلقہ ابواب میں شامل کر دیا ہے۔

اعلیٰ حضرت کا عربی رسالہ شمائم العنبر حضرت بحر العلوم کے ترجمہ وتقدیم کے ساتھ طبع

ہو کر اہل علم سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔

وعظ و خطابت:

صاحب قلم و قرطاس ہونے کے ساتھ آپ ایک فصیح اللسان خطیب اور بلیغ البیان واعظ بھی تھے، ہندوستان کے چوٹی کے خطباء مقررین میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ کل ہند پیمانے پر آپ کی تقریروں کی ایک زمانہ تک دھوم رہی۔

آپ کی تقریروں کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر طبقہ میں مقبول رہتی۔ خالص علمی ماحول کے مناسب بھی تقریر فرماتے اور خوب داد و تحسین وصول کرتے، اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے مجمع میں عام فہم انداز میں تقریر ہوتی۔

موضوع کا انتخاب خواہ خود کرتے یا اہل جلسہ کا دیا ہوا پہلے سے کوئی عنوان ہوتا بہر صورت عنوان کی رعایت کرتے ہوئے گھنٹوں تقریر فرماتے اور بیان اتنا دل نشیں ہوتا کہ بعض تقریریں برسوں یاد رہتیں۔ مجمع مختصر ہوتا یا عظیم اجلاس، انداز بیان یکساں رہتا، پچاس افراد پر مشتمل جلسہ ہوتا، یا ہزاروں اشخاص پر مشتمل عظیم الشان کانفرنس، آپ کے زور بیان میں کوئی فرق نہیں آتا۔

شعر و سخن میں مہارت:

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ آپ مدرس تھے، مصنف تھے، مفتی تھے، اور واعظ و خطیب تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ مذکورہ جملہ اوصاف کے ساتھ ایک صاحب طرز انشاپرداز بھی تھے، جس طرح آپ ایک عظیم نثر نگار تھے اسی طرح شعر و سخن میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔

مہتاب پیامی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

حضرت بحر العلوم کی شاعری کا طریقہ بھی نرالا تھا۔ آپ کاغذ قلم سامنے رکھ کر کم ہی شعر کہا کرتے، حافظہ اتنا قوی تھا کہ جو کہتے وہ ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ ہوتا، نور الحسن صاحب کا بیان ہے کہ ہم لوگوں نے حضرت سے نعت لکھنے کی فرمائش کی، چند روز بعد جب نعت لینے کے لیے شمس العلوم گھوسی گئے اور حضرت سے ملاقات کی تو آپ نے مسکرا کر کہا ہاں نعت کہی ہے۔ پھر ایک طالب علم کو بلا کر کہا: کہ میری دراز میں ایک نعت شریف رکھی ہے وہ لے آؤ۔ وہ طالب علم کافی دیر بعد آیا اور کہا کہ وہاں تو کوئی نعت نہیں ہے۔ بحر العلوم نے اس سے

دریافت کیا کہ میں تم کو بتانا بھول گیا تھا، وہاں کوئی ایسا کاغذ رکھا ہے جس پر نمبر لکھے ہوئے ہیں؟ اس نے کہا، ہاں، ایسا ایک کاغذ وہاں نظر تو آیا تھا۔ کہا: وہی لے آؤ۔ طالب علم وہ کاغذ لایا تو نورالحسن صاحب کا بیان ہے کہ اس کاغذ پر شعر کے بجائے صرف مختلف اعداد لکھے ہوئے تھے، بحرالعلوم اعداد دیکھتے اور شعر لکھتے جاتے۔ پانچ منٹ میں پورا کلام آپ نے تحریر کر دیا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ راقم الحروف کے ساتھ بھی ماضی میں پیش آچکا تھا، اس لیے نورالحسن صاحب کے بیان پر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ اعداد شاید اشعار کے اشارے ہوتے تھے، آپ یادداشت کے لیے نوٹ کر لیتے تھے، پھر بعد میں ان اشاروں کی مدد سے پورا کلام تحریر کر لیا کرتے تھے۔ (مضمون بعنوان "تھے وہ سخن آشنا" مشمولہ بحرالعلوم نمبر)

آپ نے نعت ومناقب میں طبع آزمائی فرمائی، آپ عابد تخلص فرماتے تھے، نعت کے چند نمونے ملاحظہ کیجیے:

سر محشر شفاعت مصطفیٰ کی میرے کام آئی
نہیں تو کر چکا تھا میں تو کل ساماں ہلاکت کا

دم آخر نبی کے سنگ در پر ہو جو سر اپنا
مزہ آجائے عابد زندگی بھر کی عبادت کا

دوسری نعت کا مطلع ومقطع اس طرح ہے:

دل اپنی طلب سے بھی کچھ لے کے سوا اٹھا
وہ دست سخا ان کا جب بہر عطا اٹھا

عابد کی شفاعت کو نبیوں کی جماعت سے
ہے کون جو محشر میں آقا کے سوا اٹھا

مارہرہ مقدسہ کی مدح میں یوں رقم طراز ہیں:

فروغ چشم بصیرت غبار مارہرہ سکون قلب وجگر نوک خار مارہرہ

آپ نے اولیائے کرام اور علمائے ذوی الاحترام کی شان میں منقبتیں بھی تحریر فرمائیں:

صدرالشریعہ کی منقبت میں فرماتے ہیں:

یہ ہے بزم صدر شریعت جو آیا منصور ہوا
جو ان سے ٹکرائے گا یہ جانو چکنا چور ہوا

قاضی، مفتی، مرد مجاہد، سب ان کے درباری ہیں
سب پہ عنایت یکساں ہوگی مالک یا مزدور رہوا

صدر العلما محدث میرٹھی کی شان میں لکھتے ہیں:

وہ صدر تھے وہ شاہ تھے بلند پایہ گاہ تھے — فراز چرخ فضل پر وہ فخر مہر و ماہ تھے
وہ اپنے فقر و زہد میں علی کی جلوہ گاہ تھے — وہ اپنے دم سے علم و فن کی جنت نگاہ تھے
خدا کی قدرتوں کے ایک معتبر گواہ تھے

مجاہد ملت کی شان میں تحریر فرمایا:

یہ بھی سچ ہے رگ باطل کے لیے خار تھا وہ — صف شکن، شیر فگن، حیدر کرار تھا وہ

مظہر مفتی اعظم علامہ تحسین رضا خاں صاحب کے وصال پر ملال پر اپنا قلبی تأثر یوں پیش کیا:

یہ آج دہر میں کس کی وفات کا غم ہے — فسردہ چہرے ہیں چشم حیات پرنم ہے
شہید ہو کے ہوئے آپ زندۂ جاوید — شہید کے لیے نوحہ ہے اور نہ ماتم ہے

راقم الحروف نے بہیڑی ضلع بریلی شریف سے ماہنامہ ”رضائے مصطفیٰ“ شائع کیا تو اس کے پہلے شمارہ کے لیے حضرت بحر العلوم نے قوم کو جو منظوم پیغام دیا اس کے بعض اشعار یہ ہیں:

للہ الحمد فضل رب کا ہوا — علم و حکمت کا ایک باب کھلا
یعنی احقر کے خلص احباب — اہل دین، اہل علم، اہل کتاب
شائع کرتے ہیں سعی باہم سے — ایک شہری صحیفۂ نایاب
مصطفیٰ کی رضا، رضائے خدا — نعرۂ لا الٰہ الا اللہ
پھر سے تاریخ دیں زندہ ہو — روح دین مبیں زندہ ہو
این دعا از من از ملک آمین — نحن محتاج انت نعم معین

علالت اور انتقال:

کمزوری اور علالت پہلے ہی سے تھی، اسی درمیان آپ کی اہلیہ محترمہ ہماری امی صاحبہ مرحومہ کا ۸/نومبر بروز جمعرات ۳/بجے انتقال ہو گیا، دوسرے دن شام کو راقم الحروف نے

حضرت کو تعزیتی فون کیا تو مجھے پہچان کر کہا: اچھا اچھا، میں نے تعزیت پیش کی اور حضرت نے کرا ہتے ہوئے دو تین جملے فرمائے، بس وہ آخری آواز تھی جو میں نے سنی۔ اللہ تعالیٰ ہماری امی صاحبہ مرحومہ کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

اس کے ایک ہفتہ بعد آپ کی طبیعت زیادہ علیل ہوگئی تو اعظم گڑھ ہاسپٹل میں داخل کیا گیا، بارہ دن ایڈمٹ رہے، ۱۴؍محرم الحرام ۱۴۳۴ھ/ ۲۹؍نومبر ۲۰۱۲ء جمعرات کا دن گذار کر شب جمعہ میں ۹؍بج کر ۱۳؍منٹ پر آپ کا انتقال ہوگیا۔ افسوس کہ علم و فضل کا وہ آفتاب جس نے تقریباً ستر سال تک علم و عرفان کی کرنوں سے امت مسلمہ کے قلوب کو منور و مجلی فرمایا وہ ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ حضرت بحر العلوم کا انتقال پوری ملت کا نقصان ہے اور ان کا اس دنیا سے رخصت ہونا ایک عہد کا خاتمہ ہے، اس عہد کا خاتمہ جس نے اہل سنت کو علم و حکمت کی بیش بہا دولتوں سے نوازا، بالخصوص رضویات کی اشاعت جو ان کی حیات مقدسہ کا حاصل اور نچوڑ ہے۔

اللہ رب العزت جل جلالہ ان کے مرقد پر انوار و تجلیات کی بارش فرمائے اور ملت اسلامیہ کی رہنمائی کے لیے ہم سب اہل سنت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

ابر رحمت ان کے مرقد پر گہر باری کرے
حشر تک شان کریمی ناز برداری کرے

اولاد و احفاد:

آپ صاحب اہل و عیال تھے، آپ کا عقد ۹؍رجب المرجب ۱۳۶۵ھ میں اکیس سال کی عمر میں قصبہ مبارک پور محلہ پرانی بستی کے ایک خوشحال اور دین دار گھرانے میں شیخ عبد الغفور صاحب کی دختر نیک اختر صابرہ خاتون سے ہوا۔

آپ کے یہاں پانچ صاحبزادے ہوئے۔ مولانا محمد احمد مصباحی (مرحوم)، محمد سلمان اشرف، مولانا شکیب ارسلان، محمد افسر فیروز، محمد ظہیر الحسن۔

صاحب زادیاں چار ہیں: زرینہ خاتون، ام ایمن۔ غزالہ خاتون۔ نور الصباح۔

بڑے صاحب زادے حضرت مولانا محمد احمد مصباحی کی چھ اولادیں ہیں۔

تین صاحب زادے: سعید الحسنین برکاتی۔ مظہر السادات۔ مولانا محمد زینی دحلان۔

تین صاحب زادیاں: ماریہ صبوحی۔ طیبہ زینب۔ ام الوریٰ

محمد سلمان اشرف صاحب کی بارہ اولادیں ہیں: آٹھ صاحب زادے:
ابوسفیان۔ محمد ریحان۔ محمد عدنان۔ مولانا محمد حسان۔ محمد عمران۔ حافظ محمد فیضان۔ محمد عفان۔ حافظ محمد صدام۔
چار صاحب زادیاں: شمع پروین۔ ہما پروین۔ صبا پروین۔ فرحانہ
مولانا شکیب ارسلاں صاحب کی پانچ اولادیں ہیں: تین صاحب زادے:
صہیب رومی۔ محمد حبیب۔ صبیح الحق۔
دو صاحب زادیاں: شبانہ رومی۔ فرح ناز
محمد افسر فیروز صاحب کی سات اولادیں ہیں: تین صاحب زادے:
افروز عالم۔ بدر عالم۔ نور عالم
چار صاحب زادیاں: عمرانہ خاتون۔ فرزانہ خاتون۔ سلطانہ خاتون۔ رخسانہ خاتون۔
ظہیر الحسن صاحب کی سات اولادیں ہیں: تین صاحب زادے:
محمد آصف حسن۔ عبدالواسع۔ عبدالخیر۔
چار صاحب زادیاں: قرۃ العین۔ راحت القلوب۔ نسرین فاطمہ۔ نساء طیبہ۔
انہی سب افراد خاندان کے بارے میں حضرت بحر العلوم علیہ الرحمۃ والرضوان فرمایا کرتے تھے: ہمارا بھرا پڑا خاندان ہے۔ ما شاء اللہ تعالیٰ.

حضرت مولانا محمد احمد صاحب مرحوم ومغفور:

آپ سب سے بڑے صاحب زادے تھے، ۱۱ر مئی ۱۹۹۳ء بروز منگل اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

آپ کا اصل نام محمد، اور عرفی نام عبدالسبحان تھا، مگر آپ نے اپنے آپ کو محمد احمد مصباحی کے نام سے مشہور کیا، یہ سب سے پہلے فاضل اشرفیہ ہیں جنھوں نے اپنے نام کے ساتھ ''مصباحی'' لکھنے کا التزام کیا۔
تعلیم کے بعد مدرسہ گلشن بغداد رانچی میں ملازمت اختیار کی، یہاں پیر طریقت حضرت مولانا سید عبدالحق صاحب مرحوم ومغفور کی تحریروں کی اشاعت کے لیے اشاعتی ادارہ ''حق اکیڈمی'' قائم کیا، اور ان کی جمع وترتیب کے بعد ان کو شائع کیا۔ اپنی بھی تین کتابیں شائع کیں، (۱) تذکرۃ النعمان (۲) تذکرۂ امام احمد رضا (۳) رانچی میں یوم رضا۔

وہاں سے شہر گیا کے ایک مدرسہ میں چلے گئے، وہاں بھی تحریر واشاعت کا مشغلہ رہا اور ایک ماہنامہ بھی جاری کیا۔ پھر وہاں سے بھی جلد چلے آئے۔

یہاں کے بعد ریحان ملت حضرت علامہ ریحان رضا خاں صاحب سجادہ نشین آستانہ عالیہ رضویہ بریلی شریف کی دعوت پر ماہنامہ "اعلیٰ حضرت" کی ادارت کے لیے پہونچے اور ایک سال رہے۔ اس کے بعد ماہنامہ "المیزان" ممبئی کی ادارت کے لیے حضرت مولانا محمد جیلانی محامد ان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں دو سال رہے، ان کے زمانہ میں المیزان کا معیار بلند ہوا، امام احمد رضا نمبر کی اشاعت انہی کے زمانہ میں ہوئی، یہ نمبر اعلیٰ حضرت کی تحقیقات کے سلسلہ میں سنگ میل ثابت ہوا، اس نمبر کی تیاری میں آپ نے اپنی ساری توانیاں صرف کر دی تھیں، مدیر اعلیٰ سید جیلانی میاں اداریے میں لکھتے ہیں:

اس نمبر کی حسن تدوین کے تمام محاسن محب محترم مولانا محمد احمد مصباحی کو بخشتا ہوں۔

یہاں سے مولانا محمد حنیف صاحب قادری مصباحی ان کو ماہنامہ فیض الرسول کی ادارت کے لیے براؤں شریف لے گئے اور اس کا مدیر اعلیٰ بنا دیا، یہاں آپ کئی سال رہے، اس کے علمی معیار اور مذہبی کردار کو ترقی دی۔

انہوں نے اپنے تجربہ سے جان لیا تھا کہ ملازمت کی آمدنی سے گھر کی کفالت نہیں ہو سکتی، لہذا گورکھپور میں انہوں نے بنائی کے کچھ کارخانے لگائے اور کاروبار میں انہیں کچھ فائدہ بھی ہوا، لہذا اب وہ مستقل گورکھپور میں ہی رہنے لگے، چند سال کے بعد گورکھپور کا ہینڈلوم کاروبار کساد بازای کا شکار ہو گیا، لہذا آپ اپنے بال بچوں کے ساتھ مبارک پور چلے آئے۔ وہاں کاروباری مشغولیت زیادہ ہونے کی وجہ سے پڑھنے کا مشغلہ موقوف رہا۔ مگر مبارک پور آکر پڑھنے لکھنے کے شوق میں نئی تحریک پیدا ہوئی۔ لہذا حضرت بحر العلوم کی تحریک پر آپ نے اولیائے احناف۔ تذکرۃ حسن۔ اور حافظ ملت، نامی کتابیں مرتب کیں۔ اول الذکر کتاب غیر مطبوعہ ہے

ان کے بعد آپ نے مضامین بحر العلوم کے نام سے چند مجموعے مرتب کیے تھے، ان میں سے پہلا حصہ منظر عام پر آیا اور اس کے رسم اجرا کے سلسلہ میں آپ نے ایک بڑا جلسہ عام بھی کیا تھا۔ باقی مجموعے منتظر طباعت ہیں۔

آپ نے بحر العلوم کی تقریریں بھی نقل کرنا شروع کی تھیں، مگر ان کے انتقال سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اب ان کے صاحب زادے حضرت مولانا زینی وحلان استاذ شمس العلوم گھوسی

نے پہلا حصہ مرتب کر کے خطبات بحر العلوم کے نام سے شائع کر دیا ہے:

حضرت بحر العلوم فرماتے ہیں:

میرے فتاویٰ کی تعداد بھی خاص ہو گئی تھی، اس کا مبیضہ کرنا چاہتے تھے، مگر ان کی زندگی نے وفا نہ کی ان کے نہ رہنے سے خود میرا بڑا علمی نقصان ہوا مگر کوئی کیا کر سکتا ہے:

فرشتہ کہ وکیل ست بر خزائن باد
چہ غم کند کہ بمیرد چراغ پیرزنے

جو فرشتہ ہوا چلانے پر مقرر ہے اسے اس کا کیا غم کہ بڑھیا کا چراغ بجھ جائے گا۔

بحمدہ تعالیٰ راقم الحروف نے حضرت بحر العلوم کی یہ آرزو پوری کر دی اور تمام فتاویٰ کو مرتب کر کے اکیڈمی سے شائع بھی کر دیا۔ اس کو دیکھ کر حضرت نہایت مسرور ہوئے۔ اور دعاؤں سے نوازا جن کا میں ہمیشہ طالب رہا۔

ان شاء المولیٰ تعالیٰ آپ کی غیر مطبوعہ کتب بھی جلد منظر عام پر آئیں گی، خاص طور پر فتاویٰ بحر العلوم کی ساتویں جلد منظر عام پر آئے گی جس کے بارے میں نبیرۂ بحر العلوم حضرت مولانا نازش زینی دحلان صاحب فرمائش کر چکے ہیں۔

آپ کے صاحب زادوں میں حضرت مولانا شکیب ارسلاں صاحب الجامعۃ الاشرفیہ سے فارغ التحصیل ہیں اور صاحب علم و فضل، حضرت بحر العلوم کے آپ ہی علمی وارث اور جانشین ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے تمام افراد خاندان کو سلامت رکھے۔ آمین بجاہ النبی الکریم علیہ التحیۃ والتسلیم.

کچھ "الشاہد" کے بارے میں

زیر مطالعہ کتاب حضرت بحر العلوم علیہ الرحمہ کی نہایت معرکۃ الآرا تصنیف ہے، آپ نے اس کتاب میں دلائل نقلیہ وعقلیہ کی روشنی میں کتاب کے عنوان یعنی "مسئلہ حاضر وناظر" کو آسان انداز میں سمجھایا ہے اور منکرین کے اعتراضات کے دنداں شکن جواب دیے ہیں۔

یہ کتاب سب سے پہلے ۶۰ ہجری میں طبع ہوئی، اس کے بعد حضرت مصنف نے کچھ اضافے کیے، لہذا ان اضافوں کے ساتھ ۲۷ رسال بعد دسمبر ۱۹۸۷ء میں حق اکیڈمی مبارکپور سے شائع ہوئی۔ اور اب ۲۶ رسال بعد امام احمد رضا اکیڈمی سے شائع ہو رہی ہے یعنی ۵۷ رسال میں اس کا یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔ جب کہ یہ علمی ذخیرہ بار بار شائع ہونا چاہیے تھا۔ اب انشاء المولیٰ تعالیٰ مسلسل اشاعت ہوگی تاکہ لوگ اس سے فیض یاب ہوتے رہیں۔

اس سے پہلی طباعت کے لحاظ سے ہمارا یہ نسخہ متعدد خصوصیات رکھتا ہے۔ جو اس طرح ہیں:

(۱) پوری کتاب کمپوز کرا کے اس کی تین مرتبہ پروف ریڈنگ کی گئی ہے اور صحت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

(۲) آیات اور عربی عبارات کی تخریج کے ساتھ آیات پر اعراب کا خاص خیال رکھا ہے، اور احادیث وتفاسیر کے ساتھ دوسری کتابوں کی عربی عبارتوں کو اصل کتابوں سے ملا کر بہت سے مقامات پر اغلاط کی تصحیح کی گئی ہے۔

(۳) کچھ جدید سرخیاں قائم کر کے کتاب کے مضامین کو حسین ترتیب سے مزین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ قارئین کی دل جمعی کا سامان فراہم ہو سکے۔

(۴) کتاب میں فہرست نہیں تھی، لہذا اس کا بھی اہتمام کیا گیا ہے، اور جملہ عنوانات کی فہرست بنا دی گئی ہے۔

(۵) مصنف کے حالات آپ ملاحظہ فرما چکے، مزید کتاب کے مضامین کا تعارف اور اس کی تصنیف کا پس منظر خود مصنف علیہ الرحمہ نے کتاب کے شروع میں مختصراً بیان کر دیا ہے، راقم الحروف چاہتا ہے کہ اجمالی انداز میں کتاب کے مندرجات قارئین کے سامنے پیش کر دیے جائیں تاکہ کتاب کے مضامین ومفاہیم سمجھنے میں مزید آسانی فراہم ہو سکے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ غیر مقلدین کی طرف سے ان کے مولویوں نے حضور نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کے حاضر و ناظر ہونے کا انکار کرتے ہوئے دو کتابیں لکھیں، مولوی عبدالقیوم رحمانی غیر مقلد نے ''خیر الامم'' اور مولوی عبدالرؤف جھنڈے نگری نے ''جوابات حاضر و ناظر''۔

ان دونوں کتابوں کے مکروفریب سے محفوظ رکھنے کے لیے مبلغ اسلام و سنیت حضرت علامہ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک کتاب تحریر فرمائی جس کا نام آپ نے ''خیر الانبیا'' رکھا، اور اس کتاب میں آپ نے غیر مقلدین کے دجل وفریب کو طشت از بام کیا۔

یہ کتاب گویا خرمن وہابیت پر بجلی بن کر گری اور جھنڈے نگری غیر مقلد اپنی دروغ بیانی اور افترا پردازی کا جھنڈا لے کر میدان کارزار میں دوبارہ کود پڑے اور ''تردید حاضر و ناظر'' کے نام سے ایک کتاب لکھ ماری۔

اس سے پہلے کہ مبلغ اسلام کی طرف سے کوئی جواب آتا اسی زمانہ میں بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ اعظمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا آپ کے قائم کردہ ادارہ انوار العلوم تلسی پور میں بحیثیت استاذ تقرر ہوا۔ لہذا مبلغ اسلام نے اس کا جواب لکھنے کے لیے حضرت بحر العلوم سے فرمائش کی اور آپ نے ''الشاہد'' کے نام سے ایک مسکت جواب تحریر فرمایا۔

اس کی تفصیل حضرت بحر العلوم نے کتاب کے شروع میں تحریر فرمادی ہے۔ ''الشاہد'' کی تکمیل کے بعد اس کی اشاعت ۶۰ء میں ہوئی۔ جب یہ کتاب منظر عام پر آئی تو مولوی عبدالرؤف جھنڈے نگری تو اس میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے، مگر انہوں نے سوچا کہ اس طرح تو بدنامی کا داغ لگ جائے گا، لہذا کسی نوخیز مولوی کو اس میدان میں اتارا اور انہوں جو کچھ اناپ شناپ بکا، اس کا نظارہ بھی قارئین اندروں صفحات ملاحظہ کریں گے۔ یہ ہیں مولوی محمد رئیس ندوی، اور انہوں نے جو کتاب لکھی اس کا نام ہے ''ابطال شواہد الشاہد''۔

یہ کتاب جیسی بھی کچھ تھی اس کی تفصیل خود بحر العلوم نے جو بیان کی ہے وہ یہ ہے:

مولانا الاعز محمد حنیف صاحب براؤنی زید مجدہم کی جدوجہد سے ۱۹۶۰ء میں یہ کتاب (الشاہد) شائع ہوسکی، چھ سال بعد ۱۹۶۶ء میں اس کا جواب ''ابطال شواہد الشاہد'' نظر سے گزرا، پورے شوق اور انتہائی بے تابی سے پوری کتاب پڑھ ڈالی۔ مؤلف کوئی نوخیز عالم ہیں۔ کتاب ہاتھ میں لی تھی تو شوق تھا کہ بحث کے کچھ نئے گوشے سامنے آئے ہوں گے، اور جواب میں لکھنے

کے لیے کچھ میدان اور وسیع ہوا ہوگا، لیکن کتاب پڑھ کر طبیعت سخت بدمزہ ہوئی۔ اور خیال گزرا کہ فاضل رحمانی نے شاید یہ سوچ کر خود جواب کی زحمت نہیں اٹھائی کہ اصل مسئلہ سمجھانے کے لیے طرفین سے اب تک جو کچھ کہا جاچکا ہے وہی کافی ہے، اس پر اضافہ کی گنجائش نہیں۔ اور جواب کے نام سے کچھ نہ کچھ ہونا ہی ہے تو اس کے لیے یہ صاحب زادے ہی کافی ہیں، جنہیں آگے پیچھے کی بھی سدھ بدھ نہیں، یہی بے باکی سے اناپ شناپ بک سکیں گے۔

چنانچہ اس کتاب کے جواب لکھنے کا داعیہ بالکل ختم ہوگیا، لیکن اس موضوع پر کچھ میٹرس میرے پاس جمع تھے، اس لیے بالکل نئے سرے سے اس مسئلہ کے تمام گوشوں پر ایک تحقیقی کتاب سوال وجواب کے نقطۂ نظر سے ہٹ کر لکھنا شروع کیا، ابتدا کے پندرہ بیس صفحے لکھ بھی لیے، پھر جو دوسرے کاموں کا ہجوم ہوا تو یہ اوراق بھی زینت طاق نسیاں ہوگئے۔

ادھر ''الشاہد'' کے مطبوعہ نسخے ختم ہوگئے، تو مکتبۃ الحبیب الہ آباد والوں نے بطور خود اس کتاب کی دوبارہ کتابت کرالی اور شائع کرنے کا اعلان کیا جس کو کئی سال ہوگئے، اس طرح اس کتاب کے ساتھ الہ آباد میں بھی ایک بار پھر وہی سلوک ہوا جو ابتدا میں تلشی پور میں ہو چکا تھا۔

اب پھر مختلف حلقوں سے اس کی اشاعت کا تقاضا ہوا، اس لیے دوسرے ایڈیشن کی خاطر اسے پریس میں دینا پڑا، اور یہ ضروری معلوم ہوا کہ اس نئی کتاب کے بارے میں بھی کچھ صفحات ملحق کردیے جائیں جس سے ناظرین اندازہ لگا سکیں کہ یہ نئی کتاب ایک نو آموز کی شوخیوں سے کچھ زائد نہیں۔ [ص ۱۷]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ''الشاہد'' کے دوسرے ایڈیشن ۱۹۸۷ء کے بعد سے اب میدان خالی ہے، منکرین خاموش ہیں اور ''الشاہد'' نے شاہد عادل پیش کر کے اس علمی وفکری مقدمہ کو جیت لیا ہے اور حق وصداقت کی فتح کا پرچم لہرا کر جھنڈے نگر کے جھنڈے کو سرنگوں کردیا ہے۔

کتاب کے مندرجات:

الشاہد کا باقاعدہ آغاز حضرت بحر العلوم نے اس طرح کیا ہے کہ پہلے غیر مقلدین کے دجل وفریب کو نہایت مہذب انداز میں پیش کرتے ہوئے غیر مقلدین کی غلط فہمی سے تعبیر کیا ہے، یعنی وہابی غیر مقلد یا تو خود غلط فہمی کا شکار ہیں، یا پھر بالقصد لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ اور یوں

لکھتے اور کہتے ہیں کہ مسئلہ حاضر و ناظر کے اثبات کے لیے دلیل قطعی درکار ہے۔

حضرت بحر العلوم نے پہلے چند اصول بیان فرما کر اس فریب کا پردہ چاک کر دیا ہے، آپ نے جو بیان فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"مسئلہ حاضر و ناظر" توحید و رسالت کی طرح کوئی قطعی اسلامی عقیدہ نہیں، لہذا اس کا منکر کافر بھی نہیں۔ اور جب قطعی اجماعی نہیں تو پھر اگر دلائل ظنی بھی ہوں تو اس کا اثبات درست قرار دیا جائے گا۔ بلکہ یہ مسئلہ باب فضائل و مناقب سے ہے جس میں دلیل ظنی بھی کافی۔ اب اگر وہابی غیر مقلدین کسی ایسی دلیل کو جو اہل سنت کے یہاں معتبر ہے اس میں کوئی دوسرا احتمال بھی نکال لیں تو بھی استدلال میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پھر حاضر و ناظر کے معنی بیان کیے ہیں، اور اس کے بعد آپ نے ان دلائل کو ذکر فرمایا ہے جو عقیدۂ علم غیب کے سلسلہ میں اہل سنت کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں، اور واضح کر دیا ہے کہ مسئلہ حاضر و ناظر کوئی علاحدہ چیز نہیں بلکہ یہ بھی ثبوت علم غیب کے ضمن میں خود ہی ثابت ہو جانے والا ایک مسئلہ ہے۔

آگے چل کر علم غیب اور حاضر و ناظر پر جھنڈے نگری کے ان اعتراضات و مزخرفات کا جواب ہے جو انہوں نے اپنی خرد ماغی سے پیش کیے ہیں، کہ کہیں لکھا: اگر آپ ہر جگہ حاضر و ناظر ہوں تو روضۂ انور خالی رہ جائے گا، اور آپ وہاں آرام کے بجائے دنیا کے دورہ میں رہ کر تنگی اور مشکل میں مبتلا ہوں گے۔ اور سب جگہ جاتے اور پھر آتے ہیں تو زندہ درگور ہیں۔ معاذ اللہ۔

اسی طرح جھنڈے نگری نے قارئین کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ یہ عقیدہ بریلوی مولویوں کا نکالا ہوا ہے، اسلام و شریعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ حضرت بحر العلوم نے متقدمین علمائے کرام کی عبارتوں سے واضح کر دیا ہے کہ یہ مسئلہ کوئی آج کا نیا نہیں بلکہ کتابیں اٹھا کر دیکھو سیکڑوں سال سے علما کیا لکھتے آئے ہیں۔

جھنڈے نگری نے ایک بحث یہ اٹھائی ہے کہ رسول و فرشتہ کو نکاح کے وقت اگر گواہ بنایا جائے تو یہ کفر ہوگا جیسا کہ احناف فقہا بھی لکھ رہے ہیں۔

بحر العلوم نے فرمایا ہے کہ احناف کی کتابیں سمجھنے کے لیے پہلے ان کے اصول سیکھو پھر حرف زنی کرنا، ہمارے فقہا نے وضاحت کر دی ہے کہ یہ اس وقت ہے جب رسول و فرشتہ کے لیے علم غیب ذاتی مان کر ہو۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا   لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار ہی نہیں

پھر ایک بحث جھنڈے نگری نے یہ چھیڑ دی ہے کہ ہر جگہ حاضر و ناظر خدائے تعالیٰ ہے، اور اس جیسا کوئی نہیں، تو پھر کسی بھی دوسرے کا حاضر و ناظر ہونا شرک۔

حضرت بحر العلوم نے فرمایا: اگر دلائل کا یہی حال ہے تو پھر سمیع و بصیر بھی کوئی نہ ہو، (یعنی جھنڈے نگری بھی بہرے اور اندھے)

لفظی اشتراک سے اگر شرک ثابت ہونے لگے تو پھر کون بچے، در اصل یہاں بہت وجوہ سے فرق ہے اور ہم اس کے قائل، حضور کا حاضر و ناظر ہونا، عطائی، حادث، متناہی۔ خداوند قدوس کا سمیع و بصیر ہونا ذاتی، قدیم، غیر متناہی۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد لفظ شہادت بمعنی گواہ پر بحث ہے اور اس کے اثبات میں دلائل کا سیل رواں ہے، پھر حضور کا میدان قیامت میں شاہد و گواہ ہونا۔ رحمت عالم ہونا۔ قیامت تک کی خبر دینا، اسی طرح کے دوسرے مباحث معرض بحث میں آئے ہیں۔ ساتھ ہی جھنڈے نگری کی اس بکواس کا بھی رد ہے جو اس نے دریدہ ذہنی کا ثبوت دیتے ہوئے لکھی تھی کہ حضور نے جو فرمایا تھا کہ جو پوچھو بتاؤں گا یہ محض ایک خاص وقت کے لیے تھا پھر بدستور وہی حال ہوا جو پہلے تھا۔

حضرت بحر العلوم نے اس ہذیان کا جواب تحریر فرمایا کہ یہ بات کتنی مضحکہ خیز ہے، کہ جھنڈے نگری جتنی دیر پڑھیں، بولیں اور بیان کریں بس علم اسی وقت تک، باقی پہلے اور بعد میں علم سے کورے اور نرے جاہل۔

بحث میں وہابیہ کی طرف سے ہمیشہ وہ آیتیں اور حدیثیں پیش کی جاتی ہیں جو نفی علم اور نفی فضیلت پر دلالت کریں، ان تمام نصوص سے یہ لوگ آنکھیں موند لیتے ہیں جو ان کے مقابل علوم غیب اور فضائل پر دلالت کرتی ہیں، جھنڈے نگری نے بھی ایسا ہی کیا تھا، بحر العلوم نے اس کے دلائل شرح و بسط سے بیان فرما کر ارشاد فرمایا: کہ دونوں میں تطبیق کی راہ نہایت آسان ہے کہ نفی علم کلی کی ہے اور ثبوت بعض کا۔ اہل سنت کا ہمیشہ یہی درمیانی طریقہ رہا ہے، ایسا نہیں کہ بعض پر ایمان لاؤ اور بعض کو ترک کر کے یہود و نصاریٰ کا شیوہ اپناؤ۔

جھنڈے نگری کی ہفوات و خرافات کے بعد ان کے چھوکرے مولوی رئیس ندوی کی خبر گیری میں کتاب کا دوسرا جز ہے جو اس طرح شروع ہوا ہے کہ:

ندوی صاحب نے صحابۂ کرام کے اختلافات کو سامنے لا کر مسئلہ کو غیر معتبر ٹھہرانے کی

ناکام کوشش کی ہے۔

حضرت بحرالعلوم نے ان کی جامہ تلاشی اس طرح لی ہے کہ آپ کے بڑوں کے یہاں تو قرآن وحدیث کے بغیر نوالہ نہیں توڑا جاتا تھا پھر یہ اقوال صحابہ آپ کا وظیفہ کب سے ہو گئے۔

اور اگر اختلافات صحابہ ہی سے مذہب متعین ہونے لگے تو پھر آپ کے لیے پر پیچ گھاٹیاں ہیں جن کو عبور کرنا جوئے شیر لانا ہے۔

ندوی چھوکرے کو جب حاضر و ناظر نہ ہونے پر کوئی دلیل نہیں ملی تو جگہ جگہ معارضوں سے کام چلا کر جواب لکھنے کی سعی بے جا کی ہے۔ لہذا ایک جگہ لکھا کہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے سے تو لازم آئے گا کہ آپ ایسی محافل میں بھی جاتے ہیں جو غیر شرعی ہیں۔

حضرت بحرالعلوم نے تنبیہ فرماتے ہوئے لکھا کہ ہم نے بارہا حاضر و ناظر کا مطلب بیان کیا اور واضح انداز میں بتادیا ہے کہ اس کے لیے ہر جگہ حضور جسمی شرط نہیں اور نہ ہی ہمارا یہ موقف ہے۔ تردید کرنے والے کو پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہمارے مدمقابل کا دعویٰ اور نظریہ کیا ہے، اس کے بغیر ردوابطال ہوا میں تیر اندازی بلکہ دھویں میں لاٹھی گھمانا ہے۔

اسی طرح یہ بحث کہ آیات، احادیث اور واقعات اس بات پر شاہد ہیں کہ حضور کو نہ اپنا حال معلوم تھا اور نہ امت کا کہ کل قیامت میں کیا ہوگا۔ اور نہ دنیا کے احوال آپ کے پیش نظر تھے ورنہ حضرت عائشہ کا ہار گم ہوا اور دوسرے جزئی واقعات، لہذا نہ آپ حاضر اور نہ ناظر۔

حضرت بحرالعلوم نے اس مقام پر فرمایا کہ اس طرح کے جزئی واقعات اطلاع وخبر سے پہلے کے ہیں، اور ہم اس بات کے قائل ہیں کہ حضور کا علم یوماً فیوماً ترقی پر رہا اور نزول قرآن کے مکمل ہونے پر پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ پھر اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی وہ عبارت نقل فرمائی جس میں وہابیہ کو چیلنج ہے کہ:

ہاں ہاں تمام نجدیہ: دہلوی وگنگوہی، جنگلی وکوہی سب کو ہی دعوت عام ہے، ''اجمعوا شرکاء کم'' چھوٹے بڑے سب اکھٹے ہو کر ایک آیت قطعی الدلالۃ، یا ایک حدیث متواتر یقینی الافادہ چھانٹ لائیں، جس سے صاف صریح طور پر ثابت ہو کہ تمامی نزول قرآن عظیم کے بعد اشیائے مذکورہ ''ماکان ومایکون'' سے فلاں امر حضور پر مخفی رہا، جس کا علم حضور کو نہ دیا گیا (فان لم تفعلوا فاعلموا أن الله لا يهدي كيد الخائنين) [انباء المصطفیٰ]

غرض کہ ندوی چھوکرے نے اس طرح کی بہت سی بحثیں چھیڑی ہیں جن کو علمائے اہل

سنت اپنی کتابوں میں بلکہ خود حضرت بحر العلوم نے جھنڈے نگری کے ردو ابطال میں لکھ کر واضح کر دی تھیں۔

علوم خمسہ کی نفی میں جو آیت پیش کی جاتی ہے ندوی چھوکرے نے وہ بھی پیش کر دی ہے اور اس پر اپنا خوب زور لگایا ہے۔ حضرت بحر العلوم نے بھی تفصیل سے اس مقام پر سمجھایا ہے، حدیث وتفسیر کی کثیر تعداد میں کتابوں کی عبارات اور ان کی وضاحت اور پوشیدہ نکات کی نشان دہی کچھ اس انداز سے کی ہے کہ مخالف کے لیے مجال دم زدن نہیں۔ بخاری، مسلم، مشکاۃ، عمدۃ القاری، ارشاد الساری، اشعۃ اللمعات۔ تفسیر ابن کثیر، تفسیر امام رازی، تفسیر بیضاوی، تفسیر مدارک، اس کی شرح اکلیل، تفسیر خازن، تفسیر جلالین، تفسیر صاوی، وغیرہا کتب احادیث وتفاسیر سے آپ نے مسئلہ کو پوری طرح واضح کر دیا ہے۔

ندوی چھوکرے نے پھر یہ بحث ٹھونسی ہے کہ حضور کو شعر کا علم نہیں تھا۔ بہت سے رسولوں کے نہ تو نام اور نہ ان کے احوال معلوم تھے، ایسے ہی جنت کی نعمتوں اور روح کی حقیقت سے بھی آپ بے خبر تھے۔

حضرت بحر العلوم نے نمبر وار سب کے تفصیلی جواب دے کر وہابیت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے۔

علم شعر کے بارے میں تفصیل سے سمجھایا ہے کہ علم کا مطلب بسا اوقات ملکہ بھی ہوتا ہے، یعنی کسی بھی چیز کی محض معرفت نہیں بلکہ اس میں انہماک وعمل اور مہارت، دوسرے الفاظ میں کہو کہ شعر گوئی اور منظوم کلام کی پرکٹس نہیں، وجہ اسی آیت میں بتا دی گئی ہے کہ یہ چیز منصب رسالت کے لائق نہیں۔ پھر اس عدم علم میں کون سی خرابی اور کیا عیب ہوا۔ بہت سے رسولوں کے بارے میں علم نہ ہونا پہلے کی بات ہے، بعد اطلاع سب کے بارے میں علم ہو گیا، لہذا اب چودہ سو سال بعد اسی پہلی حالت پر نظر رکھنا کون سا دین ودیانت ہے۔

اور جنت کی نعمتوں سے لاعلمی کے دعویٰ کو تو حضرت بحر العلوم نے ایسا خاک میں ملایا ہے کہ ندوی چھوکرے کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہوگا۔ جنت کی بہاروں اور نعمتوں کی تفصیلات حضور نبی کریم ﷺ کی زبان فیض ترجمان کے ذریعہ قرآن وحدیث کی زبان میں جو ہم تک پہونچی ہیں وہ بے حد و بے شمار ہیں۔

پھر آپ نے تیس سے زیادہ آیتوں سے جنت کی نعمتوں اور بہاروں کی تفصیلات پیش

کی ہیں۔

روح کے علم کی نفی سے متعلق بھی ندوی کی قلابازیاں قابل تماشا ہیں، کبھی تو اہل حدیث بننے کے شوق میں وہ جوش جنوں کہ حدیث مرفوع اور وہ بھی صحیحین بخاری و مسلم بلکہ بخاری ہی کی چاہیے، اور اب یہاں آیت کی تفسیر و وضاحت میں کوئی حدیث بلکہ کوئی اثر صحابی بھی نہ ملا تو اب اتنے نیچے اتر آئے کہ کل تک تصوف وصوفیہ پر سب وشتم کا دروازہ کھلا تھا اور دونوں کو قرآن وحدیث کا دشمن اور نالائق اعتبار قرار دیا جا رہا تھا، اب جناب والا کہہ رہے ہیں کہ فلاں فلاں مشائخ کرام یعنی جنید بغدادی وشہاب الدین سہروردی کہہ گئے کہ اللہ کے علاوہ کسی کو اس کا علم نہیں۔

حضرت بحر العلوم نے فرمایا: اگر صوفیہ کی باتوں پر اب یقین جمنے لگا تو لیجیے جناب! امام غزالی اور شیخ محقق کی عبارتیں، وہ صاف فرما رہے ہیں کہ ایسا گمان نہ کرنا کہ حضور کو روح کا علم نہیں تھا۔

اور اے غیر مقلدو! جب تم دعویٰ اہل حدیث رکھتے ہو تو شیخ محقق کی بات تو مان ہی لو، ان کو تو صوفیت زدہ کہہ کر رد نہ کرو۔ وہ صاف فرماتے ہیں کہ آیت خود اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ حضور اقدس ﷺ کو روح کا علم تھا، اور کیسے نہ ہو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب اپنی ذات وصفات کا علم ان کو بخشا تو یہ روح کا علم تو اس کے سامنے ایک قطرہ ہے۔

پھر ندوی چھوکرے کو جب دار الندوہ کا خمار چڑھا تو وہ دلائل و براہین جو علم غیب اور حاضر و ناظر کے اثبات میں پیش کیے جاتے ہیں ان کو اپنے پاگل پن سے الٹا سمجھ کر نفی کے ثبوت میں لے آیا، تو حضرت بحر العلوم نے اس پر تبصرہ کر کے یہ شعر سنا دیا:

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں ۔۔۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

آگے چل کر وہی باتیں کہ ندوی چھوکرے بے چارے کو اہل سنت کا مذہب ومسلک معلوم نہیں اور رد و ابطال کا شوق چڑھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کھودا پہاڑ نکلی چوہیا۔ ساری محنت رائگاں گئی۔ اہل سنت کا مذہب نہ باطل قرار پانا تھا اور نہ ہوا۔ ایسی جہالت انسان کے لیے وبال بن جاتی ہے جو خلاف واقع چیز پر اذعان سے پیدا ہو۔ اس کو جہل مرکب کہتے ہیں، کہ واقع میں ہوتا کچھ ہے اور آدمی کچھ اور سمجھ بیٹھتا ہے، یہ لاعلاج مرض ہے، سیدنا اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے کیا خوب فرمایا:

جہل بھی بری بلا ہے، خصوصاً مرکب کہ لا دوا ہے۔

اس کے بعد ندوی چھوکرے نے اہل سنت کے دلائل پر بے جا تنقیدات کے ذریعہ اپنی علمی حیثیت جتائی ہے، حالاں کہ یہ ایسی جہالتیں ہیں کہ ان کے بڑے بھی ان سے بے زار ہوں گے، اور اس نوخیز و ناتجربہ کار کو میدان میں اتار کر کف افسوس ملتے ہوں گے۔

کہیں اعتراضات کے خمار میں کتر بیونت کر کے عبارتوں میں تحریف، جیسے بیضاوی اور ہدایہ کی عبارتوں میں کیا۔ کہیں ارشاد فرمایا: شاہد کے معنی حاضر کہنا متروک، جب کہ بحر العلوم نے قرآن میں ایسے تیس مقامات کی نشان دہی کی جہاں یہی معنی ہیں، اس طرح کے کیا کیا گل کھلائے ان کی گرفت میں آپ نے فرمایا:

رئیس صاحب!

آپ نے ادھوری عبارت کو پوری کہا، یہ جھوٹ ہوا۔

بیچ میں سے عبارت کے دو جملے چھپا لیے یہ چوری ہوئی۔ خود کتر "بیونت" کی اور ہم پر الزام لگایا یہ افترا پردازی ہوئی۔

ذرا بھی ڈر نہ ہوا کہ کوئی شخص بیضاوی سے آپ کی نقل کردہ عبارت کا تقابل بھی کر سکتا ہے، یہ وقاحت ہوئی۔

خود ہی ظلم و تعدی کی اور ہمارے خلاف ناظرین کو دہائی دی یہ ظلم ہوا۔

آپ اپنے داغوں کو کہاں چھپائیں گے۔ [ص ۲۵۱]

آخر کار ان تمام غیر مقلدوں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اس فضیلت عظمیٰ کی رسول اللہ ﷺ سے نفی ہو جائے۔ اور یہی نہیں ہر جگہ ان پڑھے لکھے جاہلوں کو اگر کام ہے تو صرف اس بات سے کہ مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کے فضائل و کمالات میں کتر بیونت کرنے اور کم سے کم کرنے کی کوشش کی جائے، خواہ وہ فضیلت کسی اور کے لیے ماننا پڑے حتی کہ ان کا شیوہ تو یہ ہے کہ یہ شیطان کے لیے بھی ایسی وسعت علم کے قائل ہیں کہ اس وسعت کو اگر حضور اقدس ﷺ کے لیے مانا جائے تو شرک قرار پائے۔ معاذ اللہ۔ یہ وہ مسلمان کہلانے والے لوگ ہیں جو اپنے آپ کو سچا پکا توحید پرست گردانتے ہیں، اور پھر کتابوں میں حضور سید عالم ﷺ کی تنقیص تلاش کرنے میں اپنی عمریں برباد کر کے نہایت خوش ہیں۔ حالاں کہ اس سے بڑی محرومی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ ہر قوم اپنے قائد و پیشوا کے فضائل و محاسن اور اس کی خوبیاں شمار کرنے کی کوشش

میں شب وروز صرف کرتی ہے۔ البتہ وہابیہ گروہ ضرور اس فکر میں ہے کہ اس کے گمان فاسد میں حبیب خدا ﷺ کے محامد ومناقب کے خلاف جہاں بھی جو ملے اس کو طشت از بام کرنے میں اپنی ساری طاقت خرچ کرڈالے۔ سیدنا اعلیٰ حضرت ان کی مثال یوں بیان فرماتے ہیں:

اپنی اغراض فاسدہ کے لیے اس (وہابی) کی کتاب بینی کی مثال بالکل سوئر اور سیر باغ کی ہوتی ہے، پھول مہکیں، کلیاں چٹکیں، تختے لہکیں، فوارے چھلکیں، بلبلیں چہکیں، اسے کسی لطف وسرور سے کام نہیں، وہ اس تلاش میں پھرتا ہے کہ کہیں نجاست پڑی ہو تو نوش جان کرے، بعینہ یہی حالت گمراہ بددین کی ہوتی ہے، ہزار ورق کی کتاب میں لاکھ باتیں نفیس وجلیل فوائد کی ہوں ان سے اسے بحث نہ ہوگی، کتاب بھر میں اگر کوئی غلط وباطل وخطا جملہ اپنے مطلب کا سمجھے گا اسی کو پکڑ لے گا اگرچہ واقع میں وہ اس کے مطلب کا بھی نہ ہو، اتنی بات اس میں خنزیر سے بھی بڑھ کر ہوئی کہ وہ نجاست لے گا تو اپنے مطلب کی اور اسے اس کی بھی تمیز نہیں۔

[فتاویٰ رضویہ جدید: ۱۵/ ۴۶۷]

حضرت بحر العلوم اس مقام پر فرماتے ہیں کہ رئیس صاحب آپ نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اس فضیلت عظمیٰ (یعنی میدان قیامت میں امم سابقہ کے سلسلہ میں شہادت) کی رسول اللہ ﷺ سے نفی ہو جائے اگرچہ جبرئیل امین کے لیے اس کا ثبوت ماننا پڑے، مگر آپ کی محنت ضائع گئی، کیا کیجیے گا۔ وحشت میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا ۔۔۔ جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

ندوی چھوکرے نے اسی طرح کی قلابازیاں آخر تک کھائی ہیں اور حضرت بحر العلوم نے ہر زاویہ سے خوب خبر لی ہے۔

پھر متفرقات کے عنوان سے کتاب کے چند آخری مباحث ہیں جن میں وہابیہ کی رسوائے زمانہ کتابیں ''کتاب التوحید۔ تقویۃ الایمان'' کی حقیقت۔ وہابیت وسلفیت اور غیر مقلدیت کا تعارف۔ حضور اقدس ﷺ کو کتابت ونقوش کا علم تھا۔ حضور نبی الانبیا ہیں اور سب سے پہلے آپ کو یہ منصب ملا۔ دیدار الٰہی۔ برزخی زندگی کے احوال وکوائف۔ حضور نبی کریم ﷺ کا قبر میں تشریف لانا۔ معجزہ وقتی یا دائمی۔ ان تمام چیزوں کے تعلق سے حضرت بحر العلوم نے بحث کو آخری منزل تک پہونچا کر سلفیت وغیر مقلدیت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

امابعد

الشاہد کا پس منظر

گورکھپور سے گونڈہ جانے والی لوپ لائن کے آس پاس، شرقاً وغرباً پوری لائن پر اور عرض میں ہمالہ کے دامن تک انسانی آبادی کی جو ایک لمبی پٹی چلی گئی ہے، اس میں جگہ جگہ مسلم آبادیوں کی خاصی تعداد پائی جاتی ہے اور ان میں متعدد آبادیاں ایسی ہیں جن میں غیر مقلدین کی اکثریت ہے اور دنیاوی اقتدار بھی انہیں کو حاصل ہے۔

پورے ہندوستان میں یہ فرقہ جہاں بھی آباد ہے اپنے کٹرپن اور بے جا مذہبی تعصب کے لیے خاصا نیک نام ہے۔ ترائی کے اس علاقہ میں بھی یہ طائفہ اپنے اسی قومی امتیاز کا حامل ہے۔ اور آج سے لگ بھگ ۲۵ رتیس سال قبل تو اس علاقہ میں ان کی چیرہ دستیاں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ سنی مسلمانوں کے ساتھ ان کا سلوک بالکل اچھوتوں جیسا تھا۔ انہیں مسلمان ماننے کے لیے تیار نہیں، ان کے ساتھ دعوتوں میں کھانا کھانے کے لیے آمادہ نہیں، اور ان کے گلاس میں پانی پینے کے روادار نہیں۔ اور سنی مسلمان اپنی لاعلمی کی وجہ سے اپنی اس معاشرتی تذلیل پر قانع اور اپنے کو دوسرے درجہ کا مسلمان سمجھے جانے پر راضی تھے۔ یہ بے چارے اپنی سادہ لوحی سے یہ سمجھتے تھے کہ شاید حقیقی مسلمان یہ غیر مقلد حضرات ہی ہیں۔

پورے علاقے میں وقتاً فوقتاً غیر مقلدین کے جلسے ہوتے، جس میں چندہ سب سے لیتے، مگر بلاتے غیر مقلد علماء کو جو ائمہ مجتہدین اور طبقۂ احناف پر کھلم کھلا تبرا کرتے، جگہ جگہ انہیں کی تعلیم گاہیں، اور قریہ قریہ ان کے علما موجود رہتے۔ قریب تھا کہ پورا علاقہ ہی غیر مقلدیت کے

رنگ میں رنگ جاتا کہ قدرت نے اپنے دین کی حفاظت کا ایک عجیب وغریب انتظام کیا۔

متشدد غیر مقلد خاندان کے ایک فرد کے دل میں علم دین کے حصول کا جذبہ پیدا ہوا، اور قسمت نے ان کو ایک سنی عالم دین حضرت استاذ الاساتذہ مولانا مشتاق احمد صاحب کانپوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں لا ڈالا۔ علم کی حقیقی روشنی پانے کے بعد گھر لوٹے تو ان کی حالت ہی عجیب ہوگئی۔ جیسے از سرنو مسلمان ہوئے ہوں، اور نومسلموں کے سے ہی جوش وخروش کے ساتھ پورے علاقہ میں مسلک حنفیت کی تائید ونصرت کے لیے آمادہ ہوگیے، چوں کہ خود ذی علم تھے اس لے کثیر التعداد مناظروں میں ترکی بہ ترکی ان کا جواب دیا۔ ایک دارالعلوم بنام ''انوار العلوم'' کی بنیاد ڈالی اور علمائے اہل سنت کو بلا بلا کر سال بسال تبلیغی جلسے بھی کردیے۔ اور اس راہ میں پیش آنے والی ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے استقبال بھی کیا۔ مدعیان ایمان وتوحید نے ان کے ستانے کے سارے ہی ہتھ کنڈے استعمال کیے اور ذلیل سے ذلیل حرکتیں کیں۔ لیکن استقلال کے ساتھ تھوڑی سی جدو جہد کے بعد مطلع صاف ہونے لگا، اور اہل سنت وجماعت کی حقانیت کا آفتاب نصف النہار پر چمکنے لگا۔ وہ مرد حق آگاہ اور عالم حق پناہ آج اس علاقہ کی مشہور دینی وعلمی شخصیت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب تھے۔

۱۹۴۹ء میں تدریس کے سلسلے میں جب میرا قیام مولانا کے قائم کردہ ادارے ''انوار العلوم'' تلشی پور ضلع گونڈہ میں ہوا۔ تب بھی مولانا اور غیر مقلدین کے درمیان ''مسئلہ حاضر ناظر'' پر تحریروں کا تبادلہ جاری تھا۔ غیر مقلدوں کی طرف سے دو رسالے ''جوابات حاضر وناظر'' اور ''خیر الامم'' اس مسئلہ کے خلاف اور ''خیر الانبیاء'' (مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی تحریر) اس مسئلہ کی تائید میں شائع ہوچکے تھے۔

مولانا نے اپنی تحریر میں ''مسئلہ حاضر ناظر'' کے معنی کی وضاحت کی تھی، کہ حضور سید عالم ﷺ کے حاضر وناظر ہونے سے علمائے اہل سنت کیا مراد لیتے ہیں۔ کیوں کہ جب تک دعویٰ متعین نہ ہو، دلیل کی حیثیت بے معنی بحث کی ہوتی ہے۔

اس کے بعد دعویٰ کے ثبوت میں ایک آیت پیش کی، مزید چند آیتیں تائید میں تحریر کیں۔ اسی طرح مدعا کی مثبت اور اس کی مؤید حدیثیں بھی پیش کیں اور پھر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ کوئی نیا مذہب اور نیا خیال نہیں۔ علمائے متقدمین کے اقوال نقل کیے کہ وہ حضرات بھی

حضور سید عالم ﷺ کی ذات پاک پر لفظ حاضر وناظر کا اطلاق کرتے ہیں۔اور انہیں حاضر وناظر مانتے ہیں۔اس کے بعد ان رسائل کے مندرجات کی طرف رجوع ہوئے جو حاضر وناظر کے رد میں لکھے گئے تھے۔

منکرین نے ''مسئلہ حاضر وناظر'' کے شرک ہونے پر یہ استدلال قائم کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾[ق:س ۵۰۔ت ۱۶]

میں انسانوں کے رگ گلو سے قریب ہوں۔

تو حاضر وناظر ہونا خدا کی صفت ہوئی۔اور قرآن میں ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾[شوریٰ:س ۴۲۔ت ۱۱]

اس کے جیسا کوئی نہیں۔

اس لیے رسول اللہ ﷺ یا کوئی انسان حاضر وناظر نہیں ہوسکتا۔

مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے اس کے جواب میں یہ معارضہ قائم فرمایا کہ اگر آپ کے استدلال کا یہی حال ہے تو قرآن شریف میں ہے:

﴿إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾[الاسراء:س ۱۷۔ت ۱]

اللہ ہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

اور دوسری آیت آپ کی ہی تلاش کی ہوئی ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾

لہٰذا کسی بھی دوسرے انسان کو سمیع وبصیر کہنا شرک ہوا حالاں کہ آدمی کو قرآن ہی خود سمیع وبصیر کہتا ہے:

﴿فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعاً بَصِيرًا﴾[الانسان:س ۷۶۔ت ۲].

اس کے بعد ان تمام حدیثوں کو نقل کیا جن کو مولوی عبد الرؤف صاحب جھنڈے نگری وغیرہ نے علم غیب رسول کے خلاف اور آپ کے ''حاضر وناظر'' ہونے کی نفی کے طور پر پیش کیا تھا۔اور ان کا صحیح مطلب بیان کیا۔

۴۹ء میں جب میں تلشی پور پہونچا تو مولوی عتیق الرحمٰن صاحب کی مذکورہ بالا تحریر کا

جواب تردید حاضر وناظر کے نام سے تازہ بتازہ شائع ہوا تھا۔ مولوی عتیق الرحمٰن صاحب نے اس کا جواب لکھنے کی خواہش ظاہر کی، مشاغل تدریس کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی میں نے سرانجام دیا۔ مگر اشاعت کی نوبت اس وقت آئی جب میں تلشی پور سے علاحدہ ہو کر مبارک پور آ گیا۔

مولوی عبدالرؤف صاحب نے اپنی تالیف جدید میں یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ مولوی عتیق الرحمٰن صاحب کی پیش کردہ آیات واحادیث میں متعدد احتمال پیدا کیے اور کہا کہ ان آیات واحادیث میں چند معانی اور ہو سکتے ہیں۔ تو استدلال میں احتمال پیدا ہو گیا۔ اور آیت یا حدیث آپ کے معنیٰ مراد پر قطعی الدلالۃ نہیں رہ گئی۔ اور یہ اصول ہے کہ جب کسی دلیل میں احتمال پیدا ہو جائے اور کچھ گوشے نکل آئیں تو قابل استدلال نہیں رہ جاتی۔ اس لیے ان آیتوں یا حدیثوں سے استدلال غلط ہے۔

بعض دلائل کے جواب میں فرمایا دعویٰ اعم ہے اور دلیل خاص ہے۔ یعنی دعویٰ کا مفہوم وسیع ہے اور دلیل سے اس سے کم ثابت ہو رہا ہے۔ بعض حدیثوں پر جرح بھی کی۔ اقوال کے جواب میں یہ کہا: ہم اہل حدیث ہیں، ہم پر دلیل یا قرآن سے قائم کی جاسکتی ہے یا حدیث صحیح سے۔ کسی بھی بڑے سے بڑے عالم کا قول حجت نہیں ہے خواہ وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو، اس لیے غیر نبی کا قول پیش کرنا بے کار ہے۔ اور کچھ غیر معروف کتابوں سے، وہ بھی مجہول حوالے دیے کہ علم غیب کا اعتقاد رکھنا علمائے احناف نے کفر بتایا ہے، پھر ان ساری حدیثوں کو کچھ اضافہ کے ساتھ دہرایا۔ جن میں بظاہر علم غیب کی نفی تھی یا ان کے بقول علم غیب کا انکار نکلتا تھا۔

مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے ان کی دلیل پر جو معارضہ پیش کیا تھا اس کا جواب یہ دیا تھا:

کہ خدا کے سمیع وبصیر اور بندے کے سمیع وبصیر ہونے میں فرق ہے۔ کہ وہ قدیم یہ حادث، یہ محدود اور وہ غیر محدود، وہ ذاتی اور یہ عطائی وغیرہ، جب اتنے فرق موجود ہیں تو شرک نہیں ہو سکتا، کیوں کہ اشتراک تو صرف لفظ کا ہے، ورنہ خدا کے سمیع وبصیر ہونے اور بندے کے سمیع وبصیر ہونے میں بڑا فرق ہے۔

جواب دیتے وقت میں نے اس امر کو شدت سے محسوس کیا کہ شاید غیر مقلدین کے غلط فہمی کا اصل سبب یہ ہے کہ مسئلہ حاضر وناظر کو بھی وہ لوگ عقیدہ توحید ورسالت کی طرح قطعی ویقینی

سمجھتے ہیں۔ یعنی ان لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ علمائے اہل سنت حضور ﷺ کو "حاضر وناظر" ماننا اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں، جتنا ان کو رسول ماننا، کہ اگر اس کا انکار کرے تو کافر قرار دیتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ کے ثبوت میں جو آیت یا حدیث پیش کی جاتی ہے اس کے جواب میں آیت میں کوئی احتمال پیدا کر کے کہہ دیتے ہیں کہ چونکہ دلیل قطعی ویقینی نہیں رہ گئی، اس لیے استدلال غلط ہے۔ پس اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے میں نے "باب فضائل کے چند اصول" کا عنوان قائم کیا۔ اصل بحث تو کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے، خلاصہ اس کا یہ ہے:

"کہ اسلام کے سارے احکام کی دو قسم ہے۔ ایک جس کا تعلق ماننے سے ہے عمل سے نہیں، اور ایک جس کا تعلق عمل اور کام سے ہے۔ یعنی مذہب اسلام میں کچھ باتیں کرنے کی ہیں اور کچھ ماننے کی۔ ماننے والے حصہ کو عقیدہ کہا جاتا ہے۔ اور کرنے والے حصہ کو عمل۔ پھر ان میں بھی دو دو قسمیں ہیں۔ عمل کی پہلی قسم فرائض جن کا ثبوت دلیل قطعی کا طالب ہے۔ دوسری قسم غیر فرض کہ اس کے ثبوت کے لیے دلیل قطعی کی ضرورت نہیں۔ دلیل ظنی سے بھی اس کا ثبوت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح عقائد کی بھی دو قسمیں ہیں۔ عقیدہ جس کے ثبوت کے لیے دلیل قطعی چاہیے۔ اور فضیلت جس کا ثبوت دلیل ظنی سے بھی ہو سکتا ہے۔ "مسئلہ حاضر وناظر" کا تعلق آخر الذکر قسم سے ہے، اس لیے وہ آیتیں بھی اس مسئلہ کے ثبوت کے لیے کافی ہیں جو آپ کے احتمال پیدا کرنے کے بعد ظنی الثبوت ہو جاتی ہیں۔ اس میں ہر حصے کو میں نے کافی بسط کے ساتھ حوالوں کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے اپنی کتاب میں مدعا کے ثبوت میں تین آیتیں پیش کی تھیں۔

(۱) سورۂ بقرہ۔ پارہ ۲

(۲) سورۂ نساء۔ پارہ ۵

(۳) سورۂ احزاب۔ پارہ ۲۲

کہ ان آیات میں حضور کو شاہد اور شہید کہا گیا ہے جس کے معنی حقیقی حاضر وناظر کے ہیں۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ "حاضر وناظر" ہوئے، اور معنی مجازی گواہ لیے جائیں تو بھی، چوں کہ گواہ کے لیے مشاہدہ ضروری ہے۔ اس لیے اس طرح بھی رسول اللہ ﷺ کا حاضر وناظر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

فاضل رحمانی کو اس پر

پہلا اعتراض تو یہی تھا کہ یہ لفظ کئی معنیٰ میں مستعمل ہے، تو معنیٰ حاضر وناظر میں قطعی نہیں رہا۔ لہٰذا یہ آیت دلیل نہیں بن سکتی ہے، کہ احتمال پیدا ہونے کے بعد استدلال ختم ہو جاتا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ حضور شاہد (گواہ) نہیں ہوں گے، بلکہ اپنی امت کے گواہوں کے مزکی اور مصدق ہوں گے کہ میری امت کے لوگ سچے ہیں اور گواہی کے قابل ہیں۔

تیسرا اعتراض یہ کہ شاہد اور گواہ ہوں تب بھی شاہد کے لیے دیکھنا ضروری نہیں، اس لیے آپ شاہد ہو کر بھی حاضر وناظر نہ ہوں گے۔

چوتھا اعتراض یہ کہ اگر شاہد کہنے کی وجہ سے حضور ﷺ حاضر وناظر ہیں تو امت کو بھی شاہد کہا گیا ہے، اس لیے وہ بھی حاضر وناظر ہوئے۔

میں نے اپنے جواب میں یہ واضح کیا کہ جب آپ کو اقرار ہے کہ شاہد کے معنیٰ ''حاضر وناظر'' بھی ہیں اور یہ ہم نصوص علماء سے ثابت کر آئے ہیں کہ قرآن اپنے ہر معنیٰ پر قابل استدلال ہے، تو پھر آپ انکار کیسے کر سکتے ہیں۔ ہاں یہ استدلال قطعی اور یقینی نہ ہوگا۔ لیکن یہ واضح ہو چکا ہے کہ مسئلہ حاضر وناظر کے لیے ظنی دلائل بھی کافی ہیں۔

دوسرے اعتراض کے جواب میں میں نے یہ ثابت کیا تھا کہ آیت ۳ کی تفسیر میں مفسرین نے رسول اللہ ﷺ کے شاہد ہونے کو واضح کیا ہے اور آپ کی شہادت ساری مخلوق پر مانی ہے۔ اس لیے آپ کا یہ کہنا غالط کہ آپ شاہد نہیں صرف مزکی ہوں گے۔

تیسرے اعتراض کے جواب میں نصوص علما سے یہ ثابت کیا تھا کہ شہادت کے لیے دیکھنا ضروری ہے، اور یہی شہادت (گواہی) کے حقیقی معنیٰ ہیں۔ اور جن چیزوں میں بہ ضرورت سن کر فقہا نے گواہی جائز قرار دی ہے، اس کو مجازی معنی میں گواہی کہتے ہیں۔ اس لیے آپ کو ثابت کرنا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کی گواہی حقیقی نہیں بلکہ سنی سنائی باتوں پر ہوگی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ سلم نے اگر کسی دوسری مخلوق سے سنا جس نے دیکھا تو وہی حاضر وناظر ہوا، اور اگر اللہ تعالیٰ نے حضور کو سب کچھ بتایا تو یہی ہمارا دعویٰ ہے کہ رسول اس لیے حاضر وناظر ہیں کہ اللہ نے ان کو سب کی یقینی خبر دے دی ہے۔

چوتھے اعتراض کے جواب میں لکھا تھا کہ امت کی گواہی اصلی نہیں فرعی ہوگی، جس کو اصطلاح فقہا میں شہادۃ علی الشہادۃ کہا جاتا ہے۔ اور اس کی تصریح متعدد روایات میں ہے۔ اس لیے ان کو حاضر و ناظر کہنا درست نہ ہوگا۔

مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے اپنے مدعا کی تائید میں ایک آیت:

﴿النَّبِيُّ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ﴾[الأحزاب: س ۳۴۔ ت ۶]

نبی مسلمانوں کی جانوں سے بھی زیادہ ان سے قریب ہیں،

پیش کی۔ اور استدلال یوں قائم کیا تھا: کہ مولوی قاسم نانوتوی نے تصریح کی ہے کہ "اولیٰ" کے معنی "اقرب" کے ہیں، لہذا رسول اللہ ﷺ مومنوں سے قریب ہوئے اور آپ حاضر ہوئے۔ اور اللہ نے آپ کو ناظر بھی بنایا ہے، لہذا جہاں جہاں حاضر ہوئے وہاں وہاں ناظر بھی ہیں۔

مولوی عبدالرؤف صاحب نے اس آیت پر کلام کرتے ہوئے کہا:

آیت کے معنی قریب اور اقرب نہیں بلکہ اولیٰ بالتصرف (یعنی رسول اللہ کو مسلمانوں پر تصرف کرنے کا اختیار خود ان مسلمانوں سے بھی زائد حاصل ہے) اس لیے حاضر و ناظر نہ ہوئے۔

دوسرا اعتراض یہ کہ مومنین صرف زمین پر ہیں تو رسول اللہ صرف زمین کے حاضر و ناظر ہوئے، سارے عالم کے نہیں۔

اس پر میں نے اپنی تحریر میں برسبیل تنزل لکھا تھا کہ اگر آپ نے مسلمانوں پر تصرف کرنے کا حق رسول اللہ ﷺ کو تسلیم کرلیا، تو آپ نے حاضر و ناظر ہونے کو مزید اختیارات کے ساتھ مانا۔ کیوں کہ تصرف کے لیے علم ضروری ہے، اگر سارے مومنوں پر تصرف کر سکتے ہیں تو ضروری ہے کہ سب کو جانیں بھی۔

دوسرے اعتراض کے سلسلہ میں کہا تھا کہ آپ کا خیال غلط ہے کہ مومن صرف زمین پر ہیں۔ مومن تو سارے عالم میں ہیں۔

حدیث نبوی ہے:

((وما من شيء إلا و يعلم أني رسول الله إلا كفرة أو فسقة الجن

والإنس)) (مجمع الزوائد للهيثمي: ۹/ ۶)

ہر شی مجھ کو خدا کا رسول مانتی ہے، کافر و فاسق جنوں اور انسانوں کے علاوہ۔

تیسری آیت جسے مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے اپنی تائید میں پیش کیا تھا:

آیت مبارکہ:

﴿وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِينَ﴾[الانبیاء:س ۲۱۔ت ۱۰۷] ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب سارے عالم پر مہربان، اور مہربانی کرنے کے لیے علم بھی ضروری تو آپ سب کے عالم بھی ہوئے اور یہی معنیٰ ہیں آپ کے حاضر و ناظر ہونے کے۔ اس پر رحمانی صاحب کو یہ اعتراض تھا کہ قرآن میں رحمت کا اطلاق دیگر چودہ معانی پر بھی آیا ہے۔ اس لیے اس آیت میں رحمت سے حضور ﷺ کو مراد لینا صحیح نہیں۔

اس کے جواب میں میں نے لکھا تھا کہ اس سے بڑی زیادتی اور کیا ہوگی کہ اللہ پاک تو اس آیت مبارکہ میں آپ کو مخاطب کر کے آپ کے لیے رحمت کا لفظ فرما رہا ہے، اور آپ کہہ رہے ہیں کہ رحمت سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ذات نہیں ہے۔

مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے مسئلہ حاضر و ناظر کے ثبوت میں متعدد حدیثیں پیش کی تھیں، ان میں سے صرف چار حدیثوں کو ہم نے بحث کے لیے منتخب کیا تھا جو اس مدعا پر اس درجہ فصاحت سے دلالت کر رہی تھیں کہ یہ مسئلہ گویا انہیں حدیثوں کی ترتیب و اجتماع سے اخذ کیا گیا ہو۔

(۱) ''فوضع كفه بين كتفي فوجدت برد أناملها بين ثديي فتجلى لي كل شيء وعرفت''.

(الجامع الصحيح للبخاري: تفسير سورة صافات ۲/ ۱۵۵)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنا دست قدرت میرے مونڈھوں کے درمیان رکھا تو وصول فیض کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینے میں محسوس کی، پس مجھ کو سب کچھ معلوم ہو گیا، اور مجھ پر سب روشن ہو گیا۔

(۲) ''إن الله رفع لي الدنيا ، فأنا أنظر إليها وإلىٰ ماهو كائن فيها إلىٰ يوم القيامة، كأنما أنظر إلىٰ كفي هذا''. (حلية الأولياء: ۶/ ۱۰۱)

اللہ پاک نے دنیا میرے پیش نظر کی تو میں اس کو دیکھتا ہوں اور جو اس میں قیامت تک

ہونے والا ہے اس کو دیکھتا ہوں۔ ایسا جیسے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی دیکھ رہا ہوں۔

(۳)"لا تسئلوني عن شيء إلا نبأتكم و أنا في مقامي هذا."

(مسند امام احمد بن حنبل: ۲/۵۰۳)

جب تک میں منبر پر کھڑا ہوں تم مجھ سے جو پوچھو میں بتاؤں گا۔

(۴)"يخبر كم بما مضىٰ وما هو كائن بعد كم."

(مسند امام احمد بن حنبل: ۳/۲۰۴)

یہ رسول تم کو ان سب کی خبر دیتے ہیں جو گذر گیا یا آنے والا ہے۔

یہ حدیثیں مسئلہ "حاضروناظر" کو جس وضاحت سے ثابت کر رہی ہیں ہر آدمی سمجھ سکتا ہے، کسی تفسیر یا وضاحت کی ضرورت نہیں لیکن "فاضل رحمانی" مولوی عبدالرؤف جھنڈے نگری کو ان پر بھی اعتراض ہے۔

پہلی حدیث پر انہوں نے کہا کہ حدیث شریف میں جس عام اور تام مشاہدے کا ذکر ہوا ہے عالم خواب کے بعد وہ کیفیت ختم ہوگئی۔ اس لیے حضور حاضروناظر نہیں۔

اس پر میں نے عرض کیا تھا: انکشاف عالم خواب میں ہوا۔ اس کا ثبوت حدیث سے ہے، خواب کے بعد اس انکشاف کے ذریعہ سے حاصل ہونے والا علم بھی ختم ہوگیا۔ آپ کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے؟ کیا ہر تعلیم کے لیے یہ لازم ہے کہ تعلیم کے بعد حاصل ہونے والے علم کا ازالہ ہو جائے۔ پھر آپ اپنے علم کا دعویٰ کس طرح کر سکتے ہیں؟۔

پھر انبیاء کے خوب بھی وحی ہوتے ہیں۔ آپ کی اس موشگافی کا مطلب تو یہ ہوا کہ وحی منامی کا وجود خواب ختم ہونے کے بعد کچھ نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

دوسری حدیث کو ضعیف کہہ کر فاضل رحمانی نے پیچھا چھڑایا تھا۔ حالانکہ باب فضائل میں بالاتفاق ضعاف معتبر ہیں۔ لیکن میں نے جواب میں اس کے موافق ایک صحیح حدیث پیش کر کے اس کو درجہ حسن تک پہونچا دیا تھا۔

تیسری حدیث پر انہوں نے یہ اعتراض کیا تھا:

کہ جب تک آپ منبر پر تھے اس وقت تک آپ نے سب بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ منبر سے اترنے کے بعد خبر دینا ختم تو علم بھی ختم۔ گویا کہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے آپ پر

وہ حالت طاری ہوئی پھر ختم ہوگئی۔

یہ بات اتنی مضحکہ خیز ہے کہ اہل علم ہنسیں گے، مگر غیر مقلد حضرات سے اس کی کیا شکایت۔ میں نے اس کے جواب میں بتایا تھا کہ حضور نے فرمایا: جو پوچھو سب بتاؤں گا، آپ نے یہ بات سب کچھ جان لینے کی صورت میں کہی تھی۔ یا لاعلمی میں یوں ہی دھونس جمانے کے لیے۔ اگر یہ عام اعلان علم ہونے کی صورت میں تھا تو خبر دیں نہ دیں آپ عالم ہوئے۔ اس لیے یہ بالکل بے ہودہ بات ہے کہ منبر سے اترنے کے بعد خبر دینا ختم تو علم بھی ختم۔ اہل اسلام کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مولوی عبدالرؤف صاحب نے ایک بات یہ بھی کہی تھی۔ کہ حضور ﷺ کا یہ قول عالم غضب میں تھا۔ اس لیے قابل استدلال نہیں، معاذ اللہ گویا حضور نے غصہ کے عالم میں صرف دھونس جمائی تھی علم نہ تھا۔ یہ بات فاضل رحمانی کی ہر چند کہ لاجواب تھی پھر بھی ہم نے حدیثوں سے یہ ثابت کیا تھا کہ حضور عالم غضب میں بھی سچ ہی بولتے تھے۔

اور سب کے بعد یہ ایک پر لطف سوال فاضل رحمانی سے کیا تھا کہ آپ نے انکشاف تام اور سارے عالم کا علم تسلیم کیا گو تھوڑی دیر کے لیے، اور جہاں دعویٰ عام دلیل خاص کہہ کر جواب دیا ہے وہاں محدود علاقہ کے لیے، تو کیا آپ تھوڑی دیر کے لیے اور محدود علاقہ کے لیے جس کا ذکر حدیث میں آیا ہے حضور ﷺ کو حاضر و ناظر مانتے ہیں؟

چوتھی حدیث کا فاضل رحمانی نے یہ جواب دیا تھا:

کہ حدیث شریف میں لفظ ''ما'' عام نہیں ہے کہ ما کان و مایکون کا علم مراد لیا جاسکے۔ ورنہ اُمی کے لیے بھی ایک جگہ

﴿وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ﴾[البقرة: س ۲۔ت ۱۵۱]

آیا ہے، تو وہ بھی حاضر و ناظر اور عالم ما کان و ما یکون ہوں گے۔

اس کے جواب میں میں نے بتایا تھا کہ ''ما'' اصل وضع میں عموم کے لیے آتا ہے اور اس کو اس معنی سے پھیر کر مجازی معنی میں لے جانے کے لیے قرینہ اور تخصیص کی دلیل چاہیے۔ جو آپ دکھا نہیں سکتے۔ اور امت کو حضور نے خبر سب کی دی لیکن وہ عالم ما کان و مایکون اس لیے نہیں ہوئے کہ صحیح حدیث میں آیا ہے:

((فأعلمنا أحفظنا))(الصحيح لمسلم كتاب الفتن ۲/۳۹۰)

جس نے جتنا پایا دکھا وہ آج اتنا بڑا ہی عالم ہے۔ یعنی سب کو پورا پایا ذہیں رہا۔

اس کے بعد میں نے ان آیتوں اور حدیثوں کو ایک ساتھ لکھ کر جن کو علم غیب اور حاضر وناظر کی نفی میں پیش کیا جاتا ہے ان کے مقابلہ میں ان آیتوں اور حدیثوں کو ذکر کیا تھا جن سے آپ کے حاضر وناظر اور ساری کائنات کے عالم ہونے کا ثبوت ملتا ہے، پھر ان دونوں میں علمائے اسلام نے جو تطبیق دی اس کا ذکر کیا تھا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے: عالم ماکان ومایکون ہیں جیسا کہ ثبوت علم کی آیات اور احادیث بتا رہی ہیں۔ اور جن میں نفی ہے وہاں علم ذاتی غیر متناہی اور علم حضوری وغیرہ مراد ہے۔ اور اللہ کے عالم الغیب اور رسول اللہ کے عالم غیب ہونے میں بے شمار فرق ہے۔ جس طرح فاضل رحمانی نے بندہ اور خدا دونوں کو سمیع وبصیر مان کر دونوں میں حادث، قدیم، ذاتی، عطائی کا فرق نکالا تھا۔

اقوال علما کے سلسلے میں میں نے لکھا تھا کہ آپ ان کو دیکھ کر بد کیے نہیں، یہ آپ کے اس الزام کے جواب ہیں کہ حاضر وناظر ماننا اہل بریلی کی ایجاد ہے۔ کیوں کہ جن علما کے ہم نے اقوال نقل کیے ہیں ان میں سے کوئی بھی بریلوی نہیں ہے۔ ان کے نقل کیے ہوئے اقوال پر بھی ہم نے کلام کیا تھا جس کو آیندہ صفحات میں ذکر کریں گے۔

ہم نے یہاں تک طرفین کی پوری بحث کا خلاصہ تحریر کر دیا ہے، انشاء اللہ کسی کو ناقص ترجمانی کی شکایت نہ ہوگی، اس سے ہماری کتاب (الشاہد) کے سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔ اور اس کے بعد ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس پر بھی روشنی پڑے گی۔

میں اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ کتاب مکمل ہونے کے بعد تلشی پور میں اس کی اشاعت نہ ہوسکی، ۱۹۵۶ء میں تلشی پور چھوڑ کر میں دار العلوم اشرفیہ میں آگیا، اور ایک طرح سے اس کی اشاعت سے مایوس ہی ہو چکا تھا، کہ مولانا الاعز محمد حنیف صاحب براؤنی زید مجدھم کی جدوجہد سے ۱۹۶۰ء میں یہ کتاب شائع ہوسکی، چھ سال بعد ۱۹۶۶ء میں اس کا جواب ''ابطال شواہد الشاہد'' نظر سے گذرا، پورے شوق اور انتہائی بے تابی سے پوری کتاب پڑھ ڈالی۔ مؤلف کوئی نوخیز عالم ہیں۔ کتاب ہاتھ میں لی تھی تو شوق تھا کہ بحث کے کچھ نئے گوشے سامنے آئے ہوں گے۔ اور جواب میں لکھنے کے لیے کچھ میدان اور وسیع ہوا ہوگا۔ لیکن کتاب پڑھ کر طبیعت سخت بدمزہ ہوئی۔ اور خیال گذرا کہ فاضل رحمانی نے شاید یہ سوچ کر خود جواب کی زحمت نہیں اٹھائی کہ

اصل مسئلہ سمجھانے کے لیے طرفین سے اب تک جو کچھ کہا جا چکا ہے وہی کافی ہے۔اس پر اضافہ کی گنجائش نہیں۔اور جواب کے نام سے کچھ نہ کچھ ہونا ہی ہے، تو اس کے لیے یہ صاحب زادے ہی کافی ہیں۔جنہیں آگے پیچھے کی بھی سدھ بدھ نہیں۔یہی بے باکی سے اناپ شناپ بک سکیں گے۔

چنانچہ اس کتاب کے جواب لکھنے کا داعیہ بالکل ختم ہو گیا۔لیکن اس موضوع پر کچھ اور بھی میٹرس میرے پاس جمع تھے۔اس لیے بالکل نئے سرے سے اس مسئلہ کے تمام گوشوں پر ایک تحقیقی کتاب سوال و جواب کے نقطۂ نظر سے ہٹ کر لکھنا شروع کیا۔ابتدا کے پندرہ بیس صفحے لکھ بھی لیے، پھر جو دوسرے کاموں کا ہجوم ہوا تو یہ اوراق بھی زینت طاق نسیاں ہو گئے۔

ادھر الشاہد کے مطبوعہ نسخے ختم ہو گئے، تو مکتبۃ الحبیب الہ آباد والوں نے بطور خود اس کتاب کی دوبارہ کتابت کرالی اور شائع کرنے کا اعلان کیا جس کو کئی سال ہو گئے۔اس طرح اس کتاب کے ساتھ الہ آباد میں بھی ایک بار پھر وہی سلوک ہوا جو ابتدا میں تلشی پور میں ہو چکا تھا۔

اب پھر مختلف حلقوں سے اس کی اشاعت کا تقاضا ہوا۔اس لیے دوسرے ایڈیشن کی خاطر اسے پریس میں دینا پڑا اور یہ ضروری معلوم ہوا کہ اس نئی کتاب کے بارے میں بھی کچھ صفحات ملحق کر دیے جائیں جس سے ناظرین اندازہ لگا سکیں کہ یہ نئی کتاب ایک نو آموز کی شوخیوں سے زائد کچھ نہیں۔

باب فضائل کے چند اہم اصول

سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ مسئلہ "حاضر و ناظر"، علم غیب۔یا جسد اطہر کے سایہ ہونے، نہ ہونے کی بحث۔یا اس قسم کے اور دیگر مسائل ان کا تعلق عقیدے سے بایں معنی ہر گز نہیں کہ جس طرح حضور کی رسالت کا اقرار ضروری ہے اسی طرح ان کا بھی اقرار فرض ہے، بلکہ ان کا تعلق فضائل نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اس کے بارے میں اہل سنت و جماعت کثرھم اللہ تعالیٰ کے جو بنیادی اصول ہیں انہیں اجمالاً عرض کر دیں، کہ مسئلہ "حاضر و ناظر" کی ساری بحث جو فاضل رحمانی کے کرتوت سے بے اصولی اور انتشار کی نذر ہو گئی ہے۔ایک منظّم شکل میں سامنے آجائے۔اصول یہ ہیں:

(۱) جس طرح تمام عبادات و اعمال میں جو دلیل قطعی سے ثابت ہو اس کا ماننا فرض

ہے،اور اگر یہ ثبوت ضروری دینی ہو تو اس کا منکر کافر ہے۔ جیسے نماز، روزہ، اور جو دلیل ظنی سے ثابت ہے اس کے ماننے والے کا فرو مشرک ہونا تو بڑی بات ہے، وہ پکے مسلمان ہیں، اور ان کو مشرک یا گمراہ کہنے والا خود بددین ہے، جیسے نفل نماز، نفل روزے۔ اسی طرح تمام فضائل متعلقہ نبوت میں بھی جو دلیل قطعی سے ثابت ہو۔ جیسے "اسریٰ" اس کا منکر کافر (اور یہی عقیدہ بھی ہے) اور جو دلیل ظنی سے ثابت ہے جیسے مشک سے زیادہ خوشبودار پسینہ ہونا۔ ان کا ماننے والا پکا مسلمان اور اس کے ایمان میں شک کرنے والا خود گمراہ۔

(۲) قرآن عظیم ذی وجوہ کثیرہ ہے۔ اور ہر وجہ کی بنا پر محتج بہ ہے، تاوقتیکہ وہ وجوہ باہم متضاد نہ ہوں۔ اگر کسی وجہ سے کوئی استدلال کرے تو صرف یہ کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا کہ اس آیت میں دیگر احتمالات بھی ہیں۔ اور إذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال .زیادہ سے زیادہ یہ استدلال ظنی ہوگا۔ جو باب فضائل میں مقبول ہے۔

(۳) حضور ﷺ اپنے ہر ہر وصف جمیل میں سارے عالم میں بے مثال ہیں، اس لیے ان کے فضائل کی جانچ کا معیار بھی عام انسانوں سے بلند ہوگا۔

(۴) وہ معیار یہ ہے کہ آپ کی کسی فضیلت سے بحث کرتے وقت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ فضیلت عام عقول کے خلاف ہے۔ اس لیے غلط ہے، بلکہ صرف یہ دیکھا جائے گا کہ عقل کامل کے نزدیک ایسا ممکن ہے یا نہیں۔

تشریح:

مذکورہ بالا چاروں اصول گو بجائے خود بہت واضح اور مسلم ہیں جن کا انکار کوئی صاحب عقل سلیم نہیں کر سکتا، لیکن مزید وضاحت کے لیے ہم ضروری تشریح مناسب سمجھتے ہیں۔

فضائل کی قطعیت اور ظنیت: فضائل محمد رسول اللہ ﷺ کی یہ دو قسمیں جنہیں ہم نے نمبر اول کے ضمن میں بیان کیا ہے ان کا ثبوت اسلام کی پوری تاریخ سے ہوتا ہے۔ خود واقعہ معراج ہی میں یہ تقسیم بڑی وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔ علامہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب "مدارج النبوۃ" میں تحریر فرماتے ہیں:

اسریٰ کہ بردن آں حضرت است از مکہ تا مسجد اقصیٰ ثابت است بکتاب اللہ کہ منکر آں کافر ست۔ واز آنجا بآسمان بردن کہ معراج است از احادیث مشہور کہ منکر آں مبتدع وفاسق

ومخذول است۔ وثبوت دیگر از جزئیات عجائب وغرائب احوال باخبار است کہ منکر آں جاہل محروم است۔

اسرا کہ حضور کو مکہ سے بیت المقدس تک لے جانے کا نام ہے، قرآن سے ثابت ہے، اس کا منکر کافر ہے۔ اور وہاں سے آسمان پر جانا جس کو معراج کہتے ہیں، اس کا ثبوت مشہور حدیثوں سے ہے، اس کا منکر بدعتی فاسق رسوا ہے۔ اور دیگر جزئیات اور عجیب وغریب حالات کا ثبوت ایسی خبروں سے ہے کہ ان کا منکر جاہل ومحروم ہے۔

[مدارج النبوۃ جلد اول ص:۱۷۵]

اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی واقعہ معراج میں جو حضور کے فضائل میں بڑے بلند مرتبے پر ہے۔ کچھ کا منکر کافر، کیوں کہ اس کا ثبوت نص قرآنی اور دلیل قطعی سے ہے۔ اور کچھ کا ثبوت چوں کہ اتنا قطعی نہیں ہے، اس لیے اس کا منکر محروم اور جاہل وغیرہ ہے کافر نہیں۔ لیکن یہ کوئی نہیں کہتا کہ چوں کہ اقرار معراج باب عقائد سے ہے، اس لیے اس کا ثبوت دلیل ظنی یا اخبار احاد سے نہیں ہوسکتا۔ اور معراج کے دیگر جزئیات کو ماننا کفر ہے، اگر کوئی پیدا ہوا تو فاضل رحمانی جن کو عقائد وفضائل میں تمیز نہیں۔ اور اس جہالت پر آپ کو فخر بھی ہے گویا آپ کی زبان حال کہہ رہی ہے:

کو دا تری مجلس میں کوئی دھم سے نہ ہوگا　　جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے بھی نہ ہوگا

اسی طرح "مسئلہ حاضر وناظر" بھی جو فضائل سید المرسلین ﷺ میں سے ایک فضیلت ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے دلیل ظنی کافی ہے۔ دلیل قطعی کی قطعاً ضرورت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو چیز دلیل قطعی سے ثابت ہے، اگر اعمال سے ہے تو فرض بن جاتی ہے۔ اور اقراریات سے ہے تو ایسا عقیدہ بن جاتی ہے جس انکار کفر ہے۔ یہ نہیں کہ پہلے فرض مانو، پھر دلیل تلاش کرو۔ یا پہلے عقیدہ تسلیم کرلو پھر حجت ڈھونڈو۔ ہمارے "فاضل رحمانی" "مسئلہ" حاضر وناظر" کو باب عقائد سے مانتے اور دھڑ ادھڑ دلیل قطعی کے طالب ہیں۔ جیسا کہ ان کی اس حرکت سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کی ہر آیت میں احتمال نکال کر کہتے ہیں کہ استدلال ختم ہوگیا۔ ہمارا یہ ہرگز دعویٰ نہیں کہ "مسئلہ حاضر وناظر" باب عقائد سے ہے۔ ومن ادعی فعلیه البیان. اگر فاضل رحمانی کو دعویٰ ہے تو دلیل لائیں۔ تعجب ہے کہ جو علم سے اتنا کورا ہو کہ فضائل وعقائد کو ٹھیک نہ سمجھ سکے

وہ اپنے دماغ کو منطق اسلامی کا مخزن بتائے، علمی مسائل پر قلم اٹھائے۔ افسوس

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

اس امر کی شہادت کہ قرآن عظیم کی ایک ایک آیت میں مختلف معانی ہیں، اور ہر ایک سے استدلال جائز ہے۔ پوری تاریخ اسلام دیتی ہے۔ اور خود مخبر صادق سرکار دو عالم ﷺ کی احادیث کریمہ سے بھی قرآن کے کثرت معانی کا ثبوت ہوتا ہے۔ ابونعیم وغیرہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

((القرآن ذو وجوه كثيرة، فاحملوه على أحسن وجوهه.))

(کنزالعمال: ۲۴۶۹)

قرآن عظیم بہت وجہوں والا ہے۔ تو سب سے ٹھیک وجہ پر اسے حمل کرو۔

فریابی نے حسن رضی اللہ تعالیٰ سے روایات کیں:

((لكل آية ظهر وبطن، ولكل حرف حد، ولكل حد مطلع))

(کنزالعمال: ۲۴۶۱۰۔ ۱/۵۵۰)

ہر آیت کے ظاہری معنی ہیں اور باطنی اور ہر حرف کے لیے حد و مطلع ہیں۔

((عن أبي الدرداء أنه قال: لا يفقه العبد كل الفقه حتى يرىٰ للقرآن وجوها.)) (اتحاف السادة المتقين للزبيدي: ۴/۵۲۷)

حضرت ابودرداء فرماتے ہیں: آدمی اس وقت تک فقیہ کامل نہیں ہوتا جب تک اس کو قرآن کی کثیر وجوہ پر عبور حاصل نہ ہو جائے۔

وقال بعض العلماء: ((لكل آية ستون ألف فهم.))

اور بعض عالموں کا قول ہے کہ ہر آیت کے ساٹھ ہزار معانی ہیں۔

وقال علي رضي الله عنه: ((لو شئت لأوقرت من القرآن أربعين بعيرًا.)) (مرقاة المفاتيح: ۱/۲۳۸)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اگر میں چاہوں تو قرآن کی تفسیر سے چالیس اونٹوں کو لاد دوں۔

”القرآن ذو وجوه، وهو حجة بكل وجهة مالم تتنافا“.

قرآن کی کثیر وجہیں ہیں اور جب تک وہ باہم منافی نہ ہوں سب سے استدلال جائز ہے۔

یوں ہی:

﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً [البقرة:س ۲۔۲۰۱]﴾

کی تین سو تفسیریں کی گئی ہیں۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آیات قرآنی میں وجوہ کثیرہ اور معانی وافرہ ہیں۔

جميع العلم في القرآن لكن　　　تقاصر عنه أفهام رجال

اور یہ امر کہ ہر وجہ محتج بہ ہے اس کی تصریح علامہ زرقانی شارح مواہب لدنیہ نے اپنی کتاب زرقانی میں کی۔ اور عملا تو ساری امت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے، چناں چہ علمائے امت کے باہمی اختلاف اور ایک آیت سے متعدد استدلال اس کی واضح نشانی ہیں۔ چناں چہ قرآن کی آیت: ﴿ثلاثة قروء﴾ سے امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ طہر مراد لیتے ہیں، اور کروروں مسلمان اس پر عمل کرتے ہوئے عورت کی عدت طہر قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف حنفیہ حیض مراد لے کر عدت حیض قرار دیتے ہیں۔ اور اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں، اگر آیت کے یہ دونوں احتمال قابل استدلال نہ ہوتے تو سرے سے حنفیہ اور شافعیہ کا یہ استدلال باطل ہو جاتا، اور آج غیر مقلدین بھی کسی آیت اور حدیث سے کوئی استدلال قائم نہیں کر سکتے، کیوں کہ ہر آیت وحدیث کے علما نے مختلف معانی اور احتمالات بیان کیے ہیں۔ مثلاً مذکورہ بالا آیت سے ہی غیر مقلدین اپنا مسلک خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ثابت نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ان کے مدعا کے خلاف احتمالات اس آیت میں موجود ہیں۔

رفع شک:

یہیں سے فاضل رحمانی کی ان تمام مذبوحی حرکتوں کا رد بھی ہو گیا جو انہوں نے ''حاضر وناظر'' کی بحث میں اس حیثیت سے کی ہیں: کہ ہر دلیل کے مقابلہ میں کوئی نہ کوئی احتمال نکال دیا ہے، اور یہ لکھ دیا ہے کہ چوں کہ اس آیت یا حدیث کے صرف وہی معنی نہیں ہیں جو مثبت نے تحریر کیے ہیں، بلکہ دیگر احتمالات بھی ہیں، اس لیے یہ دلیل ہم کو کچھ بھی مضر نہیں۔ مثلاً وہ ''شاہداً'' کے معنی کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اگر شاہد کے معنی حاضر وناظر کے ہوں جب بھی ہم کو مضر نہیں۔ کیوں کہ شاہد کے اور بھی معنی آتے ہیں۔ جیسے دن کو مشہود اور امتیوں کو شاہد وغیرہ کہا گیا

ہے۔اس لیے حاضر وناظر کے احتمال کے ساتھ ہی ان دیگر معانی کا بھی احتمال ہے۔اور اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال.

لیکن جب یہ بات ثابت ہو چکی کہ اگر چند احتمال قرآن مجید کی کسی آیت میں ہوں تو ہر ایک سے استدلال کیا جا سکتا ہے، بشرطے کہ اس میں تعارض نہ ہو، پھر معنی حاضر وناظر کی بنا پر اہل سنت اگر حضور کو حاضر وناظر مانتے ہیں تو صرف دیگر احتمال کی وجہ سے اس کا انکار کیوں کر ممکن ہے؟ جیسا کہ فاضل رحمانی نے جگہ جگہ اس پھوس کی ٹٹی سے آڑ لی ہے۔زیادہ سے زیادہ یہ استدلال ظنی ہوگا۔لیکن ہم یہ کب کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کو حاضر وناظر ماننا فرض ہے۔یہ ایمان کا تقاضہ ہے کہ جس کو اس کا جتنا حصہ ملتا ہے حضور سے اس کی محبت اتنی ہی شدید ہوتی ہے۔

دہد عشق احمد بندگان چیدۂ خودرا بخاصاں شاہ می بخشد مئے نوشیدۂ خودرا

اسی طرح ''علم الانسان'' کی بھی مختلف تفسیریں نقل کر کے فاضل رحمانی نے خواہ مخواہ یہ کوشش کی ہے کہ چوں کہ علم کے کئی معنی ہیں اور انسان سے بھی مفسرین نے ایک سے زیادہ مراد لی ہے۔اس لیے ''علم الانسان'' سے حضور ﷺ کی وسعت علمی پر سند لانا درست نہیں۔ اس کا دوٹوک جواب تو یہی ہے کہ قرآن ہر احتمال کی بنا پر قابل احتجاج واستدلال ہے۔اس لیے کسی احتمال کی بنا پر اگر کوئی شخص حضور کی وسعت علمی کا قائل ہو تو اس کو مشرک وکافر فرمانے سے پہلے اس مفسر کو کافر ومشرک قرار دیجیے جس نے یہ تفسیر کی ہے۔[1]

[1] فاضل رحمانی نے آیت:

﴿وَعَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ﴾ [العلق: س ۹۶۔ت ۵]

کی کئی تفسیریں لکھی ہیں۔کسی میں حضور ﷺ مراد ہیں، اور بیان سے مراد ماکان ومایکون ہے، تو کسی میں انسان سے مراد آدم اور بیان سے مراد أسماء کل شیء۔اور کسی میں انسان سے مراد جنس انسان اور بیان سے مراد منطق فصیح۔لیکن پہلی تفسیر کو کمزور ثابت کرنے کے لیے عجب عجب حرکتیں کی ہیں۔کہتے ہیں کہ چوں کہ پہلی تفسیر کو مفسروں نے لفظ ''قیل'' سے بیان کیا ہے لہذا ضعیف۔تمام احتمالات کے اخیر میں لکھا ہے لہذا ضعیف۔اس کو بطریق احتمال کیا ہے، مستند مفسروں نے اس کو بیان نہیں کیا ہے، لہذا ضعیف۔۔اور یہ تمام مذبوحی حرکتیں اس لیے کی گئی ہیں کہ پہلی تفسیر کو مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے نقل کیا ہے۔لیکن خود ہی بری طرح بے

ایمانی کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ کیوں کہ اگر لفظ قیل وجہ ضعف ہے تو وہ تفسیر جس کو آپ نے بڑے طمطراق سے صحیح کہہ کر پیش کیا ہے اس کو بھی صاحب خازن نے لفظ قیل سے بیان کیا ہے۔ اس لیے وہ بھی مرجوح ہوئی۔ لیکن شاید آپ نے خازن دیکھتے وقت بے ایمانی کی عینک لگائی تھی۔ اس لیے آپ کو نظر نہ آیا، اگر اخیر میں بیان کرنا وجہ ضعف ہے تو علامہ رازی نے تفسیر کبیر میں حضرت آدم علیہ السلام والے قول کو تمام تفسیروں کے اخیر میں لکھا ہے، جس کو آپ معتبر کہہ چکے ہیں۔ پھر کہیے آپ سچے؟ آپ کا قاعدہ سچا؟ یا امام رازی؟ اور اگر علمائے تفسیر کا اس احتمال کو ذکر نہ کرنا وجہ ضعف ہے، تو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تفسیر میں صرف حضرت آدم والا قول نقل کیا ہے بقیہ کو چھوڑ دیا ہے۔ بیضاوی میں انسان مطلق والی تفسیر ہے اور بقیہ کو چھوڑ دیا ہے۔ امام بغوی، خازن، مدارک، تفسیر کبیر، اور حسینی، سواطع الالہام میں تینوں اقوال منقول ہیں۔ آپ کے بیان کردہ اصول پر ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر پر حضرت آدم والے قول کے علاوہ سب ضعیف۔ بیضاوی کی تفسیر پر انسان مطلق قوی اور بقیہ دونوں ضعیف، اور بقیہ تفاسیر پر سب قوی، کیا گورکھ دھندا ہے۔ بندہ پرور، سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست۔ ۱۲ منہ

یونہی فاضل رحمانی نے آیت:

﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ﴾ [المائدة: س ۵۔ ت ۱۰۹]

کے تحت لکھا کہ اگر حضور "حاضر وناظر" ہیں اور اعمال امت جانتے ہیں، تو جب قیامت میں سب رسولوں کو جمع کر کے خدا پوچھے گا تو لا علم لنا (ہمیں کوئی علم نہیں) کیوں فرمائیں گے۔ مولوی عتیق الرحمٰن صاحب نے رسالۂ خیر الانبیاء میں مدارک کے حوالہ سے ایک تفسیر نقل کی:

"قالوا: ذلک تأدباً أي: علمنا ساقط مع علمک، فکأنہ لا علم لنا".

(مداک التنزیل: ۱/ ۳۰۸)

انبیا یہ جواب ادباً دیں گے کہ ہمارا علم تو تیرے علم کے مقابلہ میں ہیچ ہے گویا ہم کو کوئی علم نہیں۔

فاضل رحمانی نے یہاں بھی کئی تفسیریں نقل کی ہیں۔ لیکن جب یہ اصول طے ہو گیا کہ قرآن ہر وجہ کی بنا پر محتمل بہ ہے، تو اس کا ہمارے مدعیٰ پر اثر نہیں پڑتا۔ البتہ ہمارا استدلال کثرت

احتمال کی بنا پر ظنی ہوگا۔ یعنی اس کا انکار کفر نہیں۔

یہاں بھی فاضل رحمانی نے انتہائی بے وقوفی سے راجح مرجوح کی بحث پیدا کی ہے کہ مدارک میں اس کو تمام تفسیروں کے اخیر میں لکھا ہے۔ اول و آخر کی بحث ایک ایسی نکتہ آفرینی ہے جو جھنڈے نگر مدرسہ میں تو کار آمد ہو سکتی ہے اور جگہ نہیں۔

افضلیت سید المرسلین:

جب سے دنیا عالم وجود میں آئی ایسی کوئی نظیر علاوہ رسول عربی ﷺ کے پیش نہیں کی جا سکتی کہ کوئی شخص دنیا میں آنے سے پہلے بھی احساس و ادراک کی اس بلندی پر ہو جس کا دسواں حصہ بھی دوسروں کو دنیا میں آنے کے بعد نہ ملے۔ اور دنیا میں آنے کے بعد بھی بہت سے انسانی خواص اور لوازم سے پاک و صاف ہو اور جب دنیا سے تشریف لے جائے جب بھی اس شان بے مثالی کے ساتھ کہ ماضی و مستقبل کوئی بھی اس کا حریف نہ بن سکے۔ لیکن سرکار دو عالم ﷺ کی ذات والا صفات میں یہ تمام محامد بیک وقت جمع ہیں۔

رسول عربی دنیا میں آنے سے پہلے:

امام احمد، بیہقی، ابونعیم، ترمذی نے روایت کی اور حاکم نے صحیح کہا، لفظ ترمذی کے ہیں:

"أنهم قالوا: متى وجبت لك النبوة؟ يا رسول الله! قال: وآدم بين الروح والجسد. (الجامع للترمذي: كتاب المناقب، ۳۶۲۹)

صحابہ نے عرض کیا: سرکار آپ کو منصب نبوت کب دیا گیا؟ آپ نے فرمایا: اس وقت جب کہ حضرت آدم علیہ السلام پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

امام تقی الدین سبکی فرماتے ہیں: کہ حضور اپنی نبوت اس وقت بیان کرتے ہیں جب حضرت آدم علیہ السلام کا وجود بھی نہ تھا۔ آدم علیہ السلام سے پہلے نبی ہونے کے اگر صرف یہ معنی ہوں کہ اس وقت علم الٰہی میں آپ کی نبوت طے تھی، کہ آئندہ چل کر آپ نبی ہوں گے تو اس میں حضور کی کون سی مدح نکلتی ہے، اور اس تخصیص کے کیا معنی کہ آدم کا پتلا جب بن رہا تھا اس وقت بھی میں نبی تھا، علم الٰہی میں تو ہر ہر نبی کی نبوت ازل سے طے شدہ ہے، اسی لیے یہ ضروری ہے کہ حدیث کے معنی یہ ہوں کہ حقیقت محمدیہ ﷺ کو نبوت کا منصب جلیلہ اسی وقت سپرد کر دیا گیا

تھا۔اور آپ اسی وقت سے اس مرتبہ پر فائز تھے۔البتہ مادی دنیا میں اس کا ظہور چالیس سال کی عمر میں ہوا۔

آپ کا وجود گرامی دنیا میں:

"نام رسول الله ﷺ في دار أنس، فجاءت أمه ومعها قارورة تجمع فيها عرقه، فسألها النبي ﷺ عن ذلك فقالت: نجعله في طيبنا يا رسول الله! وهو أطيب الطيب. متفق عليه. (الصحيح لمسلم: كتاب الفضائل، ۲/۲۵۷)

حضور جان نور ﷺ ایک دفعہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر سو گئے، حضرت انس کی ماں ایک شیشی لائیں، اس میں پسینہ جمع کرنے لگیں، حضور نے پوچھا کیا کر رہی ہو، عرض کی ہم اسے اپنے عطر میں ملائیں گے اور یہ تو ہماری بہترین خوشبو ہے۔

"أخرج حكيم الترمذي عن ذكوان أن رسول الله ﷺ ولم يكن يرىٰ له ظل، لا في الشمس، ولا في القمر". (الخصائص الكبرىٰ: ۱/۶۸)

حکیم ترمذی حضرت ذکوان سے روایت کرتے ہیں کہ سرکار مدینہ ﷺ کا سایہ نہ تو چاندنی میں نظر آتا تھا نہ دھوپ میں۔

سیدنا عبداللہ بن مبارک، حافظ علامہ محدث ابن جوزی رحمہم اللہ تعالیٰ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

"لم يكن لرسول الله ظل، وكذا في المدارك عن عثمان".

حضور کا سایہ نہ تھا۔ایسا ہی مدارک میں حضرت عثمان سے مروی ہے۔

پردہ فرمانے کے بعد:

ابوداؤد، ابن ماجہ نے روایت کی اوس ابن اوس رضی اللہ عنہ سے:

"قال رسول الله ﷺ: إن من أفضل أيامكم يوم الجمعة، فأكثروا عليّ من الصلاة فيه، فإن صلاتكم معروضة عليّ قالوا: يا رسول الله! كيف تعرض صلاتنا عليك وقد أرمت، قال: يقولون بليت، قال: إن الله حرم على الأرض أجساد الأنبياء. (السنن لأبي داؤد: ابواب الجمعة ۱/۱۵۰)

رسول عربی ﷺ نے فرمایا: تمہارا بہترین دن جمعہ ہے، اس دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجو، کہ تمہارا درود وسلام میری خدمت میں پیش کیا جاتا ہے، عرض کی حضور ایسا کیسے ہوسکتا ہے، آپ تو ریزہ ریزہ ہو چکے ہوں گے، حضور ﷺ نے فرمایا: خدائے حی وقیوم نے انبیا کے جسم کو زمین پر حرام فرمادیا ہے۔

ابن ماجہ کی روایت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے:

((إن الله حرم على الأرض أن تأكل أجساد الأنبياء ، فنبي الله حيّ يرزق.)) (السنن لابن ماجة: باب فضل الجمعة ۱/۷۷)

اللہ تعالیٰ نے انبیا کا جسم زمین پر حرام فرمادیا ہے، پس اللہ کے نبی زندہ ہیں اور ان کو رزق دیا جاتا ہے۔

بزار اور ابن عدی نے روایت کی اور بیہقی نے صحیح کہا:

((الأنبياء أحياء في قبورهم يصلون.))

(كنز العمال للمتقي: ۳۲۲۳-۱۱/۴۷۵)

انبیائے کرام زندہ ہیں اپنی اپنی قبروں کے اندر نماز پڑھتے ہیں۔

پھر دوسری روایت ہے:

((إن الأنبياء لا يتركون في قبورهم بعد أربعين ليلة، ولكن يصلون بين يدي الله حتى ينفخ في الصور.))

(كنز العمال للمتقي: ۳۲۲۲۷-۱۱/۲۱۵)

انبیا اپنی قبروں میں چالیس دن کے بعد نہیں چھوڑے جاتے، مگر یہ کہ اپنے رب کے حضور تا قیامت نماز پڑھیں۔

تنویر:

مذکورہ بالا احادیث ہیں ابن ماجہ کی روایت ((فنبي الله حي يرزق)) اور بیہقی کی روایت ((الأنبياء أحياء في قبورهم)) تو رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ پر عبارت النص ہے، اور ابوداؤد کی روایت جس کے شواہد بکثرت موجود ہیں۔ حیات نبوی پر التزاماً دلالت کرتی ہے، کیوں کہ حضور نے درود بھیجنے کو کہا۔ اس پر صحابہ کے فہم میں یہ بات نہ آئی کہ حضور وفات کے

بعد کیسے سلام قبول فرمائیں گے؟ حالاں کہ آپ کا جسد اطہر ریزہ ریزہ ہو گیا ہوگا اور روح خدا معلوم کہاں ہوگی، اس پر ارشاد ہوا کہ تم عام لوگوں کی طرح ہماری موت نہ سمجھو۔ روح تو خیر سب کی محفوظ رہتی ہے۔ ہمارا جسم بھی زمین کی دسترس سے محفوظ ہے۔ ہم کو پردہ فرمانے کے بعد ایسا ہی سمجھو جیسا کہ اس حیات میں۔

انبیا کو بھی اجل آنی ہے — مگر ایسی کہ فقط آنی ہے
پھر اسی آن کے بعد ان کی حیات — مثل سابق وہی جسمانی ہے

چوتھی حدیث جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انبیا اپنے مزارات مقدسہ میں چالیس دن کے بعد نہیں رہتے، اور اپنے رب کے حضور نماز پڑھتے ہیں، قبر میں نہ رہنے کے یہ معنی سمجھنا کہ آپ مردہ ہیں، معاذ اللہ وہی خیال کرے گا جو سری اور پاگل ہو۔ اور جس کا دماغ اس حد تک چل گیا ہو کہ سیدھی بات سمجھ میں آ ہی نہ سکے۔

ورنہ اس حدیث سے انبیا علیہم السلام کی موت کسی طرح ثابت نہیں ہوئی۔[۱]

....

[۱] افاضل رحمانی نے حتی الامکان حضور سید عالم ﷺ کو مردہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے، اور حیات انبیا پر پردہ ڈال کر نصوص کے مقابلہ میں بیہقی کی وہ حدیث (جس پر خود بیہقی نے تنقید کی اور بر تقدیر صحت تاویل کی) پیش کی ہے، اور لکھ دیا: **اذا تعارضا تساقطا**. اور اس **فاقد البصر والبصيرة** کو خود اپنی مستند کتاب نور الانوار کا یہ قاعدہ نظر نہ پڑا کہ ''**المعارضة تقابل الحجتين على السواء لامزية لأحدهما**'' تعارض دو دلیلوں کا ایسا مقابلہ ہے جس میں کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہ ہو۔ اور یہاں صاف جرح موجود ہے۔

''**فيه شيء من سوء الحفظ.**'' ان کا حافظہ کسی قدر کمزور ہے۔

حیرت ہے کہ: ((**لايتركون في قبور**)) کو ((**أحياء في قبورهم**)) کے معارض قرار دے رہا ہے حالاں کہ عدم ترک عدم حیات کو قطعاً مستلزم نہیں، پھر لطف یہ ہے کہ حدیث ((**لا يتركون في قبورهم**)) خود ہمارے مخالف کے عقیدے پر صحیح نہیں ''ملاحظہ ہو تردید حاضر وناظر'' اس کے خلاف ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ حضور ﷺ روضۂ اطہر میں پوری راحت، ابدی مسرت، بے انتہا سرور کے ساتھ سب سے بڑے درجے، سب سے زیادہ قرب خدا میں آرام فرما ہیں۔

تاہم یہ بات بھی کہ انبیا اپنے مراقد میں جلوہ فرما نہ ہوں تصریحات اسلام کے بالکل

....

صفحہ ۲۷ پر ہے: اور مزار شریف میں آپ کا رونق افروز رہنا عقلاً نقلاً درست ہے۔ باوجود یہ عقیدہ رکھنے کے بڑی جی داری کے ساتھ اس کو ((أحياء في قبورهم)) کے معارضے میں پیش کرر ہے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان گم کردگان راہ کے پاس سوائے حضور کی عداوت کے مذہب کا کوئی واضح تصور نہیں۔ جہاں یہ ثابت کرنا تھا کہ حضور کہیں بھی تشریف نہیں لے جاسکتے وہاں یہ عقیدہ بتادیا کہ اپنی قبر ہی میں رہتے ہیں۔ اور جہاں حیات انبیا کا انکار مقصود تھا وہاں ایک ضعیف حدیث کا مطلب یہ گڑھ لیا کہ زندہ رہنا تو بڑی بات، آپ قبر میں بھی نہیں رہتے۔ اور حدیث کے نقل کرنے میں یہ خیانت برتی کہ پوری حدیث بھی نقل نہ کی بلکہ صرف ((إن الأنبياء لا يتركون في قبورهم بعد أربعين ليلة)) تک ہی نقل کیا۔

بات ایک اور سیکڑوں اس کے جواب

ہم سے کچھ غیروں سے کچھ درباں سے کچھ

اس کے بعد علمانے حیات شہدا سے جو استشہاد کیا ہے اس پر فرماتے ہیں کہ عالم برزخ کا معاملہ قیاسی نہیں کہ حضور کی حیات شہدا کی حیات پر قیاس کر کے ثابت کی جائے ،حضور کے لیے تصریح کے ساتھ: ﴿إنک میت﴾ وارد ہوا ہے، اور شہدا کے لیے ﴿بل أحياء عند ربهم يرزقون﴾ یوں ہی آپ کے نائب کا مقرر کیا جانا، آپ کا قبر میں موجود ہونا۔ آپ کی موت پر دلیل ہے۔

اس اندھی اور مجنونانہ بڑ کا بہت ہی معقول جواب مولانا عتیق الرحمٰن صاحب دے چکے ہیں کہ اگر یہ امور حضور کی موت پر دلیل ہیں تو کیا شہدا کی قبر نہیں بنائی گئی۔ غزوۂ موتہ میں حضور کے مقرر کردہ قائدوں کے بعد حضرت خالد ان کی جگہ مقرر کیے گئے، اور پھر کیا خیال ہے آپ کا اس بارے میں کہ حضور نے خود اپنی حیات پاک میں بارہا متعدد صحابہ کرام کو اپنا جانشین بنایا۔ کیا ''معاذ اللہ'' اتنی دیر کے لیے حضور مر گئے تھے۔ اگر یہ معارضہ معقول تھا تو صاف اقرار کرنا چاہیے تھا ''لیکن، فاضل رحمانی'' اس کو بالکل ہضم کر گئے اور نہ منہ سے پھوٹتے ہیں۔ نہ سر

خلاف ہے، اس لیے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اس پر تنقید کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

....

سے کھیلتے ہیں۔

کیوں نہیں بولتے سحر کے طیور کیا شفق نے کھلا دیا سیندور

عداوت مصطفیٰ کی حد ہو گئی

جب حیات مصطفیٰ ﷺ کا ذکر آتا ہے تو اس ''شپرہ چشم'' کو

﴿إنک میت﴾[الزمر: ۳۰] سوجھتا ہے۔

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾[الأنبياء: س ۲۱۔ت ۳۵]

کا قاعدہ کلیہ یاد آتا ہے۔

لیکن حیات شہدا کے وقت:

﴿إنهم ميتون﴾[الزمر: ۳۰]

نہیں سوجھتا، یاد کیا ہوا قاعدہ کلیہ بھول جاتا ہے۔ تاکہ حضور ﷺ کو مردہ ثابت کیا جاسکے، ورنہ ان آیتوں سے جس طرح حضور ﷺ کو مردہ ثابت کیا جاسکتا ہے، اسی طرح شہدا کو (خاک بدہن گستاخ)

رہ گئی آیت: ﴿بل أحياء﴾ تو آپ کی اندھی عقل کی بنا پر ان آیتوں کے معارض اور اذا تعارضا تساقطا۔ دیکھا عداوت مصطفیٰ کا خمار، تمہارا اسماعیل شہید بھی مردہ ہو گیا۔

وہابی گرچہ اخفا می کند بغض نبی لیکن نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

یوں ہی حیات شہدا حیات برزخی کے بلند انعامات سے ہے، تو کیا انبیا ان انعامات سے محروم کردیے گئے جو امتیوں کو حاصل ہیں، یہاں تک کہ انبیا کی برزخی زندگی بھی امتیوں سے پست کی کہ انبیا تو مردہ اور شہدا زندہ۔ حیرت ہے کہ فاضل رحمانی ہم کو ایسی بات سمجھاتے ہیں جو ایک بے وقوف نہیں کہہ سکتا۔

آپ کو حیات انبیا کے مسئلہ میں جان نظر نہیں آتی، کیوں کہ دین وایمان کے ساتھ آپ کی عقل کا بھی دیوالیہ نکل گیا ہے۔ ورنہ آپ کو خود اقرار ہے کہ دلیل صرف چار ہیں۔ قرآن۔ حدیث۔ اجماع۔ قیاس شرعی (تردید حاضر وناظر ص ۳۹) یعنی اجماع کو آپ کہ

اس روایت میں جو محمد بن عبد الرحمٰن ہیں ان کا حافظہ کمزور ہے۔اور برتقدیر صحت حدیث کا مطلب یہ ہے:"لا یترکون لا یصلون إلا هذا المقدار".

یعنی صرف چالیس روز ہی ان کو اجازت ہوتی ہے کہ چاہیں تو نماز پڑھیں، اس کے بعد لذت وسرور کے لیے نماز پڑھنے کا حکم ہوتا ہے۔اس طرح یہ حدیث احیاء فی قبورھم کے معارض نہیں ہوسکتی۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی دنیا کی طرح وہاں بھی نماز پڑھتے ہیں۔

خلاصہ:

ان حدیثوں سے یہ امر بخوبی روشن ہوگیا کہ سرکار دوعالم ﷺ کا بارگاہ الٰہی میں وہ بلند مقام ہے جس کے اوج عزت تک صنف انسانی کا کوئی فرد نہ پہونچ سکا۔وہ اسی بلند مقام پر اس وقت بھی نظر آتے ہیں جب آدم علیہ السلام کا خمیر تیار ہورہا تھا۔اور وہ منصب نبوت پر اس وقت بھی فائز نظر آتے ہیں جب ساری انسانیت حیات ووجود کی انگڑائی لینے کے لیے آمادہ ہورہی تھی۔

پھر جب وہ نور الٰہی لباس بشریت اوڑھ کر اس خاکدان عالم میں تشریف لایا تو اس خیال سے کہ کہیں کوتاہ اندیش:

....

دلیل شرعی مانتے ہیں،اور حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: باچندیں اختلاف وکثرت مذاہب کہ در علمائے امت است، یک کس را دریں مسئلہ خلافے نیست کہ آں حضرت ﷺ بہ حقیقت حیات بے شائبہ مجاز وتوہم تاویل دوائم وباقی اند (اقرب السبل وفتوح الغیب ص ۳۳۳) بندہ پرور اس صریح اجماع کے ہوتے ہوئے بھی آپ کو اس مسئلہ میں جان نظر نہیں آتی۔ کتنی پر لطف ہٹ دھرمی ہے یہ آپ کی؟ آپ نے اس اجماع کا جواب دینے کا وعدہ بھی فرمایا تھا لیکن آپ کا یہ وعدہ وعدۂ فردا بن کر رہ گیا۔آپ نے اس اجماع کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ہم کو بھی اعتبار نہ تھا۔

تیرے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان چھوٹ جانا
کہ خوشی سے مرنہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

حاشیہ ختم

﴿مَا هٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا﴾ [المؤمنون: س ۲۳۔ ت ۳۳]،

﴿مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْأَسْوَاقِ﴾

[الفرقان: س ۲۵۔ ت ۷]

کہہ کر اس کو اپنا بھائی بنا کر اس کے دامن عزت میں بٹہ لگانے کی مکروہ کوشش نہ کریں۔ قدرت نے کچھ ایسی خصوصیات بھی مرحمت فرمائیں کہ معمولی انسان بھی اس کے علو مرتبت کا فیصلہ کر سکے۔ اس طرح خدا کی دین سے وہ بے مثال تھا، بے مثال آیا، بے مثال رہا، اور جب اس دنیا سے تشریف لے گیا جب بھی بے مثال ہے، کہ اپنے جسم اور روح کے ساتھ علم برزخ میں انعامات الٰہی کے مزے لے رہا ہے۔

پھر وہ ذات گرامی جس کو قدرت نے اتنا نوازا کہ وہ ہر بات جو ہمارے لیے غیر ممکن ہو، اس کے لیے ممکن بن جائے، اس کے لیے ہم اگر کوئی ایسا دعویٰ کریں جو اصول شرعی کے خلاف نہ ہو اور شایان شان مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہو تو کیا صرف اس وجہ سے کہ وہ ہماری کمزور عقل کے نزدیک مستبعد ہے، اس کا انکار کر سکتے ہیں؟ اس کی کون سی بات تمہاری سمجھ میں آسکتی ہے، تم دیکھتے نہیں کہ وہ محبوب کبریا علیہ التحیۃ والثناء امی ہونے کے باوجود جب بولتا ہے تو ایسا بولتا ہے کہ سارا عالم اس کے آگے خاموش ہو جاتا ہے۔

امی و گویا بہ زبان فصیح از الف آدم و سیم مسیح

امی و دقیقہ دان عالم بے سایہ و سائبان عالم

اور نہ صرف خود بولتا ہے، بلکہ بے زبانوں کو متکلم، بے جانوں کو صاحب حیات، محکوموں کو فرماں روائے عالم اور صاحب رموز و اسرار بناتا چلا جاتا ہے، اور پھر اس معجزانہ انداز میں کہ اہل عالم آج بھی متحیر و پریشان ہیں کہ کیوں ہوا۔ اور کیوں کر ہوا۔

اس لیے اس کی ذات گرامی کی طرف اگر کوئی منصب رفیع منسوب ہے تو صرف اس وجہ سے ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے، کہ وہ ہماری ناقص عقل میں مستبعد ہے۔ یا عام انسانوں کے لیے اس کا ثبوت نہیں ہے، ہاں یہ ضرور دیکھا جائے گا کہ شرعی اصول کے معارض تو نہیں؟ اور اس سراپا اعجاز ذات کی خصوصیات سے بحث کرتے وقت یہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی بلند مقامی میں ہر انسان سے بلند ہے، اس لیے اس کی جانچ کا پیمانہ عام انسانوں سے بلند ہونا

چاہیے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب:

یہیں سے ''فاضل رحمانی'' کے ان تمام مزخرفات کا جواب بھی ہو گیا، جو انہوں نے ''مسئلہ حاضر و ناظر'' پر عقلی گرفت وغیرہ کے عنوان سے کیے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ اگر حضور تمام مرنے والوں کی قبر میں موجود ہیں تو دو خرابیاں لازم آتی ہیں۔ اول: یہ کہ آپ ایک سکنڈ بھی روضۂ اطہر میں آرام نہ فرمائیں۔ جس سے آپ کو تنگی میں چھوڑنا لازم آتا ہے۔ کیوں کہ کوئی ذمہ دار مسلسل دورے میں نہیں رہ سکتا۔ دوم یہ کہ حضور کی زندگی میں بھی لاتعداد مردے دفن کیے گئے تو لازم آئے گا کہ معاذ اللہ آپ زندہ درگور ہیں۔

فاضل رحمانی کی اس سادہ لوحی پر یہ خیال ہوتا ہے کہ آپ فاضل ہیں تو ضرور، لیکن فضیلت سے نہیں بلکہ فضلہ سے۔ ورنہ اتنی سی بات ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہے۔ کہ بات کسی ڈپٹی کلکٹر کی نہیں اس ذات کی ہے کو سر تا پا معجزہ ہے۔ ورنہ اس نامعقول دلیل اور ناجائز خیر خواہی سے حضور کی ہر ایک فضیلت کا انکار کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ حضور ﷺ کے متعلق اس خبر کو بھی کہ آپ رات رات بھر عبادت کرتے تھے حتیٰ کہ پائے مبارک ورم کر جاتے تھے، اور شق ہو جایا کرتے تھے، یہی کہہ کر رد کیا جا سکتا ہے، کہ حضور ضیق اور تنگی میں پڑیں اور جو کوئی اس حدیث کو پڑھ کر حضور کی فضیلت ثابت کرے۔ وہی شعر پڑھ کر اس کا جواب دے دے کہ:۔

بلا سے ان کی ادا کوئی بدگماں ہو جائے کسی طرح سے تو مٹ جائے ولولہ دل کا

''فاضل رحمانی'' ایجاد و تحقیق کی ایسی نئی راہیں اکثر نکالتے رہتے ہیں جو نہ تو ان کے کسی بڑے نے نکالیں نہ چھوٹے نے، ان کی بات ہی اور ہے۔

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا پر ترے عہد سے پہلے تو یہ دستور نہ تھا

اور اگر اس ضیق اور تنگی کا مطلب یہ ہے کہ ایک شی کا بیک وقت چند جگہ ہونا عقلاً ناممکن ہے، جب بھی مقام مصطفیٰ ﷺ سے سخت بے خبری ہے، کیوں کہ تمہاری عقل کب باور کرتی ہے کہ پسینہ عطر سے زیادہ خوش بودار ہو، لیکن یہ حقیقت بہت روشن ہے کہ لوگ آپ کے پسینہ سے عطر بساتے تھے، پھر جس طرح عقل کے باور نہ کرنے کے باوجود تم کو یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑتی ہے، یہاں کیوں عقلی پکچر گاتے ہو۔ علاوہ ازیں ہم نے یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ جب حضور ﷺ

عام قبروں میں جلوہ فرما ہوتے ہیں، اس وقت روضۂ انور یا کسی اور جگہ نہ ہوں، بس یوں سمجھو کہ سرکار ابد قرار ﷺ کے لیے ان کے قادر و توانا خدا نے مسافت زمان و مکان ہیچ کر دیا ہے، اور قدرت جب کسی کو اپنے حبیب کا دیدار کرانا چاہتی ہے تو دنیائے ہست و بود کے مادی حجابات اٹھا دیتی ہے، وہ شخص اپنے پاس ہی حضور کو موجود پاتا ہے۔

در راہ عشق مرحلۂ قرب و بعد نیست
می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

معنی حاضر و ناظر کا شرعی وقوع: یہ اصول طے ہو جانے کے بعد کہ فضائل محمد رسول اللہ ﷺ میں بجائے عقلی دخل دینے کے یہ دیکھا جائے گا کہ شرعی اصول بھی اسے جائز رکھتا ہے یا نہیں، یہ ضروری ہو گیا ہے کہ یہ دیکھا جائے مسئلہ "حاضر و ناظر" کا بھی شرعی امکان ہے یا نہیں؟ (معنی کی تشریح آگے آ رہی ہے) تو نہ صرف امکان بلکہ وقوع کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ ملک الموت علیہ السلام ہر مرنے والے کے پاس جاتے ہیں۔

قرآن شریف میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿قل یتوفکم ملک الموت الذي و کل بکم﴾[1]

تم کو ملک الموت وفات دیتے ہیں جو تم پر مقرر کیے گئے۔

....

(۱) فاضل رحمانی کا خیال ہے کہ ملک الموت ہر ہر مردے کے پاس نہیں جاتے ہیں۔ یہ بھی ان کے پاگل دماغ کی اُپج ہے؛ کیوں کہ ان کا مستدل قرآن کی آیت ﴿والنازعات غرقاً﴾ ہے، اس میں نازعات جمع ہے۔ اس لیے ثابت ہوا کہ جان نکالنے والے کئی ایک ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ کہیں ملک الموت خود چلے جاتے ہوں گے، اور کہیں کسی مددگار کو بھیج دیتے ہوں گے، اس طرح ان کا کام رات دن چلتا رہتا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس کے پاس علم و یقین کی دولت نہ ہو وہ اسی طرح ظن و تخمین کی وادی میں بھٹکتا پھرے گا۔ اس سلسلہ میں عطر تحقیق یہ ہے کہ قرآن میں قبض ارواح سے متعلق تین آیتیں ہیں:

﴿قُلْ یَتَوَفّٰکُم مَّلَکُ الْمَوْتِ﴾ [السجدة: س ۳۲۔ ت ۱۱]

براء ابن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

"قال رسول الله ﷺ: إذا كان العبد المؤمن في انقطاع من الدنيا وإقبال من الأخرة، نزل عليه الملائكة من السماء بيض الوجوه، كأن وجوههم الشمس، معهم كفن من أكفان الجنة، حتى يجلسونه مدالبصر، ثم يجيء ملك الموت ـ عليه السلام ـ حتى يجلس عند رأسه، فيقول: أيهاالنفس المطمئنة! أخرجي، وكذا في الكافر، إلا أنه قال: سود الوجوه، معهم المسوم بدل بيض الوجوه، وأكفان الجنة والنفس الخبيثة بدل الطيبة."

[مشکوٰۃ شریف ص:١٤٢]

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: جب بندہ مومن اس دار فانی سے کوچ کرتا ہے اور

....

﴿توَفَّتْهُ رُسُلُنَا﴾[الأنعام: س ٦ـ ت ٦١]

﴿الله يتوفي الأنفس[الزمر: س ٣٩ـ ت ٤٢]﴾

جن میں باہم تطبیق یہ ہے کہ اللہ حکم دینے والا فاعل حقیقی ہے، ملک الموت مرنے والے کو مخاطب کر کے کہتے ہیں: أخرج أيها النفس. (اے جان نکل) دیگر اعوان ومددگار روح کو ہاتھوں ہاتھ اس کے مقام تک لے جاتے ہیں۔ یار و مددگار سارے جسم سے روح کھینچ کر حلقوم کے پاس کر دیتے ہیں اور ملک الموت قبض کر لیتے ہیں۔ یہ مضمون مدارک التنزیل، شرح اسرار قبور، مشارق الانوار میں ہے۔ اور ایسا ہی مشکاۃ شریف کی اس طویل حدیث میں ہے جو براء ابن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، جس سے پتہ چلا کہ ہر ہر مردے کی قبض روح میں خدا، ملک الموت اور اعوان سب کو دخل ہے، کوئی امر، کوئی مامور، کوئی مددگار، لیکن بے ایمانی اور جہالت کا برا ہو کہ فاضل رحمانی انہیں کا سہارا لے کر وہ سب کچھ بک جاتے ہیں جو ایک مسلمان کو نہ کہنا چاہیے۔ فاضل رحمانی کے ترنگ کا کیا کہنا ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

حاشیہ ختم

دار آخرت کی طرف رخ کرنے کو ہوتا ہے، تو آسمان سے فرشتے نورانی صورت والے اپنے ساتھ جنت کا کفن لیے آتے ہیں اور حد نظر تک بیٹھ جاتے ہیں اور اس کے سر کے پاس بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں: اے نفس مطمئنہ! اپنے بدن خاکی سے نکل۔ کافروں کے بارے میں بھی ایسا ہی فرمایا، صرف یہ الفاظ بدلے ہوئے تھے: ”سود الوجوه، معهم المسوم، النفس الخبيثة.

منکر نکیر بھی ہر ہر مردے کے پاس جاتے ہیں:

”عن أنس قال: قال رسول الله ﷺ: إن العبد إذا وضع في قبره وتولىٰ عنه أصحابه أنه يسمع قرع نعالهم، أتاه ملكان فيُقعدانه، وكذا عن أبي هريرة.“ [مشکوٰۃ شریف ص:۲۴]

حضرت انس سرور عالم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جب لوگ مردے کو قبر میں رکھ کر واپس لوٹتے ہیں تو مردہ لوگوں کے پیروں کی چاپ سنتا ہے۔ اور اس کے پاس دو فرشتے آ کر اسے بٹھاتے ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ ملک الموت اور منکر نکیر ہر ہر مردے کے پاس جاتے ہیں۔ اور ساری دنیا میں بیک وقت کتنی روحیں قبض کی جاتی ہیں، اسی لیے ملک الموت اور منکر نکیر کا بیک وقت چند جگہ ہونا ثابت ہوا۔ اور جب شریعت میں غیر خدا کے لیے اس معنیٰ کا ثبوت ہوا تو پھر حضور کے ساتھ اس کی نسبت کرنے میں کیا قباحت لازم آئے گی۔ جس طرح اور بہت سے ناممکنات حضور کے لیے ممکن بنا دیے گیے، یہ بھی سہی۔ بشرطے کہ قرآن وحدیث کی عبارت سے اس کا ثبوت ہوتا ہو۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کسی مخالف کے اس ہذیان کے جواب میں کہ حضور کو ”حاضر وناظر“ ماننا شرک ہے، یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا ثبوت ملک الموت کے لیے ہے، منکر نکیر بیک وقت کتنی کتنی قبروں میں حاضر ہوتے ہیں، یا شیطان بھی ایک ہی وقت میں مختلف ممالک کے بے شمار لوگوں کو گمراہ کرتا رہتا ہے۔ یا براہ راست کوئی ایسی دلیل دی جا سکتی ہے جس سے ہمارے مدعا سے کم ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً ہم سارے ملک میں آپ کے حضور کے قائل اور دلیل

سے صرف زمین کا حضور ثابت ہوتا ہے تو مخالفین جامے سے باہر ہو کر جواب دیتے ہیں ''دعوے عام دلیل خاص'' اس لیے یہ استدلال پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ لیکن ان رٹو کے ٹٹوؤں کو کون بتائے کہ کوئی قاعدہ یاد کر لینا اور بات ہے، اور اس کا سلیقہ سے برتنا اور بات ہے، دریں چہ شک تو ایک طوطی بھی یاد کر لیتی ہے، لیکن اسے اس سے کیا فائدہ۔؟ اسی طرح مخالفین نے بھی کہیں سے دعویٰ عام دلیل خاص کیا سن لیا ہے کہ ہلدی کی گانٹھ پالی ہے اور اب پنساری بنے گھوم رہے ہیں۔ ورنہ جہالت کا خمار نہ ہو تو یہ بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے، کہ مسئلہ ''حاضر و ناظر'' کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ فی نفسہ ایک چیز بیک وقت چند جگہ ہو سکتی ہے یا نہیں۔ دوسرا اگر یہ تعدد ممکن ہے تو اس کی مقدار اور حد کیا۔ اور حضور ﷺ کے لیے اس کا ثبوت کتنا ہے؟ اس قسم کے تمام دلائل و نظائر سے مثبتین کو یہی ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے کہ یہ تعدد فی نفسہ جائز ہے، اور جب ایک چیز کا بیک وقت دو جگہ ہونا ممکن ہے تو دو چار، دس بیس بلکہ ہزار جگہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس کا ثبوت تو طلب کیا جا سکتا ہے کہ اس تعدد کی انتہا کیا ہے، لیکن اس میں بحث کی قطعاً گنجائش نہیں، کہ یہ عقلاً ممکن ہے یا نہیں جب کہ شریعت میں غیر خدا کے لیے اس کا وقوع ثابت ہے، چہ جائے کہ اس کو شرک بتایا جائے۔

اس لیے ''حاضر و ناظر'' ہونے کے ثبوت میں اگر کوئی حدیث پیش کی جائے تو اس کو اپنے ظاہری معنی سے محض اس لیے نہیں پھیرا جا سکتا، کہ ہماری عقل میں نہیں آ رہا ہے۔

پوری بحث ایک نظر میں:

گزشتہ اوراق سے بحث کی پوری پوزیشن واضح ہو گئی کہ رسول اللہ ﷺ جن کو خدائے ذوالجلال نے ہمیشہ نوازا، اگر خداوند قدوس ان کو بیک وقت متعدد جگہ حاضر کر دے، اور کائنات ان کی نگاہ حقیقت بیں پر روشن فرما دے، تو نہ خالق اس سے عاجز، نہ اس کا محبوب اس منصب رفیع کا نااہل۔ پھر اس سے نہ تو خدا کی خدائی میں کچھ کمی لازم آتی ہے، نہ ایسا مان لینے سے حقوق الٰہی میں ہی دست اندازی ہوتی ہے کہ شرک کی طرف رہنمائی کرے، کیوں کہ بیک وقت چند جگہ حاضر ہونا اور بہت ساری جگہوں کا پیش نظر رکھنا، ملک الموت کے فرائض منصبی میں سے ہے، جس کو وہ رات دن بجالاتے ہیں، پھر رسول کے لیے اس کا ثبوت کیوں کر شرک ہو سکتا ہے۔

ہاں اس شرعی امکان کے بعد یہ ذمہ داری ضرور ہمارے سر ہے کہ ہم دلائل سے بھی یہ

بات ثابت کردیں کہ حضور ''حاضر وناظر'' ہیں اور یہ بھی بتائیں کہ یہ حضور اپنے کیف وکم میں کیسا ہے، جس سے عہدہ برا ہونے کی کوشش ہم آیندہ صفحات میں کریں گے۔ لیکن یہ یادرہے کہ یہ مسئلہ عقائد سے ہرگز نہیں کہ اس کے لیے دلیل قطعی کی ضرورت ہو، بلکہ باب فضائل محمد رسول اللہ سے ہے، اس لیے اس کا ثبوت اخبار آحاد یا متعدد احتمال رکھنے والی آیتوں سے بھی ہوسکتا ہے۔

معنی حاضر وناظر:

حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے ان الفاظ میں معنی ''حاضر وناظر'' کو بیان کیا ہے:
عالم میں حاضر وناظر کے شرعی معنی یہ ہیں: کہ

(۱) قوت قدسیہ والا ایک ہی جگہ رہ کر تمامی عالم کو اپنے کفِ دست کی طرح دیکھتا ہے اور دور وقریب کی آواز سنتا ہے۔

(۲) یا ایک آن میں تمام عالم کی سیر کرتا ہے اور صدہا کوس پر حاجت مندوں کی حاجت روائی کرتا ہے، یہ رفتار خواہ صرف روحانی ہو یا جسم مثالی کے ساتھ۔ یا اس جسم کے ساتھ جو قبر میں مدفون ہے، یا کسی جگہ موجود ہے۔ (خیر الانبیاء:۸)

اس عبارت کے دو جز ہیں:

(۱) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک جگہ رونق افروز ہیں، اور خالق دو عالم نے جس طرح بارہا آپ کے لیے عالم ہست وبود کے حدود وتعینات، مسافت زمان ومکان کو پارہ پارہ کردیا ہے، یوں ہی عالم مادیات اور ملاءِ اعلیٰ حجابات کو اس نے جب جب چاہا اٹھاتا رہا۔ یہاں تک کہ نگہ عالم سے نہاں ہونے کے وقت پر انکشاف بھی کامل ہوگیا اور اب یہ حال ہے:

كالشمس في وسط السماء ونورها　　يغشي البلاد مشارقاً ومغارباً
والقمر من حيث التفت رائيته　　يعطيك في عينيك نوراً ثاقباً

آفتاب وماہتاب کی طرح آپ ایک جگہ رونق افروز ہیں، اور سارا عالم آپ کے پیش نظر ہے اور خدا جس کسی کو چاہتا ہے حجابات اٹھا کر اپنے حبیب کی طلعت زیبا دکھا دیتا ہے۔

(۲) یا آپ کبھی کبھی (جیسا کہ لفظ سیر کرنے سے ظاہر ہے) سارے عالم میں بیک وقت کہیں قوت روحانی کے ساتھ، کہیں جسم مثالی کے ساتھ، کہیں جسم اطہر کے ساتھ موجود

ہو جاتے ہیں، اور بے کسوں کی دست گیری فرماتے ہیں، جیسا کہ یہ رفتار خواہ جسم مثالی کے ساتھ، خواہ صرف روحانی، یا اس جسم کے ساتھ جو قبر انور میں موجود ہے، کہ قضیہ مانعۃ الخلو سے ظاہر ہے۔

حاضر ناظر اور علمائے سلف:

اور یہ خیال کوئی نیا نہیں ہے، بلکہ صدیوں پہلے کے علمائے اسلام نے اس کی تشریح وتصریح کر دی ہے، جیسا کہ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے اپنے رسالہ میں شیخ محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ودیگر علماء کے اقوال سے ثابت کیا ہے، کہ کسی حیثیت سے بھی وہ حضرات اس کو بیان فرماتے ہیں، اور اس پر کوئی رد نہیں کرتے بلکہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تو خاص اس مبحث میں ایک کتاب ''تنویر الحلک'' تصنیف فرمائی اور تصریح کی:

''وقد تحصل من هذا النقول والأحاديث أن النبي ﷺ حي بروحه وجسده، وأنه يتصرف حيث شاء في أقطار الأرض، وفي الملكوت، هو بهيئته كان عليها قبل وفاته لم يتبدل منه شيء، وأنه يغيب عن الأبصار كما غيبت الملائكة مع كونهم أحياء بأجسادهم، فإذا أراد الله رفع الحجاب عمن أراد كرامة برويته، وتواترت به الأخبار. (ملخصاً)

ان منقولات اور احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ نبی ﷺ اپنے جسم اور روح کے ساتھ زندہ ہیں، اور آسمان وزمین میں جہاں چاہیں تصرف کرتے ہیں، اور آں حضرت ﷺ اپنی اسی حالت پر ہیں جیسا کہ وفات سے پہلے تھے، اور آپ نگاہوں سے ایسے پوشیدہ ہو گئے ہیں جس طرح ملائکہ، حالاں کہ وہ بھی تو اپنی روح اور جسم کے ساتھ زندہ ہیں۔ پس اللہ جس بندے کو حضور کی رویت سے مشرف فرمانا چاہتا ہے، حجاب اٹھا دیتا ہے، اور خبریں اس بارے میں تواتر تک پہونچ گئی ہیں۔

اور شیخ امام علامہ نورالدین حلبی اپنے رسالہ ''تعريف اهل الاسلام بأن محمدا لا يخلو منه زمان ولا مكان'' میں فرماتے ہیں:

والـذي أراه أن جسده الشريفة لا يخلو منه زمان ولا مكان، ولا محل ولاامـكـان، ولا عرش ولا لوح، ولا كرسي ولا قلم، ولا بر ولا بحر، ولا سهل ولا وعـر، ولا بـرزخ ولا قبـر، كـما أشرنا إليه أيضاً أنه امتلاء الكون الأعلىٰ به كـمـا امتـلاء الـكون الأسفل، وكامتلاء قبره به، فجسده مقيماًفي قبره،وطائفاً حول البيت، وقائماً بين يدى ربه لأداء خدمة."

[جواهر البحار جلد اول ص: ۴۸۳]

میرا (ذاتی) خیال تو یہ ہے کہ حضور کے جسد اطہر سے نہ تو زمان خالی ہے نہ مکان، نہ محل نہ امکان، نہ عرش نہ لوح، نہ کرسی نہ قلم، نہ بحر نہ بر، نہ نرم زمین نہ سخت، نہ برزخ نہ قبر، اس کی طرف ہم اشارہ بھی کر چکے ہیں، نیز آپ نے کائنات کو بھر دیا ہے، اعلیٰ کو بھی، ادنیٰ کو بھی، اور قبر کو بھی، یہی وجہ ہے کہ آپ قبر انور میں بھی رونق افروز نہیں بیت اللہ کا طواف بھی کرتے ہیں اور اپنے رب کے حضور ادائے عبادت کے لیے مصروف ہیں۔

جس سے مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کا مطلب صرف یہ تھا کہ علمائے اسلام میں کوئی حضور کی موجودگی مساجد میں، کوئی اہل اسلام کے گھروں میں، کوئی ذوات مصلین میں، کوئی ساری کائنات میں تصریح کے ساتھ تسلیم کرتا ہے، جس کا مطلب صاف یہی ہوا کہ یہ عقیدہ کوئی نیا نہیں، اور اس کے ماننے والے صرف ہم ہی نہیں، جیسا کہ آج کل غیر مقلدین اڑاتے رہتے ہیں۔ نیز اپنے مخالف سے یہ کہنا تھا کہ جان برادر اپنی کفری اور شرکی مشین کا رخ ذرا بزرگان دین کی طرف بھی کر دو تا کہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ علمائے اسلام کو کافر و مشرک بنانے والے کون ہیں، اور آپ کا پیش کردہ شعر خود آپ کی ہی ترجمانی کرنے لگے۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

ورنہ اپنے نشانہ کو پھر سے درست کیجیے اور ہم کو کہنے دیجیے۔

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دل گیر کو
کیسے تیرانداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

مگر ہمارے فاضل رحمانی یہاں پہونچ کر کچھ ایسا جامے سے باہر ہو گئے ہیں کہ ساری

امت مسلمہ کو۔ تو ام ڈالا۔ کہ ہم پر نہ تو کسی اہل حدیث کا قول حجت ہے نہ آپ کا اور آپ کے بڑوں کا (یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ قاضی عیاض، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، جلال الدین سیوطی اور انہیں جیسے سیکڑوں بزرگ جو دین کا ستون ہیں فاضل رحمانی کے بڑے نہیں صرف ہمارے بڑے ہیں، ہم بھی تو یہی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا مذہب بزرگوں کے دین کے خلاف ہے، اچھا ہوا کہ فاضل رحمانی نے خود اقرار کرلیا۔: ع: مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری) آپ شوق سے ان کے اقوال کو سند مت مانیے مگر اتنا تو تسلیم ہی کریں گے کہ آپ کی مشق ستم کی زد میں نہ صرف ہم بلکہ وہ مقدس نفوس بھی ہیں جن کا نام لے کر بسا اوقات آپ بھی حدیث پڑھتے ہیں اور شاعر کے الفاظ میں:

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی　　　مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

کا عالم ہے۔

اقوال کی بحث:

''فاضل رحمانی'' نے ہر ہر قول کے متعلق خواہ مخواہ کچھ نہ کچھ کہنا فضیلت تصور کیا ہے، اور کچھ نہیں تو صرف یہی کہ دعوے عام اور دلیل خاص، اور کہیں یہ کہ یہ صاحب حاطب اللیل ہیں، اس لیے ان کی بات نامعقول، کہیں صرف اتنی بات سے کام چلایا ہے کہ ہم اس کو نہیں مانتے اور اخیر میں بڑے طمطراق سے چند تردیدی عبارتیں نقل کی ہیں، چوں کہ ہم مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کے پیش کردہ اقوال کے ساتھ فاضل رحمانی کی دسیسہ کاریوں کا راز فاش کرکے کتاب کو طول دینا نہیں چاہتے، کیوں کہ ہم سب ثابت کردیں، جب بھی فاضل رحمانی یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نہیں مانتے، کوئی حدیث لاؤ، اس لیے صرف تردیدی اقوال سے کچھ تعرض کرتے ہیں۔

فاضل رحمانی نے پوری کتاب میں سات عبارتیں تحریر کی ہیں، جن میں کسی میں نکاح کے وقت رسول اور فرشتہ کے گواہ بنانے کو کفر کہا ہے، اور کسی میں عالم غیب اور حاضر و ناظر سمجھنے کو شرک بتایا ہے۔ ان سب عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ غیر خدا کے لیے حاضر و ناظر کا قول یا کفر ہے یا شرک، لیکن برا ہو ہٹ دھرمی کا جس نے فاضل رحمانی کو تلبیس و مکاری کا فن کار بنادیا۔ سب سے پہلی تلبیس تو فاضل رحمانی نے یہ کی ہے کہ حوالہ میں اتنا اجمال رکھا ہے کہ حتی الامکان مخالف صحیح عبارت کا مقابلہ اصلی کتاب سے نہ کرسکے تاکہ فریب مستمر جاری رہے۔

فتاویٰ بزازیہ ہمارے پاس تین جلدوں میں موجود ہے، لیکن اتنی طویل کتاب کے لیے حوالہ میں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ فتاویٰ بزازیہ میں ہے۔ یوں ہی ملا حسین خباز اور ان کی کتاب مفتاح القلوب دونوں غیر معروف ہیں، اسی طرح توشیح اور تحفہ وغیرہ کو مہمل چھوڑ دیا ہے، اور بڑی جی داری سے ان عبارتوں کو ان مشاہیر علمائے اسلام کے مقابلہ میں پیش کیا جن کا نام لے دینا ہی صداقت و دیانت کی ضمانت ہے، بہر حال اولاً آپ نے اقوال اور ان کے حوالہ میں انتہائی چالاکی سے کام لیا ہے، اور اگر تمام عبارتوں اور حوالوں کو صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تب بھی ہم کو مضر نہیں، کیوں کہ ایسے اقوال و فتاویٰ کی تشریحات اور ان کا صحیح محمل علمائے احناف ۔ کثرھم اللہ ۔ نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کردیا ہے، جو فتاویٰ بزازیہ اور قاضی خاں سب پر جاری ہے، یہ آپ کی اندھی نگاہوں کا قصور ہے کہ آپ ہمارے مذہب سے بے خبر ہو کر ہمارے ہی ہتھیاروں سے ہم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، اور اس بے سروسامانی کو ہی اپنا ساز و سامان سمجھتے ہیں۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے اسد   لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار ہی نہیں

علامہ ابن عابدین المعروف بہ شامی ''سل الحسامی الہندی'' ص ۳۱۱ میں فرماتے ہیں:

''ذکر في جامع الفصولين مسئلة في الفارسية: حاصلها لو تزوجها بلا شهود وقال: الله وملائكة أو رسول يشهدان أنه يكفر، لأنه اعتقد أن الرسول والملك يعلم الغيب، ثم أشكل ذلك بما أخبره النبي ﷺ من المغيبات، وكذا ما أخبره به عمر وجماعة من السلف، ثم أجاب بأنه يمكن توفيق بأن المنفي هو العلم بالاستقلال لا العلم بالإعلام.

جامع الفصولین میں ایک مسئلہ فارسی میں ذکر ہوا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی سے بغیر گواہوں کے نکاح کیا اور کہا کہ خدا اور رسول یا فرشتہ گواہ ہیں تو کفر ہو گیا، کیوں کہ اس نے رسول اور فرشتوں کے بارے میں اعتقاد کیا کہ وہ ''غیب'' جانتے ہیں، لیکن اس پر یہ مشکل ہے کہ حضور نے غیب کی خبر دی اور حضرت عمر اور سلف کی ایک جماعت نے بھی، پھر خود ہی اس اشکال کا جواب دیتے ہیں، دونوں میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے جن آیتوں میں علم کی نفی ہے اس کا مطلب بالاستقلال علم ہے اور جس کی خبر انبیا نے دی وہ باعلام الٰہی تھا۔

اس کے صفحہ ۳۱۲ میں فرماتے ہیں:

"وسئل في الفتاویٰ الحدیثیة یکشف له عن اللوح المحفوظ حتی یراہ، یکفي بذلک ما أخبرہ القرآن عن الخضر".

فتاویٰ حدیثیہ میں ہے جس نے کہا کہ مومن دیکھتا ہے، اور لوح محفوظ کو دیکھ لیتا ہے اور اس میں وہی کافی ہے جس کی خبر قرآن نے حضرت خضر علیہ السلام کو دی۔

پہلی عبارت سے پتہ چلا کہ رسول اور فرشتوں کی گواہی میں دو احتمال ہیں:

(۱) رسول و ملک بذات خود جانتے ہیں یا

(۲) باعلام الٰہی۔

اور کفر کا فتویٰ اسی وقت صحیح ہوگا جب علم بذات خود کا عقیدہ رکھا جائے، جس سے معلوم ہوا کہ وہ تمام اقوال اور فتاویٰ جہاں ملک اور رسول کی گواہی یا اعتقاد علم غیب پر کفر کا قول کیا گیا ہے، (خواہ فتاویٰ قاضی خاں، یا بزازیہ، یا مالا بدمنہ، میں ہو یا کسی دوسری جگہ ہو) وہاں یہ دو احتمال نکل سکتے ہیں۔ اور "سل الحسام" کی دوسری عبارت یہ بتاتی ہے جس عبارت میں احتمال ہو وہاں مطلقاً کفر کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا۔ بلکہ تفصیل طلب کی جائے گی اور پوچھا جائے گا کہ وہی کفری معنی مراد ہیں یا نہیں، اگر کفری معنی سے انکار کرے تو تیسری عبارت کی رو سے اس کو ہر گز ہر گز کافر نہیں کہا جائے گا، وہ ساتوں عبارتیں جنہیں فاضل رحمانی نے نقل کی ہیں ان سب میں یہ دو احتمال نکل سکتے ہیں، کہ بعطائے الٰہی یا بذات خود۔ اور علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بیان کے مطابق پہلی شق پر کفر کا فتویٰ صحیح نہیں، اور دوسری شق پر درست اور صحیح لیکن یہ ہم کو قطعاً مضر نہیں کیوں کہ ہم بعطائے الٰہی کے قائل ہیں، اور اگر ان عبارتوں کا مطلب مطلقاً فتویٰ کفر ہے جیسا فاضل رحمانی کا خیال ہے تو یہ علمائے حنفیہ کا فتویٰ نہیں، بلکہ ضعیف قول ہے، جیسا کہ: معدن الحقائق، خزانۃ الروایۃ، وغیرہ اکثر کتب فقہ میں آیا:

"عمن قال: إن المؤمن یعلم الغیب، ھل یکفر ولا یتبین، أو یفصل لجواز العلم بجزئیات الغیب، فأجاب بقوله: لا یطلق تکفیرہ؛ لاحتمال کلامه، ومن تکلم بما یحتمل کفر وغیرہ وجب استفصاله، کما في الروضة وغیرھا.

اس کے بارے میں سوال ہوا کہ یہ کہتا ہے کہ مومن غیب جانتا ہے، آیا کافر ہو گیا۔ یا

اس سے سوال کیا جائے گا کہ تیری مراد اس سے کیا ہے، کیوں کہ بعض غیوب کا علم تو ممکن ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس کو کافر نہیں کہا جائے گا، کیوں کہ اس کے کلام میں احتمال ہے، اور جس نے ایسا کلام کیا جس میں کفر وغیر کفر دونوں کا احتمال ہو تو تفصیل کی جائے گی۔

پھر چودہ سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

”ومتى استفصل فقال: أردت بقولي: المؤمن يعلم الغيب، إن بعض أولياء الله قد يعلمه الله ببعض المغيبات قبل ذلک؛ لأنه جائز عقلاً وواقع نقلاً، إذهو من جملة الكرامات الخارجة عن الحصر على ممر الأعصار، فبعضهم يعلمه بخطاب، وبعضهم يعلمه بكشف حجاب، وبعضهم برفع حجاب اللوح والصحيح أنه لا يكفر؛ لأن الأنبياء ـ عليهم السلام ـ يعلمون الغيب، ويعرض عليهم الأشياء فلا يكون كفراً.“

اور تفصیل طلب کرنے پر اس نے کہا کہ میرے اس قول ”مومن غیب جانتا ہے“ سے میرا مطلب یہ تھا کہ بعض اولیاء اللہ کو خدا نے بعض غیوب کی خبر دی ہے تو یہ مان لیا جائے گا، کیوں کہ یہ عقلاً بھی جائز ہے، اور نقلاً واقع ہے، کیوں کہ یہ تو ان بے شمار کرامتوں میں سے ہے جس کا احصا ممکن ہی نہیں، بعض کو خدا مخاطب کر کے بتا دیتا ہے، بعض کو کشف حجاب کر کے اور بعض کے لیے لوح محفوظ کا پردہ اٹھا دیتا ہے، صحیح یہ ہے کہ کفر نہ ہوگا، اس لیے کہ انبیا علیہم السلام غیب جانتے ہیں، اور ان پر اشیا پیش کی جاتی ہیں لہذا کفر نہیں۔

آپ ہماری فقہی مسائل سے متعلق کتابوں سے ہم کو الزام نہیں دے سکتے، کیوں کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ مسائل کی کتابوں میں راجح مرجوح، مفتی بہ اور غیر مفتی بہ ہر قسم کے اقوال ہوتے ہیں، اور جب تک صحت کے ساتھ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہ قول مفتی بہ ہے، اس کے ساتھ فتویٰ دینا ضرور جہالت ہے، جیسا کہ درمختار میں اس کی تصریح ہے، اور آپ اور آپ کے مولوی عبد الرزاق ضرور جاہل ہوئے، رہے علمائے احناف تو اللہ کے فضل سے علم باعلام، اور علم بالاستقلال کے فرق کو سمجھتے ہیں، اس لیے ان کو یہ فتویٰ قطعاً مضر نہیں، اور اس سلسلے میں آپ کی ساری لاف وگزاف بے معنی ہے۔

باخرابات نشیناں زکرامات ملاف ہرسخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد

حاضر وناظر اور فاضل رحمانی:

گزشتہ اوراق میں مسئلہ حاضر وناظر کے متعلق ہمارے خیالات کافی وضاحت سے بیان ہو چکے ہیں، اور یہ بھی بیان ہو چکا کہ یہ مسئلہ کوئی بنیادی عقیدہ نہیں ہے، لیکن اس کے برخلاف غیر مقلدین حضورﷺ کو حاضر وناظر نہ ماننا ہی اپنا بنیادی عقیدہ مانتے ہیں، اور عقیدہ خواہ ایجابی ہو یا سلبی ہر ایک کے لیے دلیل قطعی کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً جس طرح ہمارے ذمہ حاضر وناظر ہونے کا ثبوت پیش کرنا ہے، اگر چہ عقیدہ قطعی نہ ہونے کے سبب دلیل ظنی ہی سے کام چل جائے گا، اسی طرح ہمارے مقابل کے لیے بھی جدید دلیل کی ضرورت ہے، صرف ہمارے دلائل کی تردید کافی نہیں، کیوں کہ یہ مسئلہ ان کے نزدیک باب عقائد سے ہے، غالباً ہمارے مخالف اس نکتہ سے واقف تھے، اس لیے انہوں نے بھی حاضر وناظر نہ ہونے پر دلیل پیش کی ہے، لیکن پوری بحث جو مولانا عتیق الرحمٰن صاحب اور فاضل رحمانی میں چل رہی ہے، اگر تجزیہ کیا جائے تو صرف ایک دلیل ایسی ملے گی، جس کو فاضل رحمانی نے حاضر وناظر نہ ہونے کے ثبوت میں پیش کیا ہے، باقی سارا طومار ہمارے دلائل کے مقابلہ میں ہے، حالاں کہ بفرض محال اگر ہم یہ ثابت نہ بھی کر سکیں جب بھی جب تک مخالف حاضر وناظر نہ ہونا ثابت نہ کر دے، اس کو کچھ بھی مفید نہیں۔

اب ہم فاضل رحمانی کی اس اکلوتی دلیل پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہم سے دلیل قطعی کے طالب خود کتنی لچر دلیل پر اپنے عقیدے کی بنیاد قائم کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

اللہ فرماتا ہے:

﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾[ق:س ۵۰ ـ ت ۱۶]

اور

﴿هُوَ اللّٰهُ فِيْ السَّمٰوَاتِ وَفِيْ الْأَرْض﴾[الأنعام:س ۶ ـ ت ۳]

جس سے معلوم ہوا کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے، ساتھ ہی ساتھ ارشاد ہے: ﴿ليس كمثله شيء﴾ اس کے مثل کوئی شی نہیں ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ اللہ کے ہر جگہ موجود ہونے میں بھی کوئی اس کے مثل نہ ہو۔ (انتہی ملخصاً)

اس پر مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے ایک معارضہ فرمایا:
اگر قرآن کی آیتوں کا یوں ہی مذاق کیا جا سکتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
﴿اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ.﴾ اللہ ہی سمیع وبصیر ہے۔
اب اس کے ساتھ ﴿ليس كمثله شيء﴾ والی آیت ملا لو، تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صفت سمع وبصر کا بھی کسی غیر خدا پر اطلاق نہ ہو، اور جو اطلاق کرے وہ مشرک، حالاں کہ قرآن میں انسان کے لیے سمیع وبصیر کا لفظ آیا ہوا ہے: ﴿فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا﴾ ہم نے انسان کو سمیع وبصیر بنایا، تو کیا معاذ اللہ قرآن خود مشرک۔ (ملخصاً)

جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ جس طرح یہاں صرف لفظی اشتراک سے شرک ثابت نہیں ہوتا، بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ انسان اور خدا کے سمیع وبصیر ہونے میں زمین وآسمان کا فرق ہے اسی طرح خدا کے حاضر وناظر ہونے میں اور رسول کے حاضر وناظر ہونے میں بھی بون بعید ہے۔ لہذا شرک ثابت نہ ہوگا۔ لیکن فاضل رحمانی حضرت مولانا کی اس چوٹ سے ایسا بوکھلا گیے ہیں، ساری نحو، پوری منطق اور علم کلام انڈیل دیا ہے، جب کہیں گالی وغیرہ دے کر ٹھنڈے ہوے ہیں، اور کہا وہی جو حضرت مولانا کہلانا چاہتے ہیں، اس سادہ لوح کو اس چرکے کا احساس نہ ہوا، جس کا منشا صرف یہ تھا:

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے   جادو وہ جو سر پہ چڑھ کر بولے

ہم نے سنا کہ فاضل رحمانی کی اس طولانی تقریر کے جواب میں حضرت مولانا ایک شعر پڑھ رہے تھے:

لائے اس بت کو التجا کر کے   کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

چناں چہ اس معارضہ کے جواب میں ایک طویل تقریر کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:
(۱) اللہ ہمیشہ سے سمیع وبصیر ہے، اور ہمیشہ رہے گا، اور انسان ایک محدود مدت تک۔
(۲) انسان خدا کے بنانے سے سمیع وبصیر ہے، اور خدا خود بخود۔
(۳) ہمارے سمع وبصر کی کیفیت معلوم ہے، اور خدا کی مجہول۔
ان تین تین فرقوں کے باوجود کون بے وقوف ہوگا جو خدا اور بندے کو سمع وبصر میں شریک مانے گا۔

یہاں سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کو حضور سے عداوت ہے، ورنہ یہ کیا وجہ ہے کہ جب خود اپنی سماعت و بصارت معرض خطر میں آتی ہے تو طرح طرح کی تاویلیں سوجھتی ہیں اور بے شمار فرق نظر آتے ہیں، لیکن حضور کی کسی صفت کے بارے میں بغیر کسی تاویل کے شرک و کفر کا فتویٰ صادر کر دیا جاتا ہے۔ ورنہ حضور جان نور ﷺ کے بارے میں بھی یہی باتیں کہی جا سکتی ہیں، کہ حضور کا حاضر و ناظر ہونا خدا کی دین سے ہے اور خدا کا خود اپنا، حضور کا حاضر و ناظر ہونا ایک خاص مدت سے ہے، اور خدا کے لیے کوئی حد نہیں، ورق الٹ کر حضور کے لیے حاضر و ناظر کے معنی دیکھ لیجیے، کیا جسم مثالی، یا روح، یا جسم حقیقی کے ساتھ سیر کرنا خدا کی صفت خاصہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ کی عداوت ان تیرہ بختوں سے یہ سب کچھ کرا رہی ہے:

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیبے است

گل است سعدی و در چشم دشمناں خار است

مسئلہ حاضر و ناظر اور مولوی عتیق الرحمٰن صاحب:

رسالہ ”خیر الانبیاء“ میں رسول کریم ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے کے ثبوت میں کئی آیتیں اور متعدد احادیث پیش کی گئی ہیں، جس سے مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کا منشا صرف یہ تھا کہ ان تمام نصوص کے پیش کر دینے سے حضور کی وسعت علم و نظر کا ایک واضح نقشہ سامنے آ جائے، اور آپ کی وسعت علم بطور تواتر معنوی کے ثابت ہو جائے، ہر ہر آیت یا حدیث الگ الگ مستقل دلیل نہ تھی، کہ اس اعتراض کی گنجائش نکل سکے کہ فلاں دلیل دعوے سے خاص ہے، کیوں کہ وہ کوئی الگ اور مستقل دلیل ہی نہیں، تاہم اس امر کا خاص لحاظ رکھ کر بعض ایسی آیتوں اور حدیثوں کو بھی بیان کر دیا گیا تھا، جو تنہا بھی ثبوت مدعا کے لیے کافی ہوں، لیکن ہمارے فاضل رحمانی کو عقل سے اتنا بَیر ہے کہ صرف اپنی سہولت و آسانی نیز جاہل عوام پر اپنی ہمہ دانی کا سکہ بٹھانے کے لیے ہر ہر آیت و حدیث کو الگ الگ دلیل فرض کر لیا ہے۔ حد یہ کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ جو محض وضاحت مسئلہ کے لیے بیان کیا گیا تھا، اس کو بھی ایک الگ دلیل بنا کر خواہ مخواہ زحمت تردید گوارا فرمائی، اور کاغذ سیاہ کیے ہیں، اس پر ہم اس سے زیادہ کیا کہیں:

چوں بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطا است　　سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجا است

لیکن ہم کو چوں کہ فاضل رحمانی کی ہر طرح خاطر کرنی منظور ہے، اس لیے اس رسالے میں انہیں کے اصول کو مدنظر رکھ کر ''خیر الانبیا'' کے صرف انہیں نصوص کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے، جو بہت کچھ دعوی سے مطابق ہیں، اور جس کا اعتراف زبان حال سے ہمارے سادہ لوح مخاطب نے بھی کیا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بقیہ نصوص اس بات سے عاری ہیں، بلکہ یہ تو صرف ہمارے بھولے بھالے نیز آفت کے پر کا پر کالے مخالف کی جاہلانہ شوخی ہے کہ وہ اپنی جہالت ولاعلمی کو ہماری طرف منسوب کرتا ہے۔

شاہداً کی بحث:

اس سلسلہ میں مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی بحث کا خلاصہ یہ ہے: قرآن عظیم نے آپ کی ذات گرامی کو تین جگہ شہید یا شاہد کے لفظ سے یاد فرمایا ہے:

(۱)﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيداً﴾ [البقرۃ: س ۲-ت ۱۴۳]

ایسے ہی اے امت محمد تم کو امت وسط بنایا کہ تم لوگوں پر گواہی دو، اور تم پہ رسول شاہد ہوں۔

(۲)﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَٰؤُلَاءِ شَهِيداً﴾ [النساء: س ۴-ت ۴۱]

پس کیسے ہوگا جب کہ ہم ہر ایک امت سے گواہ لائیں گے، اور آپ ان سب پر شہید ہوں گے۔

(۳)﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِداً وَمُبَشِّراً وَنَذِيراً﴾ [الأحزاب: س ۳۳-ت ۴۵]

اے نبی ہم نے آپ کو شاہد اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔

ان آیتوں سے وجہ استدلال یہ ہے کہ

(۱) شاہد اور شہید کے وہ معنی جو یہاں مراد لیے جاسکتے ہیں دو ہیں۔ حاضر و ناظر یا گواہ۔ پہلی صورت میں مدعا بداہۃً ثابت اور گواہ ہونے کی صورت میں بھی حاضر و ناظر ہونا ضروری کہ شہادت بغیر معائنہ کے ہو ہی نہیں سکتی۔

(۲)اور گواہ ہونے کی شکل میں آپ ساری مخلوق پر گواہ ہوں گے، اس لیے پوری کائنات حضور کے پیش نظر ہونا ضروری ہے۔

فاضل رحمانی نے اس پر مندرجہ ذیل گرفتیں کی ہیں:

(۱)حضور ساری مخلوق پر گواہی تو کیا دیں گے اپنی امت کے لیے بھی صرف اتنا کہیں گے کہ یہ عادل اور سچے ہیں، اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر ہر امتی کی تمام حالتوں سے بھی آپ آگاہ ہوں۔

(۲)شہادت کے لیے دیکھنا ضروری نہیں۔

مدارک میں ہے:

"الشهادة قد تكون بلا مشاهدة، كما في الشهادة بالتسامع في الأشياء المعروفة.(۹۸/۱)

شہادت کبھی بلا مشاہدہ بھی ہوتی ہے، جیسا کہ اشیاے معروفہ ومشہورہ میں سن کر گواہی دی جاتی ہے۔

(۳)اگر حضور کو "شاہداً" کے لفظ کی وجہ سے حاضر وناظر کہنا صحیح ہے تو امت محمدیہ کو بھی اس خطاب سے نوازا گیا ہے۔لہذا سب حاضر وناظر ہوے۔

شہادت کے معنی:

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آیا شہادت کے لیے دیکھنا ضروری ہے کہ نہیں؟ امام اکمل الدین محمد بن محمود البابرتی اپنی کتاب "عنایۃ علی الہدایۃ" میں فرماتے ہیں:

"والشهادة في اللغة عبارة عن الأخبار بصحة الشيء عن مشاهدة وأعيان، ولهذا قالوا: إنها مشتقة من المشاهدة."(العناية على الهداية: ۲/۶)

شہادت لغت میں کسی چیز کی خبر دینا ہے رویۃ ومشاہدہ کے بعد، اس لیے اہل لغت کہتے ہیں کہ یہ مشاہدہ سے مشتق ہے۔

"الشهادة والمشاهدة والشهود هو الروية."(التفسير الكبير: ۹/۲)

شہادت، مشاہد اور شہود دیکھنے کا نام ہے (خواہ قلب سے ہو یا آنکھ سے)

"والتركيب للحضور، إما بالذات أو بالتصور."(بیضاوی شریف ص ۴۵)

شہادت کی ترکیب ہی حضور کے لیے ہے بالذات یا بالعلم۔

اور خیر الانبیاء میں تو مفردات راغب کے حوالہ سے معلوم ہی ہو چکا ہے کہ: الشهادة والشهود. هو الحضور مع المشاهدة إما بالبصر وإما بالبصيرة. شہادت اور شہود کے معنی مشاہدہ کے ساتھ حاضر ہونا، یہ مشاہدہ خواہ آنکھوں سے ہو، خواہ بصیرت سے۔ اور اتنا تو لغت کی ہر کتاب میں مل جائے گا کہ: الشهادة خبر قاطع. شہادت خبر قاطع کا نام ہے، اور کسی چیز میں قطعیت کے دو ہی طریقے ہیں یا مشاہدہ، یا ایسے صادق القول کا خبر دینا جو واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھے ہو، بہر حال جہاں تک شہادت کا تعلق ہے بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کا ثبوت مشاہدہ کے بعد ہی ہوسکتا ہے، اس لیے شاہد کے معنی خواہ حاضر و ناظر ہوں یا گواہ۔ بہر حال حاضر و ناظر ہونا ضروری ہے۔

شہادت بالتسامع:

رہ گیا یہ سوال کہ علامہ نسفی نے فرمایا:

والشهادة قد تكون بلا مشاهدة كما في الشهادة بالتسامع في الأشياء المعروفة.

تو ہم اس کا انکار نہیں کرتے، تمام کتب فقہ میں یہ مسئلہ مصرح ہے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس صورت میں شہادت کا اطلاق حقیقت ہے یا مجاز، حقیقت تو ہے نہیں جیسا کہ کتب لغت اس کی شاہد عدل ہیں۔ اور ابھی ہم نے عنایہ وغیرہ کی عبارتیں نقل کی ہیں جن سے ظاہر ہے کہ شہادت میں مشاہدہ ضروری ہے، بلکہ یہ اطلاق مجاز ہے، حقیقت نہیں۔ اسی واسطے فقہائے کرام اس کو خلاف قیاس فرماتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ شہادت بالتسامع حفظ حقوق کے ماتحت ضرورۃً جائز رکھی گئی ہے۔ پس جب یہ اطلاق مجاز ہوا تو یہ کہنا کہ شہادت میں مشاہدہ ضروری نہیں جہالت ہے۔ اور مدارک کی عبارت پیش کرنا جہالت در جہالت۔ کیوں کہ یہ ایسے ہی ہوگا جیسے کوئی کہے اسد کے لیے حیوان مفترس ہونا ضروری نہیں بلکہ اسد کبھی حیوان ناطق بھی ہوتا ہے جیسے بولتے ہیں: "زيد أسد" اس میں اسد کا اطلاق زید پر ہوا جو حیوان ناطق ہے۔

اور فاضل اپنی کم نگاہی سے یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں بہت دور کی کوڑی لایا:

اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی — اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی

امت کی شہادت:

اسی طرح امت مسلمہ جو گزشتہ امتوں کے بارے میں بیان دے گی وہ شہادت علی الشہادۃ ہوگا۔ جیسا کہ جب ان سے سوال کیا جائے گا کہ تم نے کس طرح یہ شہادت دی تو کہیں گے: بأخبار القرآن علی لسان نبیک الصادق. جس سے خود ہمارے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے کہ شہادت کے لیے دیکھنا ضروری ہے۔ جبھی تو امت محمدیہ سے سوال ہوا کہ آپ گواہی کیسے دے رہے ہو جب تم اس وقت تھے نہیں، پس جس طرح ان کی شہادت علی الشہادت ہے، اسی طرح ان پر لفظ شاہد کا اطلاق بھی مجازاً ہوا ہے، اور ان کو حاضر و ناظر کہنا درست نہیں۔

شہادت توحید:

لیکن فاضل رحمانی شہادت علی الشہادت کے طلسم زار میں ایسا پھنسے کہ رہائی ممکن نہیں۔ فرماتے ہیں شہادت کے لیے دیکھنا ضروری ہے، تو ہر مسلمان کلمۂ توحید کی شہادت کیسے دیتا ہے؟ لیکن اس سادہ لوح کو معلوم نہیں کہ یہ بھی شہادت علی الشہادت ہے، وہ بھی اس پایہ کی کہ اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ میں حضور کی نہیں بلکہ اپنی معرفت اور علم سے اللہ کی وحدانیت کی گواہی دیتا ہوں تو یہ گواہی بارگاہ الٰہی میں نامقبول ہوگی۔

رہ گیا یہ سوال کہ شہادت علی الشادۃ پر لفظ شہادت کا اطلاق ہوتا ہے، ہمارے لیے کچھ مضر نہیں، کیوں کہ حضور کی شہادت کو بھی شہادت علی الشہادۃ ثابت کرنے کے لیے مخالف کو دلیل کی ضرورت پڑے گی اور یہ ان کے بس کی بات نہیں۔

تنبیہ:

یہ واضح رہے کہ مشاہدہ باب شہادت میں اپنے وسیع معنی میں مستعمل ہوتا ہے، مثلاً ایک شخص نکاح کے ایجاب وقبول کی گواہی دیتا ہے، یہ خبر بھی مشاہدہ میں داخل ہے، لیکن رویت عین یہاں بالکل نہیں، کیوں کہ اس کا تعلق آنکھ سے ہے ہی نہیں بلکہ کان سے ہے۔ یوں ہی مبصرات کے علاوہ دیگر محسوسات کی گواہی انہیں حواس کے واسطہ سے ہوگی، بایں ہمہ وہ تمام قسمیں مشاہدات میں داخل ہیں، اور اس کی اعلیٰ قسم ہیں، یوں ہی دنیا کی گزشتہ یا آیندہ وہ اشیا جن کا تعلق مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ظاہری آنکھوں سے نہیں ہے، اس کا علم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جس واسطے

سے ہوا ہو سب مشاہدات میں داخل ہیں۔

شہادت کی وسعت:

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ شہادت کے لیے مشاہدہ ضروری ہے، یہ دیکھنا ہے کہ حضور کی شہادت کن کن لوگوں پر ہوگی۔ جلالین، تفسیر ابن عباس، بیضاوی، ابوسعود، تفسیر کشاف وغیرہا میں پہلی آیت کے تحت میں یہ لکھا ہے کہ حضور ﷺ اپنی امت کے مزکی اور معدل ہیں۔

دوسری آیت سورۂ نساء کے تحت مدارک وخازن میں ہے:

﴿جئنابک﴾ یا محمد ﴿علیٰ هؤلاء﴾أي: أمتک ﴿شهيدًا﴾

يعني: تشهد علىٰ هؤلاء الذين سمعوا القرآن وخوطبوا به بما عملوا.

(مداک التنزيل: النساء. ت ۴۱)

(تفسير خازن: ۱/۲۷۶)

ہم آپ کو اے نبی ان گواہوں پر گواہ بنائیں گے جن کو قرآن مخاطب کرنے والا ہے، اور جنہوں نے قرآن سنا اور عمل کیا۔

تفسیر کشاف میں ہے:

﴿جِئنَابِکَ عَلیٰ هؤلاَءِ﴾ المكذبين ﴿شهيدا﴾

(تفسير سورة النساء: ت ۴۱ ۔ ۱/۵۰۶)

ہم نے آپ کو منکرین پر گواہ بنایا۔

بیضاوی میں ہے:

"تشهد على صدق هؤلاء الشهداء لعلمک بعقائدهم، واستجماع شرعک مجامع قواعدهم، وقيل: هؤلاء إشارة إلى الكفرة المستفهم عن حالهم، و قيل: إلى المؤمنين." (تفسير سورة النساء: ت ۴۱ ۔ ۱/۲۱۵)

آپ ان گواہوں کے صدق پر گواہی دیں گے، کیوں کہ آپ کو ان کے عقائد کا علم ہے، اور آپ کی شریعت جامع ہے ان کے تمام قواعد کی۔ ایک قول یہ ہے کہ ھولاء سے مراد کفار ہیں، اور کہا گیا کہ مومنین مراد ہیں۔

ان تفسیروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مفسروں کے تین اقوال ہیں:

(۱) آپ انبیا پر شہادت دیں گے۔

(۲) کافروں پر شہادت دیں گے۔

(۳) مسلمانوں اور مومنوں پر شہادت دیں گے۔

تیسری آیت کے تحت جلالین میں ہے:

﴿شاهداً﴾ علیٰ من أرسلت علیهم.“

(تفسیر سورۃ الأحزاب: ت ۴۳۔ص ۴۲۴)

آپ شاہد ہوں گے ان لوگوں کے جن کے آپ رسول ہیں۔(یعنی ساری مخلوق کے)

تفسیر ابن عباس میں ہے:

﴿شاهداً﴾ علی أمتک بالبلاغ.“

آپ شاہد ہوں گے اپنی امت پر تبلیغ رسالت کے۔

بیضاوی میں ہے:

﴿شاهدا﴾ علیٰ من بعث إلیهم بتصدیقهم وتکذیبهم ونجاتهم وضلالهم.“ (تفسیر سورۃ الأحزاب:ت ۴۳۔۲/۲۴۸)

آپ شاہد ہوں گے ان لوگوں پر جن کی طرف مبعوث کیے گئے ،ان کی تصدیق وتکذیب اور نجات وصلاۃ کے لیے۔

تفسیر کبیر میں ہے:

”أنه شاهد علی الخلق یوم القیامة، أنه شاهد أن لااله إلا الله، أنه شاهد في الدنیا بأحوال الأخرة من الجنة والنار، وشاهد في الآخرة بأحوال الدنیا بالطاعة والمعصیة والصلاح والفساد.“ (تفسیر کبیر: ۹/۱۷۳)

آپ شاہد ہوں گے مخلوق پر قیامت کے دن، یا آپ لا الـٰه الا الله کی شہادت دینے والے ہیں، یا دنیا میں جنت ونار کی شہادت دیتے ہیں، اور آخرت میں طاعت وگناہ اور فلاح وفساد کی شہادت دیں گے۔

تفسیر ابو سعود میں ہے:

”علی من بعثت إلیهم تراقب أحوالهم، وتشاهد أعمالهم، وتعمل

منھم الشھادۃ بما صدر عنھم من التصدیق والتکذیب، وسائر ماھم علیه من الھدی والضلال، و تؤدیھا یوم القیامة۔"

(تفسیر ابو سعود:سورۃ الأحزاب ۔ت ۴۳. ۴/۳۲۵)

آپ شاہد ان لوگوں پر ہیں جن کی طرف مبعوث کیے گئے، آپ ان کی کیفیات کے نگہبان، ان کے اعمال کا مشاہدہ کرنے والے اور آپ ان کی شہادت دیں گے وہ جو ان سے صادر ہوا، تصدیق سے تکذیب سے، اور ہدایت وگمراہی (سب کی) شہادت قیامت کے دن دیں گے۔

مدارک وخازن میں ہے:

﴿شاھداً﴾ للرسل بالتبلیغ، وقیل: شاھداً علی الخلق کلھم۔"

(تفسیر خازن: ۳/۴۳۰)

رسولوں کی تبلیغ وہدایت کی شہادت دیں گے اور ایک قول کہ ساری مخلوق پر گواہ ہوں گے۔

مذکورہ بالا تشریح سے معلوم ہوا کہ پہلی آیت میں صرف اس بات کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ قیامت میں اپنی امت کی تصدیق اور تزکیہ فرمائیں گے۔ اور کہیں گے کہ میرے امتی سچے ہیں، جیسا کہ فاضل رحمانی کا بیان ہے، لیکن صرف یہی آیت تو نہیں کہ فاضل رحمانی کی بات مان لی جائے، اس ظالم نے تو یہ غضب کیا ہے کہ اور دیگر آیتوں کی تفسیر کر کے تفسیر بالرائے کا مرتکب ہوا ہے، کیوں کہ دوسری آیت سے اتنی بات زائد ثابت ہوتی ہے کہ انبیا پر بھی آپ گواہ ہوں گے، اور دیگر اقوال کی بنا پر ساری مخلوق پر آپ شاہد ہوں گے۔ پھر اگر ان تفسیروں کی روشنی میں حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے یہ کہا کہ ساری مخلوق پر آپ کی شہادت ہوگی اور ہم بدلائل ثابت کر آئے ہیں کہ: الشھادۃ ھو الحضور مع المشاھدۃ إما بالبصر أو بالبصیرۃ. اس لیے اگر ان سب کے پاس حضور کا دعویٰ کیا تو کیا غضب کیا، لیکن فاضل رحمانی اپنی غلط کوشی و نادانی سے ہر جگہ متبذل و رکیک جی داری سے کام لیتے ہیں۔ اب یہ ناظرین کا کام ہے کہ وہ یہ فیصلہ کریں کہ: دزد بکف چراغ۔ وہ ہیں یا دوسرا۔

بحث کا اعادہ:

یہ یاد رہے کہ اب تک جو بحث کی گئی صرف اس شق پر کی گئی ہے کہ شاهداً کے معنی گواہ کے ہیں۔ اور گواہ کے لیے دیکھنا ضروری۔ لہٰذا آپ حاضر ہوے، اور اگر شاهداً، شهوداً کا اسم فاعل ہو تو اس کے ٹھیک معنی حاضر و ناظر ہوے، جیسا کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کا ترجمہ کیا: ''بھیجا ہم نے آپ کو حاضر و ناظر'' اور صاحب مفردات راغب نے هو الحضور مع المشاهدة. سے کیا۔ اور آیت کے اس معنی پر فاضل رحمانی نے سواے اس کے اور کچھ نہیں کہا کہ یہ لفظ متکثر المعنی ہے، گویا دبے لفظوں میں اس معنی کا بھی آپ کو اقرار ہے۔ اور دلالۃ النص سے نہیں اقتضاء النص سے ہی حضور کا حاضر و ناظر ہونا تسلیم کر لیا۔

یہ عجیب بات ہے:

ہونٹوں پہ ہنسی آنکھوں میں غضب اقرار بھی ہے انکار بھی ہے

حضور جسمی:

یہاں ایک مغالطے کا ازالہ ضروری ہے۔ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے ''خیر الانبیا'' میں فرمایا: ''گزشتہ امتوں کے حالات بچشم خود ملاحظہ نہ فرمائے ہوتے تو آپ سے جرح نہ ہوتی کہ آپ بغیر دیکھے کیسے گواہی دے رہے ہیں''۔ یہاں لفظ چشم کی آڑ لے کر رحمانی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضور اپنے جسد عنصری کے ساتھ ہر جگہ اور ہر زمانے میں موجود ہیں۔

اس دھوکے کا بھی اصلی سبب یہی ہے کہ یہ شپرہ چشم حضور کے دیکھنے کو بھی اپنی طرح سمجھ رہا ہے، حالاں کہ اس سراپا اعجاز ﷺ کا دیکھنا ہماری طرح قطعاً نہیں ہے، ہم صرف سامنے کی چیز دیکھتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

(اني لأراكم وراء ظهري كما أرىٰ أمامي)

میں تم کو پیچھے بھی اسی طرح دیکھتا ہوں جس طرح سامنے۔

حدیث: تجلى لي كل شيء) میں گو تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی فاضل رحمانی بھی یہ مانتے ہیں کہ ساری کائنات حضور پر روشن ہو گئی خواہ گزشتہ ہو، موجود یا آیندہ ہو۔ اور حضور نے ہر ایک کا عرفان بھی کیا، پھر کیا آپ اس سے یہ استدلال کریں گے کہ حضرت ہر ہر شی کے پاس بجسدہ حاضر ہوں۔

یوں ہی حدیث: (أني أنظر إليها وأنا في مقامي هذا.)
میں بھی آپ کو یہ اقرار ہے کہ آپ کی یہ نظر قیام منبر تک ہی سہی حوض کوثر پر ہے۔ پھر کیا آپ کا خیال ہے کہ وہ نظر ہماری اور آپ کی طرح ہے۔ بندہ پرور! اس مقدس وجود کے لیے رویت وعرفان کے وہ تمام اصول وقواعد جو عام انسانوں کے لیے ضروری ہیں ان کے لیے ضروری نہیں، وہ بغیر گزشتہ زمانوں میں بجسدہ موجود ہوئے بھی ہر ایک چیز کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ اور یہ ملاحظہ گو ان ظاہری آنکھوں سے نہ ہو، مگر اتنی وضاحت رکھتا ہے کہ ساری دنیا کی نگاہیں مل کر بھی اتنا عرفان حاصل نہیں کرسکتیں۔ تو اس کیفیت کے بیان کے لیے سوائے چشم دید اور مشاہدہ کے لیے اور کون سا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ ہم حضور جسمی کے گزشتہ زمانوں میں قائل ہوں۔ اور نہ اس کو آپ ہمارے بیان کردہ معنی حاضر وناظر سے کسی طرح ثابت کرسکتے ہیں۔ فاضل رحمانی نے خواہ مخواہ قرآن عظیم کی ان آیتوں کو پیش کرکے جن میں حضور جسمی کی نفی ہے کتاب کے اوراق میں اضافہ کیا ہے۔

مزکی یا شاہد:

گزشتہ اوراق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ پہلی آیت میں علمائے تفسیر نے مزکی ومعدل کا لفظ، اور دوسری میں بعض نے استعمال کیا ہے، اور تیسری میں حضور کو شاہد ہی لکھتے ہیں، جس سے فاضل رحمانی کی اس بانگ بے ہنگام کی وقعت ظاہر ہوجاتی ہے کہ امت کے بارے میں آپ صرف اجمالی بیان دیں گے، کہ یہ قابل گواہی ہے۔ اور بس، لیکن ہم یہ چاہتے ہیں، کہ مزکی ومعدل ہونے کے معنی بھی بیان کرتے چلیں تاکہ رگ وہابیت کا کوئی تار باقی نہ رہے۔ علامہ بیضاوی کی تفسیر متعلقہ دوسری آیت: ﴿تشهد علىٰ صدق هؤلاء الشهداء.﴾ پر امیر خطیب گازرونی حاشیہ تحریر فرماتے ہیں:

”أقول: ههنا شيئان: الأول مافائدة في جعل نبينا شهيدًا علىٰ الأنبياء مع كما لهم، والثاني أن الشهادة علىٰ صدق الشهداء لا تعلق لهم للعلم بعقائد هم، واستجماع شرعه لجامع قواعدهم، بل مدارها علىٰ أن يعلم أن ما يقولون في شانه أنه صادق، والجواب عن الأول: فائدة إظهار شرف نبينا على سائر الأنبياء .وعن الثاني أن المزكي للشاهد بعينه يعتبر في تصديقه الخبر الباطنة،

وهي أن يعلم باطن أحوال الشاهد، وهذا ما قرر في الفقهيات، ولا يخفى أن المزكي إذا كان عالماً بعقائد الشاهد وأعماله كان تزكية أقوىٰ وأشد اعتبار، أو العلم بعقائد هم إشارة إلى أمور العقلية، والاستجماع المذكور الأعمال، يعني أن نبينا ﷺ عالم بعقائد الأنبياء وأعمالهم؛ فلذا صار مزكياً لهم۔صلوٰت الله عليهم." (بیضاوی دوم ص ۸۸)

میں کہتا ہوں کہ یہاں دو باتیں ہیں: ایک تو یہ کہ ہمارے نبی کو دیگر انبیا پر گواہ بنانے میں فائدہ کیا ہے۔ دوسرے گواہوں کے صدق پر شہادت علم عقائد اور محمدی شریعت کا دیگر شرائع کے جامع ہونے سے کوئی علاقہ نہیں، بلکہ یہ جاننا چاہیے کہ یہ جو شہادت دے رہے ہیں اس میں سچے ہیں، پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ اس میں ہمارے نبی کی شرافت وکرامت کا اظہار ہے دیگر انبیاء پر۔ اور دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ شاہد بعینہ کے تزکیہ وتصدیق میں یہ بات ضروری ہے کہ مزکی شاہد کے حالات باطنی کا بھی مشاہدہ کرے، اور یہ بات اہل فقہ کے نزدیک ثابت ہو چکی ہے اور یہ بات واضح ہے کہ مزکی جب شاہد کے عقائد اور اعمال کو جانے گا تو اس کا تزکیہ اور زیادہ قوی اور معتبر ہوگا۔ اور علم عقائد سے مراد امور عقلیہ ہیں اور استجماع مذکور سے مراد اعمال، مطلب یہ ہے کہ ہمارے نبی ﷺ انبیا کے عقائد کو بھی جانتے ہیں اور تمام اعمال کو بھی، اس لیے آپ ان تمام رسولوں کے مزکی ہو گئے۔ ان پر خدا کا سلام ہو۔

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مزکی ہونا تو شاہد سے بھی بڑا مرتبہ ہے اور شاہد سے بھی زیادہ علم وعرفان چاہتا ہے، اور ہمارے سادہ لوح مخالف اپنے زعم میں خوش ہیں کہ ہم نے شہادت کا انکار کر کے حضور کو حاضر وناظر ہونے نہیں دیا۔ یہ تو وہی ہوا۔

مچھلی سمجھ رہی ہے کہ لقمہ یہ تر ملا
صیاد کہہ رہا ہے کہ کانٹا نگل گئی!

﴿النَّبِيُّ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ﴾ [الأحزاب: س ۳۳۔ت ۶]

اس آیت سے "خیر الانبیا" میں یوں استدلال کیا گیا ہے کہ شاہ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اولیٰ کے معنی قریب تر کے لکھے ہیں۔ اس لیے حضور مومنین کی ہر آبادی خواہ وہ عالم بالا کی ہو یا عالم ادنیٰ کی سبھی جگہ ہوے۔ فاضل رحمانی اس پر دو اعتراض کرتے ہیں۔ اولاً

تو یہ معنی عام تفاسیر میں نہیں ہے۔ثانیاً اگر اس کے معنی شاہد کی تفسیر کی بنا پر قریب تر ہی مان لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کے پاس حضور ثابت ہوتا ہے۔اور حنفی دونوں عالم میں حضور کے قائل ہیں۔

اولیٰ کے معنی ضرور قرب مکانی کے ہیں۔اس کے علاوہ جس مجازی معنی میں مستعمل ہوگا،اس میں قرب کا معنی پایا جانا ضروری ہے،خواہ وہ قرب علمی ہو یا تصرفی ہو،یا مقام کے مناسب کوئی اور قرب ہو۔جیسا کہ مجاز کے بارے میں یہ اصول طے ہو چکا ہے۔اس لیے آیت مذکورہ میں دیگر تراجم کی بنا پر قرب مکانی نہ سہی قرب علمی یا تصرفی ضرور ہوگا،اور اتنا ہمارے مدعیٰ کے لیے کافی ہے۔لیکن والفضل ما شهدت به الأعداء.خود فاضل رحمانی سے ایک ایسا جملہ نکل گیا ہے جو ہمارے مدعیٰ کو ثابت کرتا ہے،آپ لکھتے ہیں:یعنی حضور مومنین پر ان کی جانوں سے زیادہ تصرف کا حق رکھتے ہیں،اور جب حضور کو آپ نے متصرف مان لیا تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضور کو ہر ایک مومن کا واضح علم ہے،کیوں کہ تصرف کے لیے تقدم علم ضروری ہے،اس طرح فاضل رحمانی نے نادانستہ حضور علمی کو تسلیم کر لیا۔رہ گیا آپ کا یہ اعتراض کہ دعویٰ عام اور دلیل خاص ہے،یہ غایت جہالت اور لاعلمی پر مبنی ہے،کیوں کہ مومنوں سے کائنات کا کوئی گوشہ خالی نہیں،حتیٰ کہ کافروں کے کندھوں پر بھی کراماً کاتبین ہوتے ہیں جو مومن ہیں۔اسی طرح عرش وفرش،زمین وآسمان کا کون سا حصہ ہے جہاں جن وملک یا انسان نہیں۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾[ألانبياء:س ۲۱۔ت ۱۰۷]:

اس آیت سے نقطہ استدلال یہ تھا کہ سرکار مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا کو اس آیت میں خدا نے اپنی ذات کے علاوہ سارے عالم کے لیے رحمت بتلایا ہے،اس لیے آپ کا تعلق ہر ایک سے ہونا چاہیے،لیکن اس پر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ تعلق کے لیے یہ کیا ضروری ہے کہ آپ سب کے عالم بھی ہوں،اس لیے دوسری آیت ﴿وسعت رحمتي كل شيء﴾ سے یہ ثابت کیا گیا کہ وہ رحمت سب کو گھیرے بھی ہے،یہاں یہ خیال کرنا کہ حضور عالم کے لیے رحمت تو ہیں لیکن اللہ کی رحمت نہیں،اور آیت میں ''رحمتی''،یعنی اللہ کی رحمت کا ذکر ہے،نری جہالت ہے،لیکن فاضل رحمانی کو اسی جہالت پر فخر ہے،یہاں بھی دو اعتراض کرتے ہیں:

(۱)''قرآن میں چودہ معنی رحمت کے آئے ہیں،جن میں کوئی معنی حضور کی ذات نہیں،

وہ معنی یہ ہیں:

اسلام، ایمان، جنت، بارش، نعمت، نبوت، قرآن، رزق، مدد، فتح، عافیت، کشائش، مغفرت، عصمت،

لہذا ''رحمتی'' سے مراد آیت ﴿ورحمتي وسعت كل شيء﴾ میں حضور کی ذات نہیں ہوسکتی، کہ رحمت کے یہ معنی نہیں''۔

(۲) ''اگر ہم رحمت کے معنی حضور کی ذات بھی لے لیں تو چوں کہ دونوں آیتوں سے شکل اول بنتی ہے، اور یہ صحیح نتیجہ اس وقت دے گی جب حد اوسط متکرر رہو، اور یہاں حد اوسط صغریٰ میں رحمت عالم ہے۔ اور کبریٰ میں اللہ کی رحمت، لہذا یہ شکل صحیح نہیں اور نتیجہ بھی درست نہ ہوگا''۔

بمصداق:

آنکھ والے ترے جلووں کا تماشا دیکھیں دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

فاضل رحمانی نے یہاں اپنی فقدان بصیرت کا ثبوت دیا ہے، ورنہ جو شخص کسی طرح یہ معلوم کرسکتا ہے کہ پورے قرآن میں چودہ جگہوں پر چودہ معانی کے لیے لفظ رحمت آیا ہے، وہ اس پندرہویں جگہ کو چھوڑ دے گا جہاں رسول اللہ ﷺ کی عظمت نکلتی ہو۔

نور گیتی فروز چشمۂ حور زشت باشد بچشم موشک کور

کیا زیر بحث آیت:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ [الأنبياء:۱۰۷]﴾ میں حضور کی ذات اقدس پر رحمت کا اطلاق نہیں ہوا ہے۔ اگر ہوا ہے اور ضرور ہوا ہے۔ پھر دیدۂ و دانستہ اس سے اعراض کر جانا صریح بددیانتی نہیں تو اور کیا ہے؟۔ اس لیے ایمانداری سے کام لیتے ہوئے ان چودہ معنی پر ایک اور کا اضافہ کیجیے اور دیکھیے کہ ان میں کون اس بات کی صلاحیت رکھتا ہے کہ ﴿وسعت رحمتي كل شيء﴾ کے تحت آسکے۔

اسلام کبھی بھی ہر شی کو گھیرے نہیں ہے۔ یوں ہی ایمان کی دولت سے لاتعداد اشیا محروم ہیں۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں جنت کا دروازہ کافروں کے لیے بند ہی رہے گا۔ بارش بھی آسمان پر نہیں ہوتی۔ نعمت ایسا لفظ ہے جو رحمت کے ہم معنی ہے۔ نبوت کے اہل معدود حضرات ہیں۔ اور قرآن کے گھیرنے کے معنی یہ ہوں کہ اس میں ہر شی کا بیان ہے۔ تو اس سے حضور ﷺ کی وسعت علمی اور حضور ثابت ورنہ احاطہ نوع، رزق غیر مرزوق کو گھیر نہیں سکتا، مدد مغضوب علیہم کی

نہیں ہوسکتی، عافیت سے پریشان حالوں کا کاشانہ خالی ہے، مؤدت کی اہل کتنی چیزیں نہیں ہیں، کشائش کا دامن بھی سارے عالم کو گھیر نہیں سکتا، مغفرت سے مشرکین قطعاً تہی دامن ہیں، عصمت وحفاظت بھی بے شمار اشیا کے لیے نہیں، پھر وہ رحمت کون سی ہے جو معنی مطابقی کے ساتھ سب کو گھیرے ہو۔ ہم چیلنج کرتے ہیں فاضل رحمانی کو کہ وہ ثابت کریں ان چودہ معانی میں کسی ایسے معنی کو جو سارے عالم کو گھیرے ہو۔ آپ نے رزق مراد لیا ہے، لیکن سوچنا چاہیے تھا کہ رزق کے احاطے سے نباتات اور جمادات خارج ہیں، کیوں کہ رزق اس کو کہتے ہیں جس سے حیوان انتفاع حاصل کر سکے۔

اگر کوئی رحمت سارے عالم کو گھیر سکتی ہے تو وہ ذات گرامی دارین ﷺ کی جو سارے عالم کے لیے رحمت ہیں، اس لیے صاحب مواقف حضرت مولانا العلام امیر القادر جزائری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ موقف نواسی میں فرماتے ہیں:

"فإن حقيقته ﷺ هو الرحمة التي وسعت كل شيء."

حقیقت مصطفویہ ہی وہ رحمت ہے جو سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔

فاضل رحمانی کا خیال ہے کہ اس دلیل میں حد اوسط متکرر نہیں، لیکن کیا دنیا کا کوئی انسان یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ حضور عالم کے لیے رحمت تو ہیں مگر اللہ کی رحمت نہیں۔ حضور خدا کی رحمت ہیں۔ اور ضرور ہیں، پھر فاضل رحمانی کس منہ سے کہتے ہیں کہ حد اوسط متکرر نہیں۔ حضور رحمت عالم ہونے کے ساتھ ہی خدا کی بھی رحمت، اور خدا کی رحمت عالم کو گھیرے ہے۔ لہٰذا حضرت سب کو گھیرے ہیں۔ ہم نے ان دونوں آیتوں کو منطقی استدلال کی شکل میں پیش نہیں کیا تھا، لیکن آپ نے اس کو تسلیم کرکے اپنے کو پابند بنا لیا ہے، لہٰذا اس کا نتیجہ بھی آپ کو تسلیم کرنا ہوگا۔ آپ خواہ مخواہ منطقی بننے کی کوشش کرتے ہیں، میرے خیال میں خود اپنا ہی پیش کردہ وہ شعر،

نہ ہر جاے مرکب تواں تاختن | کہ جاہا سپر باید انداختن

بار بار پڑھ کر اپنے سینے پر دم کیجیے۔ اس مالیخولیا سے آپ کو نجات مل جائے گی۔

احادیث

احادیث پر بھی فاضل رحمانی نے عجیب بے ہنگم اور لایعنی تبصرے کیے ہیں، ذیل میں

نمونۂ چند احادیث کو پیش کیا جا رہا ہے۔ جس سے فاضل رحمانی کے علمی افلاس وسفلہ پن کا ثبوت ملتا ہے۔

"فتجلی لي کل شيء وعرفت"

(الجامع للبخاری: تفسیر سورۃ الصافات۔ ۲/۱۵۵)

اس حدیث کی شرح میں مرقاۃ شرح مشکاۃ میں ہے:

"فعلمت أي: سبب وصول ذلک الفیض مافي السموات والأرض عبارۃ عن سعة علمه، وقال ابن حجر: جمیع الکائنات التي في السموات بل وما فوقها، وجمیع ما في الأرض السبع.

پس جان لیا میں نے اس وصول فیض کے سبب سے وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، یہ تعبیر ہے حضور ﷺ کے وسعت علم کی۔ ابن حجر کا قول ہے کہ جو آسمان کے اوپر ہے اور اس میں ہے وہ سب کائنات اور جو ساتوں زمین میں ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں:

"پس دانستم ہر چہ در زمینہا و ہر چہ در آسمانہا بود، عبارت است از حصول تمامہ علوم کلی وجزئی"۔

پس جان لیا میں نے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے، یہ عبارت ہے حصول سے تمام علوم کلی وجزئی کے۔

اور علامہ طیبی کا بھی یہی خیال ہے، مذکورہ تصریحات علما کی روشنی میں حدیث کا مطلب یہی ہوا کہ حضور کو ایک رات خواب میں ایک خاص قسم کا وصول فیض ہوا، جس کے سبب آپ نے سارے عالم کو دیکھا، جانا، پہچانا۔ یہ وصول فیض اور حصول علم کلی وجزئی صرف خواب کی حالت تک رہا، اور آپ جب بیدار ہوئے، تو معاذ اللہ وہ سارا علم وعرفان آپ سے لے لیا گیا۔ یہ دعویٰ انتہائی جی داری اور بے پناہ جہالت ہے، کیوں کہ حدیث کے کسی لفظ سے نہ تو یہ معنی مترشح ہوتا ہے، نہ ہی کسی معتبر حدیث داں عالم نے اس کے یہ معنی بتائے، لیکن برا ہو فاضل رحمانی کا جنہوں نے عداوت مصطفیٰ ﷺ کے نشہ میں حدیث کے یہ معنی گڑھے اور اس کو بڑے طمطراق سے بیان کیا، افسوس!

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں ہوے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

آپ لکھتے ہیں: "چوں کہ حضور اس واقعہ کو خواب کا بیان فرما رہے ہیں جو ایک خاص وقت ہے، لہذا یہ قضیہ وقتیہ ہوا، مطلب یہ ہوا کہ اس خاص وقت میں یہ بات تھی کہ قدرت نے اپنا ہاتھ حضور کے سینہ پر رکھا تجلی ہوئی، سب روشن ہو گیا، خواب کے بعد نہ وہ ہاتھ رکھنا، نہ وہ روشنی نہ عرفاں"۔ عیاذاً باللہ۔ اگر یہ خاص وقت کا عذر لنگ قابل اعتبار ہو تو ایک شخص بڑی آسانی سے کہہ سکتا ہے کہ ہمارے مخالف علامہ عبد الرؤف نرے جاہل، پکے بدھو، گھامڑ ہیں۔ اور ان کی فضیلت علمی کی ساری سندیں اور علم و تعلیم کی ساری کوششیں بے کار، حرف غلط اور نقش بر آب ہیں، کیوں کہ اپنی ماں کے شکم سے تو تمام علم لے کر آئے نہیں، لامحالہ ان کے جس استاذ نے جب بھی ان پر ہاتھ رکھ کر یا ڈنڈا رکھ کر جس طرح بھی تعلیم دی ہوگی وہ کوئی نہ کوئی خاص وقت ضرور ہوگا، لہذا یہ قضیہ (دلی یا کسی جگہ سنہ فلاں میں عبد الرؤف خاں نے پڑھا) وقتیہ ہوگا۔ اور وقت خاص گزرنے کے بعد نہ تعلیم نہ تعلم، ہمارے مولانا ویسے ہی رہے جیسے گئے تھے۔ چلو اللہ اللہ خیر صلا۔ شاید آپ ہی کے لیے سعدی شیرازی نے کہا تھا:

سگ بدریائے ہفت گانہ بشو چوں کہ تر شد پلید تر باشد
خر عیسی گرش بمکہ برند چوں بیاید ہنوز خر باشد

واہ مولانا واہ، بارہ برس تک دلی رہے بھاڑ ہی جھونکا کیے۔

اس بیث میں مستند علماے حدیث کے خلاف اتنی بڑی جہالت کا لہ مایہ خمیر یہ ہے کہ وہابیوں نے غلطی سے خدا کے لیے بھی اپنے ہی جیسا ہاتھ سمجھ لیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ آدمیوں جیسا ہاتھ کسی کے سینہ سے ہمیشہ چپکا نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے جب آں حضرت ﷺ پیدا ہوے تو بقول فاضل رحمانی خدا کا ہاتھ بھی آپ کے سینہ سے جدا ہو چکا تھا۔ اور حضور نے خواب میں جو کچھ جانا تھا سب بھول چکے تھے، ورنہ اس تشبیہ کا کیا مطلب کہ خواب میں حضور کے سینے پر خدا کا دست قدرت رکھنا ایسا ہی ہے جیسے بیٹری کی روشنی، وہ اسی وقت اجالا دیتی ہے جب پیچھے والا ڈھکن بھی اس میں لگا ہو، جہاں وہ ڈھکن جدا، روشنی بھی غائب، بخلاف اس کے علماے اسلام کا یہ خیال ہے کہ "ہاتھ رکھنے سے مراد' وصول فیض ہے، یعنی عالم خواب میں خدا کی طرف سے فیض پہونچا، اور آپ نے احاطہ علوم کلی و جزئی کیا، سب کچھ آپ پر روشن ہو گیا۔

فان من جودک الدنیا وضرتها ومن علومک علم اللوح والقلم

ایک دلچسپ گرفت:

یہاں فاضل رحمانی نے ایک بڑی دلچسپ قلابازی کھائی ہے، یہ امر تو واضح ہے کہ آپ اسی حضور وعلم کو جس کے ہم قائل حضور کے لیے ہیں، خدا کی صفت خاصہ قرار دیتے ہیں، اور آیت: ﴿لیس کمثلہ شيء﴾ سے اس صفت خاصہ کی نفی غیر خدا سے کرتے ہیں، اور ((فتجلی لي کل شيء)) سے اسی کو ہم نے حضور کے لیے ثابت بھی کیا، اور فاضل رحمانی کو گو حالت خواب ہی میں، گو بطریق معجزہ ہی، گو تھوڑی ہی دیر تک حضور کے لیے ثابت مانتے ہیں، اور اس کے بعد زوال کے قائل ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا چند منٹ کے لیے ہی خدا کی کسی صفت خاص کو کسی مخلوق کے لیے ثابت ماننا شرک نہیں، کیا ایک آدھ گھنٹے کے لیے کوئی شخص معبود ہوسکتا ہے، گو بطور معجزہ ہی سہی، اگر نہیں تو آپ نے بطور معجزہ عالم خواب میں علم الٰہی (بقول آپ کے) حضور کے لیے ثابت مان کر شرک کیا یا نہیں، اور ہم کو مشرک کہتے کہتے خود مشرک ہوئے کہ نہیں۔

یوں نظر دوڑے نہ برچھی تان کر اپنا بیگانہ ذرا پہچان کر

((رفع لي الدنیا فأنا أنظر الیها والی ما هو کائن فیها:))

اس حدیث کے بارے میں فاضل رحمانی نے صرف یہ کہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، فاضل مذکور مشکاۃ شریف کا حوالہ بڑے طمطراق سے دیتے ہیں، لیکن آپ کی حیلہ جو آنکھ یہودیوں کی طرح ہمیشہ ایسے حوالے لکھا جاتی ہے جو آپ کے لیے مفید نہ ہوں، اسی میں آپ کو یہ صحیح حدیث نظر نہ آئی، جو حدیث مذکور کی متابع ہے، اور اس کو صحت کے درجہ تک پہونچا دیتی ہیں:

((إن الله قد زوی لی الأرض، فرأیت مشارقها ومغاربها، لا تسئلوني عن شيء إلا أخبرتکم.))

(الصحیح لمسلم: کتاب الفتن واشراط الساعة۔ ۲/۳۹۰)

بے شک خدا نے میرے لیے زمین کو لپیٹ دیا کہ میں نے اس کے ہر ہر حصے کو دیکھا، اس حدیث سے استدلال یہ تھا کہ حضور فرماتے ہیں: میں جو تم پوچھو گے بتاؤں گا، عربی میں نکرہ تحت نفی مفید استغراق ہے، اس لیے حضور نے اپنے اس قول میں ہر شی کے بتانے کا دعوی

کیا ہے، اگر آپ کو علم نہ ہوتا تو حالت غضب میں ہی سہی آپ خلاف واقع دعویٰ نہ کرتے۔

میاں رحمانی نے بڑی کوشش اس بات کی کی ہے کہ حضور ﷺ نے حالت غضب میں یہ قول فرمایا تھا، اس لیے معاذ اللہ! یہ خلاف واقع بات آپ کے منہ سے نکل گئی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حضور (خاک بدہن گستاخ) کیا حالت غضب میں بھی کسی جھوٹی بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟ تو پوری تاریخ اسلام ہمیں اس کی شہادت دیتی نظر آتی ہے کہ حضور نے کبھی حالت غضب میں بھی خلاف واقع بات نہ کی۔

"عن عبد الله بن عمر قال: ((كنت أكتب كل شيء أسمعه من رسول الله ﷺ أريد حفظه، فنهي القريش وقالوا: أتكتب كل شيء ورسول الله ﷺ بشر يتكلم في الغضب والرضا، فأمسكت عن الكتاب، فذكرت لرسول الله ﷺ فأومأ بإصبعه إلى فمه فقال: أكتب فوالذي نفسي بيده ما يخرج منه إلا الحق".

(سنن أبي داؤد: ٢/١٦٣)

حضرت عبد اللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ میں ہر اس بات کو جو حضور ﷺ کی زبان اقدس سے نکلتی لکھ لیتا کہ یاد کروں گا، قریش نے مجھے منع کیا کہ تم ہر بات لکھ لیتے ہو حالاں کہ رسول اللہ ﷺ ایک آدمی ہیں جو کبھی غصہ میں کلام کرتے ہیں اور کبھی خوشی میں، تو میں یہ سن کر رک گیا اور لکھنا چھوڑ دیا، پھر حضور سے اس کا تذکرہ کیا، پس آپ نے اپنی مبارک انگلیوں سے اپنے پاک منہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: لکھ لیا کرو، قسم اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اس منہ سے تو حق ہی نکلتا ہے۔

''سوال سے منع کرنے کے لیے حالت غضب میں آپ نے ''سلونی سلونی'' فرمایا۔ جس کا مطلب کثرت سوال سے روکنا تھا، لہذا اکثرت سوال کا جواز نکلا ہی نہیں کہ کثرت اخبار ثابت ہو، اور اس سے کثرت علم پر استدلال کیا جائے''۔

ہم کہتے ہیں کہ عدم اخبار عدم علم کو مستلزم نہیں، پھر آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہم کثرت اخبار سے کثرت علم ثابت کر رہے ہیں، قبلہ ہمارا استدلال ((لا تسئلوني عن شيء الا نبأتكم)). سے ہے، سوال یہ ہے کہ یہ جملہ حضور نے علم ہونے پر کہا یا بغیر علم کے؟ اور گو حالت غضب میں ہی سہی، وہ صدیق وامین جھوٹ نہیں بول سکتا، اس لیے یہ ادعا بر بنائے علم ہے، اور

دعویٰ ہر شیء کے علم کا ہے۔لہٰذا کثرت علم ثابت،اس لیے عدم اجازت سوال کی یہ ساری موشگافیاں بقول آپ کے بادر ہوا ہیں اور آپ ان پر بھروسہ کرنے والے:

ہائے جب صیاد نے پھونکا نشیمن کو مرے جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

فاضل رحمانی ترقی کر کے کہتے ہیں،اگر ہم یہ استدلال صحیح مان لیں تو یہ قضیہ مشروطہ ہوگا،اور حضور کا یہ اخبار قیام منبر تک کے لیے،اس لیے آپ کا یہ اخبار اتنی ہی دیر ہوگا جتنی دیر آپ منبر پر رہے۔

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کی مراد اس تقریر سے کیا ہے،اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قیام منبر تک اخبار تو قیام منبر تک علم،اور جب اخبار ختم ہوتو علم ختم،اگر یہ صحیح ہے تو غالباً معاذ اللہ خدا کو بھی آپ ان علوم سے جاہل مانتے ہوں گے جن کی خبر قرآن میں اس نے دی ہے کہ اخبار ختم ہوتے ہی ان کا علم بھی ختم ہوگیا۔علاوہ ازیں اگر قیام منبر تک اخبار محدود ہے تو علم کو آپ کیسے محدود کر رہے ہیں،اس کے ثبوت کے لیے آپ کو کوئی اور دلیل لانی ہوگی،یہاں پھر وہی سوال ہے کہ کیا آپ تھوڑی دیر کے لیے حضور کو حاضر و ناظر ماننے میں کوئی حرج تصور نہیں کرتے۔

یخبر کم بما مضی و ما هو کائن:

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور ما کان و ما یکون کی خبر دیتے ہیں۔فاضل رحمانی کو اس پر یہ اعتراض ہے کہ:

مامضی میں اور ما کان میں لفظ ''ما'' عام نہیں ہے،کیوں کہ اگر عام مان لیا جائے تو لازم آئے گا کہ صحابہ کرام بھی اس علم میں آپ کے شریک ہوں،اور ان کو بھی حاضر و ناظر کہا جائے۔

نیز آیت:﴿وَ عَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ﴾[النساء : س ۴۔ت ۱۱۳] میں بھی اگر ''ما'' عام ہوتو اس آیت میں جو بندوں کے لیے ہے﴿یُعَلِّمُکُمْ مَالَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ[البقرۃ:س ۲۔ت ۱۵۱]﴾ میں بھی ''ما'' عام ہوگا۔اور اس تقدیر پر حضور اور سارے امتی حاضر و ناظر ہوں گے۔

یہ کتنی بڑی بددیانتی ہے کہ وہ بات جس کے ہم قائل نہیں اس کو ہمارے سر تھوپا جائے، ہم نے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ ما صرف عموم کے لیے ہی آتا ہے۔ہاں ہمارا یہ دعویٰ ضرور ہے کہ

آیت:﴿ وَ عَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ ﴾اورحدیث((ما مضی وما ھو کائن)) میں ما عموم کے لیے ہے، کیوں کہ ما کے بارے میں یہ اصول طے ہے کہ اصل وضع میں عموم کے لیے ہے، اوراس سے پھیرنے کے لیے قرینۂ صارفہ کی ضرورت ہے۔۔ اگر آیت﴿یُعَلِّمُکُمْ مَالَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴾میں امت کے اس اجماعی مسئلے کی وجہ سے ما عام نہیں ہے تو آیت: ﴿وَ عَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ ﴾میں اصل معنی سے پھیرنے والی کون سی چیز ہے، آپ دیکھتے نہیں ﴿ان اللہ علیٰ کل شيء قدیر ﴾میں لفظ کل کے استغراق میں خدا بھی داخل ہے حالاں کہ ﴿ان اللہ علیٰ کل شيء قدیر﴾ سے خارج ہے۔

حدیث پر آپ کا یہ اعتراض کہ لازم آئے گا کہ صحابہ کرام اور انھوں نے جن جن کو بتایا سب حاضر وناظر ہوجائیں۔ کامل عیاری اور حدیث سے عدم واقفیت اور جہالت پر مبنی ہے، عیاری تو یہ کہ بڑی چالاکی سے آپ نے صحابہ کرام کا لفظ استعمال کیا ہے، تاکہ عوام سمجھیں کہ تمام صحابہ کرام حاضر وناظر ہوگئے، اور واقعی "کم" کی ضمیر سے جمیع صحابہ کرام کا استغراق مراد لیا ہے، تو ہم کو آپ کی اس فراخ دلی پر یہ مثل یاد آتی ہے: میٹھا میٹھا ہپ ہپ، کڑوا کڑوا تھو تھو، کیوں کہ کہاں تو ما کے عموم سے انکار اور کہاں ضمیر خطاب کو لفظ استغراق بناڈالا۔ اور اگر بعض صحابہ مراد ہیں تو ان کو علم ما کان وما یکون ہے، اس سے کس کو انکار ہے، یہ حدیث صحیح کا مضمون ہے:

"عن عمر قال:((قام فینا رسول اللہ ﷺ مقاماً ، فأخبرنا عن بدأ الخلق حتیٰ دخل أھل الجنۃ منازلھم، وأھل النار منازلھم،حفظ ذلک من حفظ، نسیہ من نسیہ."(صحیح البخاري: کتاب بدء الخلق۔ ۱/ ۴۵۳)

ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ابتدائے آفرینش کے حالات بیان کرتے ہوئے یہاں تک بیان کیا کہ جنت والے اپنی جگہ اور دوزخ والے اپنی جگہ پہونچ گئے، جس نے یاد رکھا، یاد رکھا، جو بھول گیا، بھول گیا۔

"عن عمر بن أخطب الأنصاری قال: صلی بنا رسول اللہ ﷺ یوماً الفجر، وصعد المنبر فخطبنا، حتیٰ حضرت الظھر، ونزل فصلی، ثم صعد المنبر فخطبنا، حتیٰ حضرت العصر، ثم نزل فصلی، ثم صعد المنبر فخطبنا،

حتیٰ غربت الشمس ،فأخبرنا بما کان وبما ھو کائن إلی یوم القیامۃ ، فأعلمنا أحفظنا."
(صحیح لمسلم: کتاب الفتن۔۲/۳۹۰)

ایک دن حضور نے ہم کو نماز صبح پڑھائی پھر منبر پر جا کر ظہر تک بیان کرتے رہے، پھر اتر کر نماز ظہر پڑھائی اور منبر پر جا کر عصر تک بیان کرتے رہے۔ اتر کر عصر پڑھی، پھر منبر پر جا کر غروب آفتاب تک بیان کیا۔اور پورے دن میں قیامت تک ہونے والی سب باتیں بیان کردیں، اور آج ان باتوں کو سب سے زیادہ یاد رکھنے والا وہی سب سے بڑا عالم ہے۔

رہ گیا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کے علم کے برابر ہونے کا سوال، یہ ایک عام سرمایۂ جہالت ہے جو حضور کے علم پر بھی وارد کیا جاتا ہے، کہ اگر حضور ما کان و ما یکون کے عالم ہوں تو لازم آئے گا کہ آپ کا علم خدا کے علم کے برابر ہو جائے۔اب ان گم کردگان راہ کو کون بتائے کہ ما کان و ما یکون کے علاوہ اور کتنے علوم ہیں جن کو حضور جانتے ہیں اور آپ نے ان کو صحابہ کرام کو نہیں بتایا۔ یوں ہی حضور کے سارے علوم کے بعد بھی ذات الٰہی کے لیے اتنا علم بچ رہتا ہے جس کے مقابلہ میں حضور کا کل علم ذرے کے کروڑویں حصے کے برابر نہیں۔

اختصار:

یہاں تک ہم نے جن باتوں کو اہم سمجھا ہے ان کا جواب ذرا تفصیل سے دیا ہے، اور اس کے علاوہ فاضل رحمانی نے جو کچھ کہا ہے، جاہلانہ معارضوں کے علاوہ کچھ نہیں۔ اگر جلد دوم کی ساری بحث کا تجزیہ کیا جائے تو ہم کو دو قسم کے معارضے ملتے ہیں:

(ا) وہ آیات واحادیث جن میں حضور ﷺ سے علم غیب کی نفی کی گئی ہے۔ مثلاً

آیات:

﴿وَلاَ أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَآئِنُ اللّهِ وَلاَ أَعْلَمُ الْغَيْبَ﴾

[ھود:س ۱۱۔ت ۳۱]

اے حبیب کہہ دو کہ نہ تو میں اپنے پاس خزائن الٰہی ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں نہ عالم غیب ہونے کا قول کرتا ہوں۔

﴿قُل لَا يَعْلَمُ مَن فِي السموٰت والأرض الغيبَ إلا الله.لَو كُنتُ أعلَمُ الغَيبَ لأستكثرت من الخَير﴾[النمل:س ۲۷۔ت ۶۵]

اے حبیب کہہ دو کہ آسمان وزمین میں سوائے خدا کے کوئی غیب نہیں جانتا، اگر میں غیب جانتا تو بہت سی بھلائی جمع کر لیتا۔

﴿إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ﴾ [لقمان: س ۳۱ ـ ت ۳۴]

اللہ کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہ بارش نازل فرماتا ہے۔

حدیث:

((إنک لا تدري ما أحد ثوا بعدک))

(مسند امام احمد: ۱/۲۳۵)

آپ نہیں جانتے کہ ان لوگوں نے آپ کے بعد کیا کیا۔

(۲) وہ واقعات جن سے وہابی منطق میں عدم علم کا ثبوت ہوتا ہے: مثلاً:

اگر حضور حاضر وناظر تھے تو حضرت حمزہ شہید رضی اللہ عنہ کو وحشی کے حملہ سے کیوں نہ بچا لیا، یا خود حضرت عائشہ کی براُت کیوں نہ ظاہر فرمائی۔ وحی الٰہی کا انتظار کیوں کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

''خیر الانبیا'' میں فاضل مؤلف نے ان توہمات فاسدہ کے اجمالی اور تفصیلی دونوں جواب اتنے شافی دیے ہیں کہ مزید تشریح اور وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں، اور فاضل رحمانی اگر آدمی ہوتے تو شرم وحیا سے کام لیتے۔ اور جیسے پانچ سال صبر کیا اور صبر کرتے، بات آئی گئی، ہوگئی تھی، لیکن ان کو کچھ اور یداللٰہی طمانچے کھانے تھے اس لیے بول اٹھے۔ اور

بے حیا باش وہر چہ خواہی کن، پر عمل درآمد شروع کر دیا

ہم نے حتی الامکان بحث کو سمیٹنے کے لیے ساری ہفوات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، اور غیر ضروری متعلقات سے قصداً اغماض کر کے صرف مجموعی جواب پر اکتفا کی ہے، کیوں کہ ہمارا جاہل مخالف غیر ضروری تفصیل میں پڑ کر اصل مقصد پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔

آیات کے مقابلہ میں آیات:

مذکورہ بالا آیتوں کے مقابلہ میں مندرجہ ذیل آیتیں قابل ملاحظہ ہیں:

﴿وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْکَ عَظِيْماً﴾

[النساء: س ۴ ـ ت ۱۱۳]

آپ کو خدا نے وہ سب کچھ سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے، اور آپ پر خدا کا بڑا فضل

ہے۔

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾

[النحل: س ۱۶۔ت ۸۹]

ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی جس میں ہر شیء کا واضح بیان ہے۔

﴿عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَدًا. إِلَّا مَنِ ارْتَضَى مِن رَّسُولٍ﴾

[الجن: س ۷۲۔ت ۲۶، ۲۷] [الجن:س ۷۲۔ت ۲۶،۲۷ اور ۱۱۳ طرز پر]

خدا عالم الغیب ہے، اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا سوائے اپنے پسندیدہ رسول کے۔

﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ﴾

[البقرۃ: س ۲۔ت ۲۵۵]

اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِي مِن رُّسُلِهِ مَن يَشَاءُ﴾

[آل عمران: س ۳۔ت ۱۷۹]

خدا تم کو غیب پر مطلع نہیں کرتا، لیکن جس رسول کو چاہتا ہے، چن لیتا ہے۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ مذکورہ بالا آیتوں میں جس طرح علم غیب کی نفی ہے، ان آیتوں میں اس کا ثبوت ہے، اصول تطبیق کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ پہلی آیتوں میں جس غیب کی نفی ہو وہ اس کے علاوہ ہو، جو دوسری آیتوں میں حضور کے لیے ثابت ہو۔ اس امر میں (۱) ''اہل سنت'' اور ''وہابیہ'' دونوں متفق ہیں، جہاں ثبوت ہے وہاں بعض مراد ہیں اور جہاں نفی ہے وہاں کل، کیوں کہ کسی ''سنی عالم'' کے قول یا تحریر سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی سنی عالم علم خدا اور علم نبی کو برابر کہتا ہو۔

....

(۱) وہابیہ کے اقوال اس سلسلہ میں مختلف اور متعارض رہے ہیں، کبھی مطلقاً علم غیب کی نفی کرتے ہیں اور کبھی بعض علم غیب ثابت کرتے ہیں۔ منہ ۱۲۔

جہاں جہاں بھی ''اہل سنت'' نے حضور کے لیے علم غیب کا دعویٰ کیا ہے وہ جمیع ما کان

وما یکون تمام اشیاء یا بالفاظ دیگر ابتدا آفرینش سے لے کر قیامت تک ہے، پھر کون بے وقوف کہہ سکتا ہے کہ تمام اشیاء کا علم بالفاظ دیگر کل علم علم الٰہی کا بعض نہیں ہے۔[1]

مابه النزاع:

اصل جھگڑا یہ ہے کہ اہل سنت اس بعض کو جس کا ثبوت قرآن سے ہے اتنا وسیع مانتے ہیں کہ کونین کی ساری وسعت اس میں سما جائے، اور اس کی ایک سرحد وہاں سے شروع ہوتی ہے

....

[1] اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ فاضل رحمانی نے اپنی نادانی سے مولانا عتیق الرحمٰن صاحب پر اعتراض کیا ہے، کہ کہیں حضور کو جمیع ما کان وما یکون کا علم مانتے ہیں اور کہیں بعض، گویا ان بے دال کے بودم کے نزدیک علم جمیع اشیا اور علم بعض میں منافات ہے اور ان کو خبر نہیں کہ علم الٰہی غیر متناہی وعلم ما کان وما یکون اور علم کل بعض ہی ہے علم الٰہی کا جو علم کلی ہے، کیوں کہ علم الٰہی غیر متناہی وعلم ما کان وما یکون متناہی، اور متناہی غیر متناہی کا بعض ہی ہوتا ہے۔

دیکھو امام رازی تفسیر کبیر میں تحت آیت:

﴿وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا﴾

کے فرماتے ہیں:

"قلنا: لا شك أن إحصاء العدد إنما يكون في المتناهي، فأما لفظة ﴿كل شيء﴾ فإنها لا تدل علىٰ كونه غير متناه؛ لأن الشيء عندنا هو الموجودات، والموجودات متناهية في العدد،

احصاء فی العدد متناہی میں ہوتا ہے، اور لفظ "کل" "شی متناہی ہے، کیوں کہ شی موجودات ہیں، اور موجودات متناہی ہیں، پھر یا تو علم الٰہی کو متناہی مانو، یا علم "کل شی" کا علم الٰہی کا بعض۔

بندہ پرور!

ہنوز طفلی واز نوش ونیش بے خبری ... چہ علم خویش کہ از جہل خوش بے خبری

ہم آپ کو آگاہ کرتے ہیں کہ علم کل یا علم بعض ایک ہی چیز ہے، جو حضور کی صفت ہے اور علم کلی اور ہے، جو صفت خدا ہے۔ ۱۲۔

حاشیہ ختم

جہاں سے وجود کی ابتدا ہوتی ہے، اور دوسری سرحد وہاں ختم ہوتی ہے جس پر اس کائنات کی عمر ختم ہوتی ہے، برخلاف اس کے اہل نجد و وہابیت ان چند جزئیات کا علم مانتے ہیں، جن کا ذکر حدیث کی کتابوں میں ہے، یا کچھ اس کے علاوہ بھی، باقی (معاذ اللہ) حضور کو اپنے خاتمے کی خبر نہیں، دیوار کے پیچھے کا علم نہیں، اپنی ازواج کی پاک دامنی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں، آپ کے امتی جو کچھ کریں خواہ نیک خواہ بد اس سے آپ کو کچھ مطلب نہیں۔ (وغیرہ ذلک من الخرافات) مزید برآں وہ چند باتیں بھی اب غیب نہیں رہ گئیں، کیوں کہ جو چیز بتادی جائے وہ غیب نہیں، اس لیے رسول اللہ کو سرے سے غیب کا علم ہی نہیں۔

مقام غور:

علمائے اہل سنت کا قول ہے کہ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ حضور کو چند باتوں کا علم تھا، تطبیق تام نہیں ہو جاتی، اس لیے کہ جن آیات سے ثبوت علم ہے ان میں ﴿تبیاناً لکل شیء﴾ اور ﴿وعلمک مالم تکن تعلم﴾ آیا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس بعض کو اتنی وسعت دی جائے کہ تمام اشیا ان میں آجائیں، رہ گیا اس پر یہ سوال کہ لازم آئے گا کہ خدا اور نبی کا علم برابر ہو جائے، تو یہ فقدان بصیرت کی پیداوار ہے، کیوں کہ بے شمار فرق، خدا اور بندے میں موجود ہیں۔ بندے کا علم متناہی کہ ابتدائے آفرینش سے انتہائے دنیا تک ہے، اور خدا کا علم غیر متناہی، جس کی کوئی ابتدا اور انتہا نہیں، خدا کا علم قدیم، بندے کا علم حادث۔ بندے کا علم عطائی، خدا کا علم ذاتی۔ بندے کا علم حصولی کہ پہلے نہ تھا غیر سے حاصل کیا اور حصول کے بعد بھی ذہول ممکن، خدا کا علم حضوری کہ طرفۃ عین کے لیے بھی اس کے علم سے کوئی چیز غائب نہیں۔ پھر ان تمام امتیازات کے باوجود کون بے وقوف ہوگا جو خدا اور بندے کا علم یکساں اور برابر بتائے گا، اس لیے علم ماکان و مایکون ماننے پر بھی کوئی استحالہ لازم نہیں آتا۔

غیب تعلیم کے بعد بھی غیب ہی رہتا ہے:

ہاں یہ خیال کہ تعلیم کے بعد علم غیب شہادت ہو جاتا ہے، غیب نہیں رہتا، اندھے کی لاٹھی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، کیوں کہ اس کی تائید آیت یا حدیث یا لغت وغیرہ سے نہیں ہوتی، برخلاف اس کے قرآن بار بار انہی واقعات کو جن کی تعلیم کر چکا ہے: ﴿من أنباء الغیب

نوحیه الیک ﷺ کہہ کر اعلان کرتا ہے کہ تعلیم کے بعد بھی وہ غیب ہی رہتا ہے۔

علم غیب اور معجزہ میں منافات نہیں:

امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: النبي هو المطلع على الغيب. نبی مطلع علی الغیب کو کہتے ہیں،

اور لغت میں نبی کے یہی معنی ہیں، ان امور کی روشنی میں یہ خیال کتنا احمقانہ ہے کہ بتا دینے کے بعد غیب نہیں رہ جاتا، اور اس سے بھی بڑی جہالت یہ ہے کہ حضور نے جن امور کی خبر دی وہ علم غیب نہیں بلکہ از قسم معجزہ ہے، گویا علم غیب اور معجزہ میں منافات ہے کہ کوئی معجزہ علم غیب نہیں ہوسکتا۔ اور کوئی غیب معجزہ نہیں ہوسکتا، حالاں کہ ہر خرق عادت جس کا ظہور نبی سے ہو لغۃً معجزہ ہے، اور غیب کی خبر دینا ضروری خرق عادت ہے۔ ہم فاضل رحمانی کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ کہیں سے بھی خرق عادت یا معجزہ اور علم غیب میں منافات ثابت کریں، اور اپنے مولوی ہونے کی لاج رکھ لیں ورنہ سوچ سمجھ کر بولنے اور لکھنے کی عادت ڈالیں۔[1]

....

[1] علم غیب کی یہ بحث ناقص رہ جائے گی اگر فاضل رحمانی کی ان وحشت اثر وارفتگیوں کا حال مذکور نہ ہوگا جو انتہائی پاگل پنے میں ان سے سرزد ہوگئی ہیں۔ تردید حاضر و ناظر صفحہ ۲۳ پر لکھتے ہیں، نبی صاحب نبوت کو کہتے ہیں، جس کے معنی ہیں غیب کی خبر دینا، اس کے بعد حوالہ نقل کر کے لکھتے ہیں، پس نبی کے معنی ہوئے غیب کی خبر دینے والا۔ اب تعریف ملاحظہ ہو:

تفسیر کبیر میں ہے:

"قول جمهور المفسرين: إن الغيب هو الذي يكون غائباً عن الحاسة."

اور بیضاوی میں ہے:

"الخفي الذي لا يقتضيه بداهة العقل."

فاضل رحمانی کی اتنی عبارت جو دیکھے گا اس سے یہی مطلب نکالے گا کہ نبی غیب کی خبر دینے والا اور غیب کا عالم ہے، نیز یہ بھی کہ غیب اسی کو کہتے ہیں جو حاسہ سے غائب ہو اور جس کو بداہت عقل نہ جان پائے۔

آیات کی بحث

مذکورہ بالا اصول کو مدنظر رکھ کر مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے بھی ان آیتوں میں جہاں

....

یہاں تک بات صحیح کی لیکن اس کے فوراً ہی بعد بے ایمانی کی رگ جو پھڑکی تو اپنی طرف سے ایسا اضافہ کیا جو ان کی نقل کردہ تصریحات کے خلاف ہے، فرماتے ہیں: ''جو بتانے سے معلوم ہو وہ غیب نہیں'' اس عبارت میں اور اس سے پہلی عبارت اور حوالوں میں صاف تعارض موجود ہے کہ پہلی عبارت سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ نبی غیب کی خبر دیتا ہے، اور اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ نبی کو جو چیز بتانے سے معلوم ہو وہ غیب نہیں ہے، پھر نبی غیب کی خبر کیسے دے گا، نیز اوپر کے حوالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غیب ہر وہ چیز ہے جو عالم سے غائب ہو۔ اور بداہت عقل جس کو نہ معلوم کر سکے، اور اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی چیز اگر چہ عقل سے نہ معلوم ہو اور اگر چہ غائب عن الحاسۃ ہو یا بالفاظ دیگر بھلے ہی غیب کی تعریف اس پر صادق آتی ہو، لیکن جہاں خدا نے بذریعہ وحی اس کی تعلیم دی وہ غیب نہیں رہی۔ اب اس کا فیصلہ ہم علامہ رحمانی ہی پر چھوڑتے ہیں کہ امام رازی اور بیضاوی کی تعریف صحیح ہے یا آپ کی؟ آپ نے اپنی متاخر الذکر عبارت کے ثبوت میں قرآن کی آیت سے بھی کھیلنے کی جرأت کی ہے، اور عالم بے خبری میں اس تعارض کو اور سنگین بنا دیا، فرماتے ہیں: ﴿عالم الغیب فلا یظھر علیٰ غیبه أحداً الا من ارتضیٰ من رسول.﴾

خدا معلوم اس آیت سے اس امر پر کس طرح استدلال کیا جا سکتا ہے کہ جو بتانے سے معلوم ہو وہ غیب نہیں۔ بلکہ اس سے تو یہی واضح ہے کہ خدا اپنے ہی غیب پر انبیا کو مطلع کرتا ہے۔

تفسیر بیضاوی سورۃ الجن میں ہے:

﴿فلا یظھر علیٰ غیبه﴾ علی الغیب المخصوص به علمه﴿ الا من ارتضیٰ﴾ بعلم بعضه حتیٰ یکون له معجزة. خدا اپنے مخصوص غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا مخصوص رسولوں کے سوا کہ بطور معجزہ ان کو بعض کی اطلاع دیتا ہے، اور اگر بالفرض فاضل رحمانی کا یہ استدلال مان بھی لیا جائے تو ان کو ان دو باتوں میں سے ایک کو صحیح ماننا ہوگا، اور دوسری کو غلط، یا تو یہ کہیں کہ نبی غیب کی خبر نہیں دیتا۔ یا یہ کہیں کہ جو بتانے سے معلوم ہوتا ہے وہ بھی غیب ہے، اور یہ

بظاہر علم غیب کی نفی نکلتی ہے، مذکورہ بالا تطبیق اور بعض دیگر تاویلات جو علماے تفسیر نے بیان کی تھیں، ''خیر الانبیاء'' میں تحریر فرمایا، مثلاً وہ فرماتے ہیں: کہ ان تمام آیتوں میں جہاں علم کی غیر خدا

....

دونوں ان کے لیے زہر ہے۔

دو گونہ رنج وعذاب است جان مجنوں را

''پھر اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ تفسیر کبیر کے حوالہ سے جمہور کی تعریف نقل کر کے اس کے برخلاف ایک اور تفسیر آپ نے نقل کی ہے، فرماتے ہیں:

''الغيب مالم يقم عليه دليل، ولا أطلع عليه مخلوق.''

غیب وہ جس پر نہ کوئی دلیل قائم ہو، اور جس کو کوئی مخلوق نہ جانتا ہو، ان دونوں تعریفوں میں جو تعارض ہے وہ بھی فاضل رحمانی کی جان کو رو رہا ہے، عجیب مذاق ہے:

تعارض کے پیچھے تناقض کا شور تناقض کی دم میں تعارض کی ڈور

حقیقت یہ ہے کہ علم غیب کی دو قسمیں ہیں: مالا دلیل علیہ اور ما دلیل علیہ، چنانچہ فاضل رحمانی نے تفسیر کبیر سے غیب کی جو تعریف نقل کی ہے اس کے آگے ہی یہ ٹکڑا تھا: ''ثم هذا الغيب ينقسم إلى ما عليه دليل وإلى مالا دليل عليه.'' یعنی غیب کی دو قسمیں ہیں: ایک تو وہ جو بتائی جائیں اور ایک وہ جو خدا کسی کو نہیں بتاتا، لیکن چوں کہ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ جو غیب بتانے سے معلوم ہو وہ بھی غیب ہی ہے اس لیے ''خیر الانبیا'' میں پوری عبارت ہونے کے باوجود اس کو ایسا ہضم کر گئے کہ ہفتوں کے بھوکے ہوں۔ لیکن یہ نگلتی ہوئی ہڈی آنت میں پھنس گئی، اور باہم دو تعریفوں میں تعارض ہو گیا۔ حالاں کہ اگر تفسیر کبیر کی پوری عبارت نقل کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ دوسری عبارت اس غیب کی ہے جس پر کوئی تعریف دلیل نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، اس غیب کی نہیں جس پر دلیل ہو جو انبیا و اولیا کا حصہ ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ غیب کی ایک قسم وہ بھی ہے جو بتلانے ہی سے معلوم ہوتی ہے، اور یہ ہوائی قطعاً جھوٹ ہے ''جو بتانے سے معلوم ہو وہ غیب نہیں'' وہابیہ خذلہم اللہ جب تمام حربوں سے عاجز آجاتے ہیں تو عوام کو گمراہ کرنے کے لیے کہہ دیتے ہیں، جو بتانے سے معلوم ہو وہ غیب نہیں''۔

حاشیہ ختم

سے نفی ہے "ذاتی علم" مراد ہے، اور بعض جگہیں ایسی ہیں جہاں حضور نے تواضعاً اپنے سے علم غیب کی نفی کی ہے، اور کچھ مقامات سے عدم علم کا ثبوت ہوتا ہی نہیں، بلکہ "عدم دعویٰ" اور "عدم قول" اور نہ تو عدم دعویٰ مفید عدم علم ہے، نہ عدم قول اور ساتھ ہی ان کتابوں کے حوالے بھی دے دیے تھے جہاں سے ان کو نقل کیا تھا، اگر ان تاویلات میں کوئی سقم تھا تو ان مفسرین کی بھی کوتاہی تھی لیکن فاضل رحمانی نے اپنی جہالت کے زعم میں لایعنی اعتراض سے صفحے کے صفحے سیاہ کرڈالے ہیں، ہم ذیل میں فاضل مذکور کے اعتراضات اور ان کے جوابات نیز جہاں سے یہ تاویلات نقل کی گئی تھیں، ان کے حوالے لکھتے ہیں تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ ہمارے مخالف نے اپنی جہالت سے تفسیروں کا بھی مذاق اڑانے کی کوشش کی ہے۔

ذاتی اور عطائی:

فاضل رحمانی کو ذاتی اور عطائی کے فرق پر یہ اعتراض ہے کہ یہ تفریق بے معنی ہے، کیوں کہ آیت: ﴿وَلَوْ كُنتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ [س ۷. ت ۱۸۸]﴾ کے معنی اس تقدیر پر یہ ہوں گے اگر میں علم غیب ذاتی جانتا تو بھلائی جمع کرتا، اور مجھ کو برائی نہ پہونچتی، حالاں کہ کسب خیر اور عدم مسیس ضرر کے لیے مطلقاً علم کی ضرورت ہے، علم ذاتی اور عطائی کو اس میں کچھ دخل نہیں، کیوں کہ جس طرح ایک شخص بوعلی سینا کی کتاب کا ذاتی علم رکھ کر مرض کو دفع کر سکتا ہے اسی طرح عطائی رکھنے والا بھی، اس سے معلوم ہوا کہ ذاتی اور عطائی کی تفریق بے کار ہے۔

ایں گل دیگر شگفت:

یہ بحث فاضل رحمانی کی بے نور آنکھوں کو کچھ ایسی بھائی کہ اپنی کتاب میں بار بار اس کا اعادہ کیا ہے، اور ایک جگہ تو نشہ میں آکر فرماتے ہیں: کہ اسی طرح تم پوجا بھی کرو اور کہہ دو کہ حضور الہ اور معبود بالعطاء اور ان کی خدائی عطائی ہے۔

اب تک تو یہ سنا تھا کہ وہابیوں کا خدا جھوٹ ہی بول سکتا ہے لیکن آج سے معلوم ہوا کہ ان کا خدا اپنی خدائی بھی دوسروں کو دے سکتا ہے، سبحان اللہ یہ علم اور تحقیق مسائل کا حوصلہ، آپ کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ معبود بالعطاء ممکن ہوگا، اور جو ممکن ہے وہ معبود نہیں، یا بالفاظ دیگر خدا کا اپنی

خدائی دوسروں کو دینا محال ہے، وہ اپنی خدائی کسی کو دے ہی نہیں سکتا، اس لیے بالذات اور بالعطاء کی بحث وہاں پیدا ہی نہیں ہوسکتی بندہ پرور کچھ دن اور پڑھیے۔

بہرحال فاضل رحمانی کو ذاتی اور عطائی کے فرق سے انکار ہے۔ برخلاف اس کے علامہ ''خفاجی'' شرح شفاء میں، علامہ ''مناوی'' شرح جامع صغیر میں۔ ''شیخ ابن قاضی'' جامع الفصول میں ''علامہ بیضاوی'' اپنی تفسیر میں ''شیخ محمد شنوانی'' حاشیہ مختصر ابن جمرہ میں، امام رازی'' اپنی تفسیر میں اور علامہ نیشاپوری اپنی تفسیر میں تصریح کرتے ہیں کہ:

''فیه دلالة علیٰ أن الغیب بالاستقلال لا یعلمه إلا الله.''

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ غیب کا علم ذاتی سوائے خدا کے کسی کو نہیں۔

لیکن فاضل رحمانی کو ان تفسیروں اور اقوال کی کیا پرواہ، ان کو تو اپنی ابن سینا والی اچھوتی دلیل اور مثال پر ناز ہے، اس لیے ہم اس کی بھی خبر لیتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ ان کے دماغ میں گودا ہی نہیں یا دانستہ عقل وہاں کوچ کر جاتی ہے جہاں ان کی طرف پانی مرتا ہے، کیوں کہ خود انہیں کے قول کے مطابق ابن سینا کی کتاب سے فائدہ حاصل کرنا اور مرض سے بچنا، اگر ان کے علم ذاتی پر موقوف نہیں تو کسب خیر اور عدم مسیس ضرر کا علم غیب ذاتی پر موقوف نہ ہونا کہاں سے نکل آیا، کیوں کہ خود انہیں کا قول ہے: الجزئی لا یکون کاسباً ولا مکتسباً . نیز یہ شاہ کار جہالت بھی قابل ملاحظہ ہے، کہ مرض کے علم اور ابن سینا کی کتاب کے پیدائشی علم کو علم ذاتی بنا ڈالا، حالاں کہ کسی مخلوق کو کسی بھی چیز کا علم ذاتی نہیں ہوسکتا، اور ان کی اس تقریر پر تو تمام الہامات علم ذاتی ہوگئے۔ انا لله وانا الیه راجعون۔

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا کار طفلاں خراب خواہد شد

آیت میں علم ذاتی ہی مراد ہے:

حقیقت یہ ہے کہ اگر ذرا بھی دقت نظر سے کام لیا جائے تو یہ امر واضح ہو جائے گا کہ کسب خیر اور عدم مسیس ضرر کا لزوم علم ذاتی کے ساتھ ہی ہے علم عطائی کے ساتھ ہرگز نہیں، کیوں کہ علم عطائی تو ایسا ہے کہ کہیں اس کے مقتضا پر عمل ہوتا ہے، اور کہیں نہیں، لیکن علم ذاتی ہی وہ شی ہے جس کے مقتضی ہی پر ہمیشہ عمل ہوتا ہے ... کہ تم علم ... ہیں، ایک شخص کے راستہ

میں سانپ تھا، اس کو علم نہ تھا، کسی نے بتایا وہ یہاں بچ گیا، یہاں علم عطائی کے مقتضی پر عمل ہوا۔ دوسرے شخص کو جلاد باندھ کر بادشاہ کے حکم سے قتل گاہ کی طرف لے چلا۔ باوجودے کہ اس کو اپنے قتل ہونے کا علم وقوع سے پہلے ہے اور بسا اوقات مہینوں پہلے بھی اس کا علم حاصل ہوتا ہے، لیکن وہ اس علم کی بنا پر قتل ہونے سے نہیں بچ سکتا، یہاں علم عطائی کے مقتضی پر عمل نہیں ہوا۔ بخلاف اس کے ذاتی علم ہر شئی کا صرف خدا کو ہے، اس لیے کوئی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ کسی امر میں (معاذ اللہ) خدا کو ضرر پہونچا، یا اس کا کوئی کام خیر سے خالی ہوا۔ بنا بریں یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ کسب خیر اور عدم مسیس ضرر علم ذاتی ہی کو لازم ہے، اس لیے آیت میں علم ذاتی کی ہی نفی ہے۔ ورنہ "لو" کی شرط و جزاء میں لزوم باقی نہ رہے گا جو ضروری ہے۔

اعجاز و بلاغت اور ذاتی و عطائی:

فاضل رحمانی کی یہ جہالت بھی خوب رہی کہ آیت میں علم ذاتی مراد لینے سے قرآن کے اعجاز و بلاغت میں فرق پڑ جائے گا، کیوں کہ خازن میں اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ کفار نے آپ سے کہا:

"الا یخبرک ربک بالسعر الرخیص من قبل أن یغلو و بالأرض التي ترید أن تجدب فترحل الی ما قد اخضب."

یعنی آپ کا پروردگار کیوں آپ کو چیزوں کا بھاؤ بڑھنے سے پہلے اور خشکی آنے سے پہلے اطلاع نہیں دیتا کہ آپ وہاں سے کوچ کر جائیں۔

اس کے جواب میں یہ فرمایا کہ میں غیب ذاتی نہیں جانتا نہایت مہمل ہے؛ کیوں کہ کفار کا سوال علم ذاتی کے بارے میں تھا ہی نہیں وہ تو مطلقاً علم سے سوال کرتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عظیم فاضل جھنڈے نگری سے پوچھ پوچھ کر نازل ہوتا تھا، کہ دیکھیے آپ کے خود ساختہ معیار بلاغت پر پورا اترتا ہے یا نہیں؟ اولاً فاضل رحمانی کی اس تقریر کا دارومدار اس بات پر ہے کہ یقینی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ اس آیت کا شان نزول کافروں کا مذکورہ بالا سوال ہے، حالاں کہ فاضل رحمانی نے مذکورہ شان نزول کی کوئی سند پیش نہیں کی ہے۔ اور جب تک یہ ثابت نہ کر دیں ہماری توجیہ پر اعجاز بلاغت کی حیثیت سے اعتراض بالکل بے معنی اور انتہائی جہالت ہوگا۔

چاہ کن را چاہ درپیش:

اور اگر ہم اس شان نزول کو جوں کا توں تسلیم بھی کرلیں تو فاضل رحمانی کی الٹی آنتیں گلے میں آجائیں گی، اور جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔ کیوں کہ سوال کے الفاظ یہ ہیں: ''ألا یخبرک ربک '' اے رسول آپ کو آپ کا رب کیوں نہیں بتاتا۔ جواب یہ ہے کہ اگر میں غیب جانتا تو بھلائی جمع کر لیتا۔ ظاہر ہے کہ اس سوال و جواب میں کوئی مطابقت نہیں، اس طرح جو دلدل آپ نے ہمارے لیے تیار کی تھی خود ہی اس میں کمر تک پھنس گئے۔

ثبوت بلاغت:

اور اگر آپ کو بلاغت ہی کا شوق ہے تو سنیے: کفار نے حضور کی غیب ذاتی پر طنز کیا کہ اگر آپ غیب جانتے ہیں تو اتنی بات خدا سے کیوں نہیں پوچھ لیتے کہ کب بھاؤ سستا ہوگا اور کب مہنگا، کہاں فراخ سالی ہوگی اور کہاں قحط پڑے گا، تاکہ تم اوروں کی طرح ان حادثات کے وقت مصیبت میں نہ رہو، تمہارے غیب جاننے کا کیا فائدہ، تم جو عالم ہو اور ہم جاہل ہیں، دونوں نفع ونقصان میں بسا اوقات برابر ہوتے ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ آپ غیب جانتے ہی نہیں، خواہ مخواہ آسمانی خبروں کا دعویٰ کرتے ہیں، کفار کا حضور کے علم پر یہ اعتراض اسی قسم کا ہے جیسا آج کل کے وہابی کرتے ہیں، کہ اگر حضور عالم غیب تھے تو وہ فلاں مصیبت سے کیوں نہیں بچے، اس پر حضور نے قرآن کے الفاظ میں جواب دیا کہ یہ ملازمہ تو صرف علم ذاتی کا حاصل ہے کہ کبھی کسب خیر اور عدم مسیس ضرر سے جدا نہیں ہوتا، اور میں علم ذاتی کا مدعی نہیں، میں تو علم عطائی کا دعویٰ کرتا ہوں، جو قضاؤ قدر کے تابع ہے، اس لیے تمہارا میرے علم پر اعتراض بے جا ہے، ہاں اگر یہ خبریں ذاتی طور پر جانتا تو البتہ بھلائی جمع کر لیتا، اور ہر ضرر سے بچتا۔

ایک اور سوال کا جواب:

یوں ہی قیامت کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے، کیوں کہ قتادہ کے قول کی بنا پر قریش اپنی رشتہ داری کا واسطہ دے کر قیامت کا وقت پوچھنا چاہتے تھے، حضور نے جواب دیا کہ اس کا علم ذاتی تو خدا ہی کے پاس ہے، جو اس میں تصرف کر سکتا ہے کہ بتلا دے، ہم زیادہ سے زیادہ اس کے امین اور تابع فرمان ہیں، اور جب حضور نے علم ذاتی کو خدا کی طرف منسوب فرمایا تو گویا

آپ نے یہ بھی فرمادیا کہ جانتے ہوئے بھی تم کو قیامت کی خبر نہیں دے سکتا، کیوں کہ صاحب علم عطائی بغیر عطا کنندہ کے حکم کے اوروں کو نہیں بتایا کرتا۔ پس یہیں سے یہ سوال بھی ختم ہو گیا کہ جب کفار کے جواب میں حضور نے یہ کہا کہ مجھ کو ذاتی علم نہیں تو کفار پلٹ کر یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم کو ذاتی عطائی سے بحث نہیں ہم کو تو قیامت کا علم چاہیے، کیوں کہ علم ذاتی کا انکار وہی تعلیم سے معذوری ظاہر کرنا ہے۔

دوسرا جواب:

اور بالفرض مان لیں کہ جواب سوال میں مطابقت نہیں لیکن اس سے کلام الٰہی کی بلاغت میں فرق نہ سمجھے گا، مگر وہ جس کے آنکھ پر وہابیت کا دبیز پردہ پڑ گیا ہو، کیوں کہ علم بلاغت کی پہلی درسی کتاب ''تلخیص المفتاح'' اور اس کی شرح ''مختصر المعانی'' میں ہے:

''تلقي السائل بغير ما يتطلب بتنزيل سواله منزلة غيره، (أي: غير ذلک السوال) تنبيهًا (للسائل) على أنه أي: (ذلک الغير) الأولىٰ بحاله أو المهم له كقوله تعالىٰ: ﴿يسئلونک عن الأهلة﴾ الخ. (تلخيص: ۲۰)

اور سائل کو اس کے سوال کے خلاف جواب دینا اس کے سوال کو دوسری چیز کے قائم مقام کرتے ہوئے، سائل کو تنبیہ کرنے کے لیے، کہ وہ غیر ہی اس کے لائق ہے، یا اہم، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں چاند کی حقیقت پوچھنے والوں کے جواب میں اس کے فوائد گنائے۔

جس سے معلوم ہوا کہ کبھی سوال کے خلاف جواب دے دیا جاتا ہے جو سائل کے مناسب اور اہم ہوتا ہے، بہت ممکن ہے کہ قرآن نے علم ذاتی کی نفی ہی یہاں اہم اور سائل کے مناسبت حال سے قرار دی ہو، کیوں کہ کفار، کاہنوں وغیرہ کے لیے علم ذاتی ہی کے قائل تھے، بہر حال علم ذاتی کی نفی ماننے پر بھی بلاغت قرآن میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

تواضع کا مطلب:

مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی اس تاویل کا جواب دیتے ہوئے کہ بعض آیتوں میں تواضعاً علم کی نفی کی گئی ہے، فاضل رحمانی کہتے ہیں:

(۱) آیت: ﴿قل لا أقول لكم عندي خزائن الله ولا أعلم الغيب﴾

[الأنعام: س ٦۔ ت ٥٠]

کے تحت علامہ خازن نے یہ لکھا ہے: ان چیزوں کی نفی حضور نے اپنی ذات سے تواضعاً کی ہے، جیسا کہ ''خیر الانبیا'' میں تحریر ہے، اگر حضور سے علم کی نفی تواضعاً کا مطلب یہ ہو کہ عالم تو تھے مگر از راہ تواضع اپنی ذات سے علم کو دور فرمایا، تو یہ لازم آئے گا کہ فرشتہ ہونے کی نفی بھی حضور نے تواضعاً ہی کردی ہو، اور حقیقت میں آپ فرشتہ ہوں، حالاں کہ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔

(۲) نیز یہ جواب کفار کے چیلنج کے مقابلہ میں ہے، پس یہ بات قطعاً سمجھ میں آنے والی نہیں ہم تو بار بار آپ کی غیرت اور علم کو چیلنج کریں اور آپ انکساری اور تواضع سے ہماری بات کا جواب نہ دیں، بلکہ اپنے عجز کا اعتراف کریں، یہی موقع تو اسلام کی شوکت ظاہر کرنے کا تھا۔

یہ بحث بڑی طویل ہے کہ اگر کسی آیت کی مختلف ٹکڑوں کی اگر کوئی عام تاویل کی جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہر ٹکڑے میں کامل یکسانیت اور ہم آہنگی ضروری ہے یا نہیں، اور علامہ خازن نے آیت: ﴿لا أعلم الغيب﴾ میں اگر غیب وغیرہ کی نفی تواضعاً کی، دیگر ٹکروں میں بھی یہی لینا پڑے گا یا نہیں؟ اس لیے طویل راستے سے قطع نظر کر کے علامہ خازن کی عبارت سے یہ بصراحت ثابت کرتے ہیں کہ انہوں نے علم غیب کی تواضعاً نفی کے بھی یہی معنی لیے ہیں کہ حضور علیہ ﷺ کو علم غیب تھا، لیکن تواضعاً نفی کی۔

آیت: ﴿ولو كنت أعلم الغيب﴾ کے ماتحت بیان فرماتے ہیں:

''فإن قلت: قد أخبر ﷺ عن المغيبات وقد جاء ت أحاديث في الصحيح بذلك وهو من أعظم معجزاته ﷺ، فكيف الجمع بينه وبين قوله: ﴿ولو كنت أعلمُ الغيب لاستكثرت من الخير﴾، قلت: يحتمل أن يكون قاله ـ صلى الله تعالىٰ عليه وسلم ـ علىٰ سبيل التواضع والأدب''

(تفسیر خازن: آیت ۱۸۸ـ۲/۲۸۰)

اگر تم اعتراض کرو کہ حضور نے غیب کی خبر دی، پھر اس آیت اور ان احادیث میں جن میں اخبار بالغیب ہے تطبیق کیسے ممکن ہے، جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اس کو حضور نے ادباً اور تواضعاً کہا ہو۔

یہاں اس اعتراض کا جواب دے رہے ہیں کہ حضور غیب جانتے ہیں پھر کیوں قرآن نے آپ سے غیب کی نفی کی، اور یہ اعتراض اس بات کو مان کر کیا گیا ہے کہ حضور کو علم غیب تھا، اور

علامہ نے اس اصل کو تسلیم کر کے ہی جواب دیا ہے، اس لیے تواضعاً نفی علم کا مطلب ہی یہ ہوگا کہ علم غیب جانتے ہوئے ہی نفی کی ہے، اب فاضل رحمانی کو اختیار ہے کہ اس تصریح کے بعد بھی انکار ہی کرتے چلے جائیں، یا کچھ بھی شرم وحیا کا لحاظ کریں، اور اعتراف کریں کہ تواضعاً علم کی نفی کا مطلب علامہ خازن کے نزدیک انکار بر بنائے علم ہی ہے۔

نامعقول اپج:

یوں ہی چیلنج کے موقع پر تواضعاً علم سے انکار کو بھی نازیبا کہہ کر انکار کرنا فاضل رحمانی کی نامعقول اپج ہے، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جب چیلنج کیا جائے، اس وقت بہر نوع جواب دینا ضروری ہے، اگر قدرت کے باوجود جواب نہ دیا تو نازیبا ہے، لیکن اس اندھے کو یہ نہ معلوم ہوا کہ بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی، کیوں کہ خود اسی فاضل کے قول کے مطابق کفار نے حضور سے یہ سوال کیا: ﴿ألا یخبرک ربک﴾ یہ سوال حضور کے واسطے سے خدا سے ہی تھا کہ تمہارا رب تم کو آیندہ باتوں کی اطلاع کیوں نہیں دیتا، کم از کم خدا کے بارے میں یہ تو سبھی مانتے ہیں کہ خدا حضور کو آیندہ کی خبروں کے بتانے پر قادر ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کفار کے اس چیلنج کے جواب میں خدا بھی وہی نازیبا (معاذ اللہ) بات کرتا ہے کہ چیلنج کے موقع پر قدرت کے باوجود حضور کا آیندہ کی خبروں کا علم نہیں دیتا، بلکہ اور اس کا اعتراف کرواتا ہے کہ ہم کو علم نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب جاہلانہ اور دماغی عیاشیاں ہیں، اور ہر معقول بات کے جواب میں فاضل رحمانی کی طرح نامعقول باتیں کہی جاتی ہیں، نامعقولیت کا دروازہ تو کبھی بھی بند نہیں ہوسکتا۔

عدم دعویٰ اور عدم قول:

مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی اس تاویل (کہ آیت: ﴿لا أقول لکم﴾ میں قول اور دعوے کی نفی کی گئی ہے نہ کہ علم کی) پر فاضل رحمانی کی خامہ فرسائی کا خلاصہ یہ ہے کہ "حضور کہتے ہیں: نہ تو میں کسی غیب ذاتی کا قول کرتا ہوں، نہ خزائن اللہ کے مالک ہونے کا" پس ہم کو بھی لازم ہے کہ ایسا قول نہ کریں۔

یہاں قابل لحاظ بات یہ ہے کہ عدم دعویٰ، عدم علم اور وجود علم دونوں ہی شکلوں میں ہوسکتا ہے، لیکن اگر صرف یہی آیت ہوتی تو عدم دعویٰ بر بنائے عدم علم مان کر ہم فاضل رحمانی کی

یہ بزرگانہ نصیحت تسلیم کر لیتے کہ ہم بھی آپ کے لیے علم غیب کا دعویٰ نہ کریں اور جب اس کے مقابل: ﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ﴾، ﴿نَزَّلْنَا عَلَيْكَ تِبْيَاناً لِكُلِّ شَيْءٍ﴾. بھی موجود ہے، اور جب قرآن بار بار آپ کو صاحب علم غیب کہتا ہے تو پھر اس کے علاوہ اور چارۂ کار کیا رہ جاتا ہے کہ عدم دعویٰ بر بنائے انکسار ہے، مگر فاضل رحمانی تو اس قدر عقل سے اندھے ہیں اور ان کا یہ اندھا پن اتنا کارآمد ہے کہ جہاں ان پر زد پڑی، آنکھیں چوپٹ ہو گئیں، اور جہاں کوئی مفید بات نظر آئی تو آسمان تک نظر آنے لگا، ورنہ یہ بابت بڑی واضح ہے کہ علم غیب کا ثبوت جن آیتوں سے ہوتا ہے یہ آیات بظاہر اس کے خلاف ہیں، اور اس ظاہری تعارض کو دفع کرنے کے لیے علما نے مختلف تاویلیں کی ہیں، جن میں ایک یہ بھی ہے، اس آیت میں عدم دعویٰ اور دوسرے میں ثبوت۔ اور عدم دعویٰ ثبوت کے منافی نہیں ہے، یہ کوئی الگ مستقل دلیل نہیں کہ اس میں احتمال پیدا کر دینے سے ہمارا استدلال ہی ختم ہو جائے، استدلال تو آیات مثبتہ سے ہے۔

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا:

فاضل رحمانی کو اس بات کا اعتراف ہے کہ ”آیت ﴿لا أعلم الغيب﴾ دعویٰ علم غیب کے معارضہ کے طور پر پیش کی گئی تھی“ تردید صفحہ ۱۶ اور ۷ میں اقرار کرتے ہیں کہ آیت مذکورہ میں ”حضور سے جس علم کی نفی ہے، وہ رفع ایجاب کلی یعنی ایسا علم ہے کہ اس سے غیب کا کوئی فرد خارج نہ ہو“۔ اور جن آیتوں میں ثبوت علم ہے وہاں بعض مراد ہے، اور کل کی نفی بعض کے ایجاب کے منافی نہیں، اس لیے دونوں آیتوں میں کوئی اختلاف نہیں!)

فاضل رحمانی کے مذکورہ بالا دونوں اعتراضوں سے دو باتیں واضح ہوئیں۔

(۱) علمائے اہل سنت کے دعویٰ علم غیب کے مقابلہ میں آیت: ﴿لا أعلم الغيب﴾ پیش کی گئی ہے۔

(۲) اور اس آیت میں بعض علم کی نہیں بلکہ کل علم کی نفی ہے، اگر بعض علم کا ثبوت کہا جائے تو آیت سے استدلال عدم علم پر غلط ہوگا۔ اور گزشتہ صفحات میں ہم یہ واضح کر آئے ہیں کہ علمائے اہل سنت بعض علم غیب کے ثبوت ہی کے قائل ہیں، ہاں وہ بعض اتنا وسیع ہے کہ ابتدائے آفرینش سے اختتام دنیا تک اس میں آ جائے، لیکن ہے تو بعض ہی، پھر فاضل رحمانی یہ اقرار کرتے ہوئے بھی (کہ آیت سے بعض علم کی نفی پر استدلال نہیں ہو سکتا) کیوں استدلال کرتے

ہیں۔

﴿عِندَهُ مَفَاتِحُ الغَيْبِ﴾[الأنعام:س ٦۔ت ٥٩]

فاضل رحمانی نے اس آیت کو بھی بڑے طمطراق سے پیش کیا ہے، فرماتے ہیں، اور صحیح بخاری سے اس کی تفسیر بھی نقل کرتے ہیں:

"مفاتیح الغیب پانچ چیزیں ہیں، جن کا علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں، (۱) کل کا علم، (۲) جو رحم میں ہو اس کا علم، (۳) بارش کا علم، (۴) موت کا علم، (۵) قیامت کا علم، یہ تفسیر راجح ہے، یہ حضور سے مروی ہے۔ خازن نے سب سے پہلے لکھا ہے۔ (ملخصاً)

وہ جو کسی نے کہا ہے "دیوانہ بکار خویش ہوشیار" اس کے پورے مصداق رحمانی میاں ہی ہیں، دیکھیے مطلب کی بات کے لیے تو آیت کی تفسیر بخاری سے تلاش کی اور جہاں اپنے خلاف دیکھا، اندھے بن گئے اور اس حدیث کی شروح سے آنکھ بچالی، ورنہ وہ دیکھتے کہ اس حدیث کی شرح میں علامہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کیا فرماتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

مراد آنست کہ بے تعلیم الٰہی بحساب عقل ہیچ کس ایشاں را نہ داند۔ مطلب یہ ہے کہ بے تعلیم الٰہی عقل کے حساب سے کوئی اس کو نہیں جانتا۔ [اشعۃ اللمعات ص:۴۲]

جس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ ان چیزوں کی نفی علم ذاتی کے طور پر ہے، نیز علامہ ملا علی قاری مرقات میں، امام قرطبی شرح صحیح مسلم میں، علامہ عینی، اور امام احمد قسطلانی نے شرح بخاری میں اس حدیث کی شرح میں فرمایا:

"لا مطمع لأحد في علم هذه الأشياء بهذا الحديث، فمن ادعى شيئاً منها غير مستند إلى رسول الله ﷺ فدعواه كاذب."

کسی ایک کو بھی ان چیزوں کے علم کی طمع نہ ہو، جس کسی نے ان میں سے کسی کے علم کا دعویٰ بغیر حضور کی طرف نسبت کیے کیا، اس کا دعویٰ باطل ہے۔

کیا بتایا جائے ے

پڑھا علم دیں دین داری نہ آئی بخارا آیا ان کو بخاری نہ آئی

دیکھیے یہاں یہ جلیل القدر علما رسول کے علاوہ دیگر آدمیوں کو بھی ان پانچ چیزوں کے علم کا دعویٰ کرنے کی اجازت دیتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ اس علم کی نسبت حضور کی طرف کرلو، کہ

آں حضرت ﷺ سے معلوم ہوا۔ دیکھیے آپ کی مستند تفسیروں سے ان پانچوں کا علم رسول خدا کے لیے ثابت ہوگیا، آپ تو وفورِ تعجب سے پاگل ہو رہے ہوں گے۔ مگر کیا کیجیے گا، صبر کیجیے۔ ع

دکھلائے جو فلک سو وہ ناچار دیکھنا

لا تدري ما أحدثوا ما بعدك:

فاضل جھنڈے نگری کا خیال ہے کہ:

مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے اس فاضل کی جہالت پر روشنی ڈالی تھی کہ: ''حضور خود ہی بیان فرمارہے ہیں کہ کل قیامت میں ایسا ہی ہوگا، فرشتے یوں کہیں گے، میں یوں کہوں گا، پھر لاعلمی کہاں سے نکلی، وہاب گڑھ سے؟'' اس پر بڑا چمک کر فاضل رحمانی کہتے ہیں کہ وہ جناب! ہمارا استدلال لا تدري سے تھا، گویا حضور ان واقعات کے لاکھ عالم سہی، لیکن ہم تو انکار کیے جائیں گے، کہ لا تدري کا لفظ دیکھ لیا ہے، یہاں ہم کو پھر اس کام یاب کم نگاہی کی داد دینی پڑتی ہے کہ مطلب کی بات یا سوجھ گئی، کہ لا تدري، مگر ہم تو مولانا کے چودہ طبق روشن کر کے چھوڑیں گے۔ یہاں مندرجہ ذیل امور قابل تنقیح ہیں:

حضور کو علم تھا:

(۱) حضور کو علم تھا، یا نہیں۔

(۲) اگر تھا تو لا تدري کیوں کہا گیا؟

مسند بزار عن عبد اللہ بن مسعود، مسند حارث، امام ترمذی، ابو نعیم، امام عبد اللہ بن مبارک نے حدیث تخریج کی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور پر اعمال امت پیش ہوتے ہیں:

اعمال کی تفصیل:

صحیح مسلم، امام احمد، سنن ابن ماجہ، ابو داؤد، ترمذی، طبرانی نے حدیث تخریج کی جس کا مضمون یہ ہے کہ میری امت کے اعمال اچھے برے سبھی پیش آتے ہیں، یہاں تک کہ تفصیل ہوتی ہے کہ مسجد سے کوڑا صاف کرنا بھی پیش ہوتا ہے۔

مرتد ہونے کا حال بھی دکھایا گیا:

صحیح بخاری شریف کی حدیث ہے:

((بینما أنا قائم فاذا زمرة حتیٰ إذا عرفتهم، خرج رجل من بيني وبينهم فقال:هلم! قلت: این؟ قال:إلى النار والله، قلت: وماشأنهم؟ قال:إنهم ارتد وابعدک علیٰ أدبارهم القهقري))

(الجامع للبخاری: کتاب الحوض. ۹۷۵/۲)

اس بیچ میں کہ میں سویا تھا، دیکھا ایک جماعت جن کو میں پہچانتا تھا، میرے اور اس جماعت کے درمیان میں ایک آدمی حائل ہوگیا، اور کہا کہ چلو، میں نے کہا ان کو کہاں لے جارہے ہو؟ کہا: دوزخ میں، میں نے پوچھا کیوں؟ کہا: آپ کے بعد پیچھے پھر گئے مرتد ہو گئے تھے۔

عمدۃ القاری وفتح الباری وغیرہ میں اس کا مطلب لکھا ہے:

(إنه رأى في المنام ما سيقع لهم في الآخرة.)

خواب میں وہ بات دکھائی گئی، جو قیامت میں ہونے والی تھی۔

جس سے معلوم ہوا کہ مرتد ہو کر کل قیامت میں جو لوگ جہنم میں جائیں گے، وہ سب آپ کو دکھادیے گئے ہیں، پھر لا تدري کا کیا مطلب؟۔

لا تدری کا مطلب:

یہی حدیث صحیح مسلم میں ان الفاظ میں مروی ہے: اما شعرت. کیا آپ کو پتہ نہیں؟ کہ ان لوگوں نے آپ کے بعد کیا کیا، نیز بروایت ابوہریرہ: (هل تدري ما أحدثوا مابعدک) جس کا ترجمہ ہوا آپ تو جانتے ہی ہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا، جس طرح: (هل أتي على الانسان حين من الدهر)، میں۔ صحیح بخاری میں یہ حدیث بروایت اسماء ''هل شعرت'' ہے اور کچھ روایتوں میں لا تدري بھی ہے، فاضل رحمانی کی کج نگاہوں نے صرف لاتدري دیکھا، ورنہ روایت کے دیگر طریقوں کو دیکھتے ہوئے اصول تطبیق پر یہاں بھی ہمزۂ استفہام انکاری محذوف ماننا پڑے گا جیسا آیت: ﴿هذا ربی﴾ میں ہے، اور اس تقدیر پر یہ معنی ہوں گے، کہ کیا آپ کو پتہ نہیں یعنی ہے، ورنہ یہ تو آپ کو تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ بعض حدیثوں سے ثبوت علم ہے اور بعض سے نفی، اس لیے نفی والی حدیث ذہول پر مبنی ہے، تاکہ دونوں میں تطبیق ہوجائے، مگر آپ کو تو اپنے لاتدري کے غمزۂ شاہدانہ سے ہی فرصت نہیں ملتی، اور آپ کو

کون بتائے کہ:

ترا کہ گفت کہ اے نازنیں زپردہ برآ زغمزہ برصف مرداں شیر افگن زن

واقعات کی بحث

واقعات کی ایک طویل فہرست ہے، کہ حضور کو علم تھا تو فلاں واقعہ میں کیوں کر ایسا ہونے سے بچانہ لیا، ایسا کیوں نہ کیا، اور ایسا کیوں نہ کیا؟ اس پر مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے ایک بڑی دلچسپ گرفت کی تھی، کہ اگر اسی طرح حضور جان نور ﷺ کے عدم علم پر استدلال کیا جاسکتا ہے تو پھر خدائے ذوالجلال کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، کیا معاذ اللہ وہ بھی عالم نہ تھا، آخر اس نے اپنے نبی کی چہیتی بیوی کو ''تہمت افک'' سے کیوں نہ بچالیا، اور نبی ﷺ کو مہینوں ضیق میں رکھا جب کہ بارہا ان کی ذرا ذرا سی تکلیف پر قرآن فوراً ہی نازل کردیا کرتا تھا، اس واقعہ میں تاخیر وحی کیوں ہوئی، یا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہادت سے کیوں نہ بچالیا، جب کہ ایک مسلمان سردار کا ایسے وقت میں زندہ رہنا بہر حال مفید تھا، معلوم ہوا کہ علم کے مقتضی پر بظاہر عمل نہ کرنا عدم علم کی دلیل نہیں۔

اس معارضے پر آپ سے کچھ بن نہ آئی تو مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کو برا بھلا کہہ کر یہ جواب دیا کہ خدا کی مشیت اور مصلحت ہی ایسی تھی، اور خدا سے اس کی مشیت کے بارے میں سوال نہیں ہوسکتا! کہ ایسا کیوں ہوا، جب کہ دوسروں سے سوال ہوسکتا ہے۔ آیت:

﴿لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ﴾[الأنبياء: س ۲۱۔ت ۲۳]

اللہ اللہ ''یہ منہ اور مسور کی دال'' قرآن شریف سمجھنے چلے ہیں، مولانا اردو ترجمہ دیکھ لینا اور بات ہے۔ اور فہم قرآن اور، سوال یہ ہے کہ آیت میں سوال سے کیا مراد ہے، سوال برائے علم یا برائے احتساب، اگر آپ سوال برائے علم مراد لیتے ہیں، کہ جاننے کے لیے بھی نہیں پوچھ سکتے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قول کا جواز پیدا کرو جو انہوں نے قرآن کے الفاظ میں اپنے رب سے کیا تھا:

﴿رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ﴾[البقرة: س ۲۔ت ۲۶۰]

یا حضرت نوح علیہ السلام کی یہ بات:

﴿رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي﴾[هود: س ۱۱۔ت ۴۵]

(خدایا میرا لڑکا تو میرے اہل سے تھا)

اور تو نے کہا کہ تیری اہل نجات یاب ہوگی۔ اور اگر سوال سے سوال احتساب واعتراض مراد ہے تو یہ ٹھیک ہے کہ خدا کے افعال کا احتساب نہیں، دوسروں کا ہوگا، لیکن حضور کی شان میں اس آیت کا پڑھنا اولاً تو دائرۂ محبت سے خارج، ثانیاً آپ اپنی اوقات تو دیکھیے پھر بعد میں حضور کے اعمال واحوال کا حساب کیجیے گا۔ قبلہ! شرک وبدعت کی مشین چلانا اور ہے، اور قرآن فہمی اور۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا کوئی محاسب نہیں، کہ اس کے افعال پر اعتراض کر سکے، اور خدا سب سے حساب لے گا۔ اس آیت کو اس مبحث سے کیا علاقہ! کیا آپ اس آیت کی ناجائز آڑ لے کر حضور ﷺ کے محاسب بننے کا خواب دیکھ رہے ہیں، کیوں نہ ہو آپ بھی تو انہیں میں سے ہیں جن کے لیے کہا گیا ہے:

ذکر روکے، فضل کاٹے، نقص کا جویاں رہے
پھر کہے مردک کہ ہوں امت رسول اللہ کی

اصولی مسئلہ کی وضاحت:

سوچنا چاہیے کہ بقول "فاضل رحمانی" واقعہ ایک شہادت حمزہ، اور اس قسم کے دیگر تمام واقعات مشیت ایزدی تو یہی تھی کہ مثلاً حضور ﷺ اتنی دیر دکھ میں رہیں، حضرت حمزہ شہید ہوں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ عقل کے اندھے چاہتے ہیں کہ حضور خدا کی مشیت کی مخالفت کریں۔ اگر عالم تھے تو بتا دینا چاہیے تھا، یہ یاد رکھو کہ خدا نے حضور ﷺ کو اس لیے عالم نہیں بنایا کہ وہ رموز الٰہی جان کر اس کی مرضی کے خلاف کریں، نہ کسی وارفتہ دنیا کو حضور سے اس قسم کی توقع رکھنا چاہیے۔

اس لیے ان تمام واقعات وحوادث میں جہاں تمہاری عقل مقتضائے علم پر عمل نہ کرنے کی کوئی صحیح توجیہ نہ ڈھونڈ پائے تو یہ سمجھ لو کہ خدا کی مرضی یہی تھی، اور جس طرح خدا عالم ہونے کے باوجود اپنی مرضی کے خلاف نہیں کرتا، حضور سے بھی علم کے باوجود امید نہ رکھو، کہ وہ خدا کی مشیت کے خلاف لب بھی ہلائیں گے، جیسے ایک داروغہ بالائی حکم کی وجہ سے مجبور ہے کہ اپنے بھائی کو اس کی گرفتاری کے وارنٹ کی خبر نہ دے، بلکہ خود ہی اسے گرفتار بھی کرے، حالاں کہ اس کو اس کی خبر پہلے سے ہے، اور بھائی ہونے کی حیثیت سے دل میں بچانے کا جذبہ بھی ہوتا ہے۔

خاتمہ:

رسالہ میں ہر ممکن اختصار کو مدنظر رکھ کر اصول مسئلہ ”حاضر و ناظر“ پر قرار واقعی روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ جس کا خلاصہ ایک نظر میں یہ ہے کہ حضور کا بیک وقت کئی جگہوں، یا سارے عالم کی خبر رکھنا کسی طرح شرعاً ناممکن نہیں، نہ شرک لازم آتا ہے، کیوں کہ ایسا ہی (عطائی) حضور اور قدرت، اگر خدا کے لیے مان لیا جائے تو خدا نہ رہ جائے۔

اس سلسلہ میں ”خیر الانبیا“ کے دعاوی مجموعی حیثیت سے حق و درست ہیں اور مولوی عبد الرؤف یا ان کے ابنائے جنس اس سلسلہ میں جو جو حماقتیں کرتے اور مجنونانہ بڑھ ہانکتے ہیں، ان کا دماغ بفضل ایزدی ہر وقت درست کیا جا سکتا ہے، اور وقت کے سب سے بڑے خبطی الحواس اپنی اکلوتی من بھاتی دلیل، اور بے معنی اڑن کھائیوں کی عبرت ناک خستگی کو دیکھیں اور عبرت حاصل کریں کہ:

اے روبہک چرا نہ نشستی بجائے خویش
باشیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

اقوال کی بحث:

مولوی رئیس احمد صاحب نے اپنی کتاب ابطال کی ابتدا ہی موضوع سخن کے عنوان سے کی اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قول:

((فمن حدثک أنه يعلم ما في غد فقد كذب))
(الجامع للبخاری: تفسیر سورۃ النجم ۲/ ۷۲۰)

جو تم سے یہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ کل کی خبر رکھتے تھے وہ جھوٹ بولا۔

اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول:

((من ادعیٰ أنه يعلم من هذه الأشياء فقد كفر بالقرآن العظيم؛ لأنه مخالفه))

جو یہ دعویٰ کرے کہ اشیائے خمسہ میں سے کچھ جانتا ہے اس نے کفر کیا کہ اس نے قرآن کی مخالفت کی۔

لکھ کر تحریر فرمایا:

''ان دونوں کے بیان سے کسی بھی صحابی بلکہ صحیح العقیدہ مسلمان کو اختلاف نہیں''۔
پھر صفحہ ۲۳۔۲۴ پر ملا علی قاری رحمۃ الباری علیہ کی عبارت:
''ذکر الحنفیة تصریحاً بالتکفیر باعتقاد أن النبي علیه السلام یعلم الغیب.''
احناف نے اس آدمی کے کافر کہنے کی تصریح کی ہے جو نبی کے لیے غیب کا اعتقاد رکھے۔
لکھ کر بھی یہی بات دہرائی کہ:
ملا علی قاری کے یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ تمام حنفی علما کا یہی مسلک ہے۔
اگر فاضل رحمانی نے یہی لکھا ہوتا تو ہم ان سے عرض کرتے ''صاحب! یہ اگلا ہوا لقمہ پھر چبا رہے ہیں۔لیکن ان بالک صاحب سے ہم کیا عرض کریں، کہ عزیزم! آپ نے یہ بسم اللہ ہی غلط کر دی۔آپ کے بزرگ محترم خود فرما گئے ہیں: ''ہم پر نہ آپ کا قول حجت ہے نہ آپ کے بڑوں کا۔دلیل قرآن وحدیث سے چاہیے''۔
اور آپ نے چھوٹتے ہی دو صحابی کے قول کو موضوع سخن بنایا۔کیا یہ اقوال قرآن وحدیث ہیں؟ نہیں۔پس جو چیز آپ کے نزدیک بے بھروسہ ہے۔اس پر دوسروں کو بھروسہ دلانے کا آپ کو کیا حق ہے، اسی پر آپ کو اگر کوئی دھوکہ باز کہے تو آپ کوسنے لگتے ہیں، آخر آپ دوسروں کی آنکھ میں دھول جھونکتے ہی کیوں ہیں؟
ثانیاً:۔ام المؤمنین اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جو کہا صرف ان کا اجتہاد اور قیاس ہے۔قرآن وحدیث نہیں (اور قیاس کے تو آپ غیر مقلد حضرات سخت خلاف ہیں) چناں چہ حاشیہ سندی میں ہے:
''قوله: فقد کذب ،قالته رضی الله عنها اجتهاداً.''
(بخاری جلد ۴ ص ۱۶۷)
ام المؤمنین نے یہ بات اپنے قیاس سے کہی ہے۔
اور تمام مسلمان تو کیا خود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی اس سے اختلاف ہے، چناں چہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

”ان رسول اللہ ﷺ کان یرینا مصارع أھل بدر بالأمس الحدیث.“

(مشکوۃ شریف ص:۵۴۲)

حضور ﷺ نے کل ہونے والی بات کے بارے میں ایک دن پہلے ہم کو دکھادیا تھا کہ یہاں اہل بدر قتل کرکے ڈال دیے جائیں گے۔ حضرت عوف ابن مالک رضی اللہ عنہ سرکار کی خدمت مبارکہ میں انہیں کو مخاطب کرکے عرض کرتے ہیں:

”ما رأیت وما سمعت بمثله في الناس کلهم کمثل محمد أوفیٰ وأعطی للجزیل إذا اجتدی، ومتیٰ تشاء یخبرک عما في غد.“

(سیرت ابن ہشام، ص:۲۔ الاصابہ ۴، ص:۳۵۲)

میں نے رسول اللہ ﷺ جیسا آدمی سارے جہان میں نہ تو دیکھا نہ سنا، جب ان سے مانگا جائے تو بہت بڑا عطیہ بخش دیں، اور تم جب چاہو تم کو آنے والے کل کی خبر دے دیں گے۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ آں حضرت ﷺ کی بزم مبارک میں عرض کرتے ہیں:

”نبي یریٰ ما لا یریٰ الناس حوله، ویتلو کتاب اللہ في کل مشهد، فإن قال: في یوم مقالة غائب، فتصدیقها في ضحوة الیوم أو غد.“

[زرقانی ۴، ص:۲۲۹]

وہی نبی اپنے آس پاس وہ دیکھتے ہیں جو لوگوں کو نظر نہیں آتا اور اللہ کی کتاب ہر مقام پر تلاوت کرتے ہیں۔ آج اگر کسی پوشیدہ بات کی خبر دیں تو دوپہر ہوتے ہوتے یا کل آئندہ تک اس کی تصدیق آجاتی ہے۔

حضرت فدفدا بن خناقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

”فأخبر في بالغیب عما رأیته، وأسررته من معشر في مکالم.“

[الاصابہ ۳، ص:۲۰۰]

حضور نے اس غیب کی خبر دے دی جس کو میں نے دیکھا تھا اور پوشیدہ طور پر میں نے قوم سے اس کی سرگوشی کی تھی۔

بلکہ خود حضور ﷺ نے بھی اس سے اختلاف فرمایا ہے۔ امام بخاری علیہ الرحمہ نے

حضرت سلمہ اور حضرت سہل ابن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی:

''لاعطین ھذا الرایہ غداً رجلاً یفتح اللہ علی یدہ، یحب اللہ ورسولہ.'' [بخاری ۲، ص:۶۰۵]

میں جھنڈا کل ایسے آدمی کے ہاتھ میں دوں گا کہ اللہ اس کے ہاتھ پر خیبر فتح کرے گا۔ اور وہ اللہ ورسول کو دوست رکھتا ہے۔

اور اگر آپ کی آنکھ حیرت سے پھٹی نہ رہ جائے تو سہی! کان کھول کر سنیئے کہ اس قول کے خلاف خود ام المؤمنین حضرت عائشہ فرماتی ہیں: کہ میرے والد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مرض وصال میں مجھے مخاطب کر کے اپنے وارثوں کی فہرست بتائی:

''انما أخوک وأختاک فاقتسموہ علی کتاب اللہ عزوجل قالت: یا أبت! إنما ھي أسماء فمن الأخریٰ قال: ذوبطن بنت خارجة أریھا جاریة فولدت جاریة.'' [موطا امام محمد، ص:۲۶۷]

میرے وارثوں میں ایک تمہارا بھائی اور دو تمہاری بہنیں ہیں۔ ام المؤمنین نے کہا باوا جان ایک بہن تو میری سمجھ میں آرہی ہے کہ وہ اسماء ہیں۔ یہ دوسری کون ہے۔ آپ نے فرمایا: کہ میری بیوی بنت خارجہ کے شکم میں جو حمل ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ لڑکی ہے، سو لڑکی پیدا ہوئی۔

کہیے ام المؤمنین نے اپنے والد کے بارے میں کل آئندہ کی خبر دینے کا دعویٰ کیا یا نہیں؟۔

اور حضرت ابن عباس سے آیت:

﴿قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّکَ إِنَّکَ لَن تَسْتَطِیعَ مَعِیَ صَبْراً﴾

[الکھف: س ۱۸۔ ت ۷۵]

تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے کی تفسیر میں روایت ہے:

((قال ابن عباس: حدثني أبي ابن کعب أن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قال: وکان رجلا یعلم علم الغیب))

(التفسیر لابن جریر: الجزء الخامس عشر۔ ۹/۲۷۹)

حضرت ابن عباس ابی ابن کعب کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ حضرت خضر ایک ایسے آدمی تھے جو غیب جانتے تھے۔

کہیے! حضرت ابن عباس نے خضر کے لیے دعویٰ علم غیب کر کے خود اپنے اوپر کفر کا فتویٰ دیا یا نہیں؟۔

رئیس التحریر صاحب! دیکھا آپ نے اپنے ''موضوع سخن'' کا حشر جس امر کے لیے آپ کا دعویٰ تھا آج کے سارے صحیح العقیدہ مسلمان سے لے کر رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک تک سارے صحابہ اس سے متفق تھے، کسی کو اختلاف نہیں۔ مگر اس دعویٰ کی کیچلی اتاری گئی تو معلوم ہوا کہ آج کی بات تو دور رہی خود عہد صحابہ میں ہی اصحاب نبی ﷺ کو اس سے شدید اختلاف تھا، اور اختلاف کرنے والے بھی معمولی حیثیت کے لوگ نہیں تھے۔ امام برحق خلیفۂ راشد حضرت امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے لیے کل کی خبر آج دینے کا دعویٰ کیا۔ حضور ﷺ کی محفل مبارکہ میں حضرت حسان، حضرت عوف ابن مالک، حضرت فدفد ابن خناقہ رضی اللہ عنہم نے ببانگ دہل آپ کی غیب دانی کا اعلان کیا۔ اور حضور سید عالم ﷺ نے خاموش رہ کر اس کی تائید فرمائی بلکہ خود حضور سید عالم ﷺ نے خاص لفظ غد کے ساتھ ہی آپ کے موضوع سخن سے اختلاف کیا۔ اور تو اور آپ جن حضرات کے قول کی سند لائے تھے انہیں حضرات نے اس کی مخالفت کر کے آپ کے موضوع سخن کو سخن موضوع بنا دیا۔ اور اسی لیے ہم نے کہا تھا کہ آپ کے رشحات قلم بچکانہ شوخیوں کے علاوہ کچھ نہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

رسالہ ''الشاہد'' کی تحقیق ماخذ کے رجوع کے لیے اصل کتابوں کی تلاش اور تحقیق حق کے لیے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ جانا پڑا۔''

معلوم ہوتا ہے کہ مادر تعلیم میں آپ نے کتابوں سے ہی رجوع کیا۔ اساتذہ سے رجوع کی نوبت نہیں آئی۔ ورنہ وہ بزرگوں کے اقوال سمجھنے کا طریقہ آپ کو ضرور بتاتے۔

خیر ہم ہی آپ کو بتاتے ہیں: امام عینی اپنی شرح میں ام المؤمنین کے قول کی شرح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قال الداؤدي: ما أظنه محفوظاً، وإنما المحفوظ من حدثك أن محمداً كتم شيئاً مما أنزل الله إليه فقد كذب، أما علم الغيب فما أحد يدعي

أن رسول الله ﷺ كان يعلم الغيب إلا ما أعلم." [عینی شرح بخاری ص:۷۸]

داؤدی نے فرمایا کہ ام المؤمنین سے انه يعلم ما في غد والا قول محفوظ طریقوں سے مروی نہیں ہے، صحیح یہ ہے کہ آپ نے یہ کہا ہے کہ "جو یہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان پر اتری ہوئی باتوں میں سے کچھ چھپالیا ہے وہ جھوٹا ہے" باقی علم غیب تو اس کے بارے میں سب یہی کہتے ہیں کہ آپ نے وہی جانا جس کو خدا نے بتایا۔ اس عبارت سے تین باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) داؤدی کے خیال میں ((من حدثك أنه يعلم ما في غد الخ)) والا ٹکڑا اس روایت میں زائد ہے۔

(۲) جو اللہ کی تعلیم کے بغیر رسول اللہ کے لیے علم غیب کا دعویٰ کرے وہ غلط کہتا ہے۔ لیکن جو اللہ کی تعلیم کے واسطے سے آپ کے لیے دعویٰ علم غیب کرے وہ نہ کفر ہے نہ جھوٹ ہے، بلکہ واقعہ اور ایمان ہے۔

(۳) ام المؤمنین کے قول سے اگر تکذیب ہوسکتی ہے تو فریق اول کی، فریق ثانی کی نہیں۔ اب امام قسطلانی کا بیان سنیے:

"وقول الداؤدي متعقب بأن من لم يرسخ في الايمان، كان يظن ذلك حتى كان يرى أنه صحة النبوة تستلزم اطلاع النبي على جميع المغيبات، وعلم أنه ﷺ لا يعلم إلا ما علمه الله." (ملخصاً)

داؤدی کے اس قول (کہ کوئی آدمی ایسا نہیں تھا جو دعویٰ کرے کہ بے تعلیم الٰہی رسول اللہ غیب جانتے تھے۔) پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ کچھ ایسے لوگ جن کے دل میں ایمان کی جگہ نہیں بنا سکا تھا۔ یہ خیال کرتے تھے کہ نبوت کی صحت کے لیے تمام غیوب کا جاننا لازم ہے تو حضور ﷺ نے بتادیا کہ میں اتنا ہی جانتا ہوں جتنا اللہ نے بتایا۔

دیکھیے امام قسطلانی امام داؤدی کے کلام میں ذکر کی ہوئی پہلی بات کی تردید کرتے ہیں۔ کہ اس ٹکڑے کے عدم محفوظ ہونے کی بات صحیح نہیں۔ اور ام المؤمنین کے قول کو ان غیر راسخ العقیدہ لوگوں کے خیال کی تکذیب قرار دیتے ہیں جو جمیع مغیبات پر اطلاع کو لازمہ نبوت قرار دیتے تھے۔ اور تعلیم کے بعد غیب پر مطلع ہونے کو خود رسول اللہ ﷺ کا دعویٰ اور قول قرار دیتے ہیں۔ تو ام المؤمنین کا قول اس خیال کی تردید کیسے ہوسکتا ہے۔

ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قول کے واقعی معنی معلوم ہو جانے کے بعد ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول خود واضح ہو جاتا ہے۔ (بشرطے کہ یہ انہیں کا قول ہو، کیوں کہ خازن نے اس کو بے سند ہی نقل کیا ہے) کیوں کہ ان کو کتے نے نہیں کاٹا تھا کہ ایک دفعہ دعویٰ علم غیب کو کفر قرار دیتے اور دوسری دفعہ اسی کو حضرت خضر علیہ السلام کے لیے ثابت کرتے۔ مطلب یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی بے تعلیم الٰہی دعویٰ علم غیب کو کفر کہتے ہیں، اور تعلیم کے بعد ہو تو کوئی حرج نہیں بلکہ خود حضرت ابن عباس اس کے مرتکب ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ ام المؤمنین اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تکذیب اور تردید کا رخ ان لوگوں کی طرف تھا جو بے تعلیم الٰہی یا علم غیب کلی کے مدعی ہوں، ان لوگوں کی طرف نہیں جو تعلیم الٰہی کے بعد یا بعض علم غیب کے مدعی ہوں (الحمد للہ کہ ہم اہل سنت تو علم غیب کلی کے مدعی ہیں نہ علم ذاتی کے) اس لیے یہ آپ کی شوخی ہی تھی کہ آپ نے اس گولی کا رخ ہماری طرف پھیر دیا جو دوسروں کی طرف جا رہی تھی۔

اور فقہ اکبر کی شرح ملا علی قاری کی عبارت جس کا آپ نے اپنی کتاب میں وظیفہ پڑھا ہے، اور حنفیوں کو بڑی غیرت دلائی ہے۔ کہ گویا ہم لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے لیے دعویٰ علم غیب کر کے احناف کے اجماع کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ اس سلسلہ میں تو آپ نے وہ کارنامہ انجام دیا ہے کہ اس کے بارے میں تصنیفی بددیانتی، یا اسلامی دیانت کی خلاف ورزی کا لفظ بہت ہلکا ہے۔ یہ تو صاف صاف گرہ کٹی ہے، اور شاید یہ عمر کا تقاضا ہے۔ ورنہ یہ کیا معاملہ ہے کہ ایک دفعہ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب اپنی تحریر ''خیر الانبیا'' میں ''تردید حاضر و ناظر'' کی اس خیانت بُرمانہ پر تنبیہ کر چکے اور پوری عبارت نقل فرما کر مطلب واضح کر چکے، پھر دوبارہ آپ نے وہی حرکت کی۔ شرح فقہ اکبر کا صفحہ ۲۵ آپ کو نظر آیا۔ اور اسی عبارت سے متصل اس سے پہلے کی عبارت بھول گئے:

''ثم اعلم أن الأنبياء لم يعلموا المغيبات من الأشياء إلا ما علمهم الله، وذكر الحنفية تصريحاً بالتكفير باعتقاد أن النبي عليه السلام يعلم الغيب.''

جان لو کہ انبیا علیہم السلام اشیاء غائبہ میں سے وہی جانتے ہیں جس کی اللہ نے انہیں تعلیم دی ہو، اور حنفیہ نے نبی علیہ السلام کے لیے علم غیب کے اعتقاد کی تکفیر کی ہے۔

اب آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ جب بہ تعلیم الٰہی انبیا کے لیے ملاعلی قاری خود ہی علم غیب ثابت کرر ہے ہیں تو کیا اسی کی تکفیر نقل کریں گے؟ تکفیر تو بے تعلیم الٰہی، بطور خود ہی دعویٰ علم غیب پر ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو صراط مستقیم کی ہدایت دے۔

تردیدی اقوال کا حال

غیر مقلد حضرات سے کئی ایک بحث ومباحثہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ یہ لوگ بحث میں کسی اصول یا ضابطہ علمی کے قائل نہیں ہیں۔ موقع پرستی ہی اصل اصول ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

غیر مقلدین کے اس الزام کی تردید میں کہ "مسئلہ حاضر وناظر" صرف بریلوی علما کی پیداوار ہے۔ اپنی کتاب "خیر الانبیاء" میں مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے امام غزالی، ملاعلی قاری، صاحب نسیم الریاض، شیخ محقق، وغیرہم متقدمین علمائے اسلام کے اقوال تائید میں پیش کیے تھے۔

انصاف واصول پرستی کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان غیر بریلوی علما کی تصریحات کے بعد مولوی عبدالرؤف صاحب وغیرہ غیر مقلد حضرات اپنے اس الزام سے دست کش ہوجاتے کہ یہ خیال صرف بریلویوں کا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور مولوی عبدالرؤف صاحب نے ان اقوال کو دلیل قرار دے کر رد کردیا اور تحریر کیا کہ:

"ہم پر کسی بھی عالم کا قول حجت نہیں، ہم پر تو سند قرآن وحدیث سے قائم کرنی چاہیے"۔

اور فوراً ہی اس کے جواب میں سات اقوال ایسے پیش کیے جن میں علم غیب، حاضر وناظر کے قول کو کفر قرار دیا گیا تھا۔

اولاً: جب آپ اقوال کی سند قبول ہی نہیں کرتے، تو ان اقوال کا انکار کر کے ہی خاموش ہوجانا چاہیے۔ مزید انکار اقوال پیش کر کے ناحق بات بڑھانے کی ضرورت نہ تھی۔

ثانیاً: اتنی بات سے یہ امر تو ثابت ہوگیا کہ غیر مقلد حضرات کا یہ الزام جھوٹ ہے، کہ حاضر وناظر کا مسئلہ صرف بریلویوں کا پیدا کردہ ہے۔ کیوں کہ آپ ان ائمہ اسلام کے اقوال کے وجود سے انکار نہ کرسکے، صرف ان کو ماننے سے انکار کیا ہے آپ کے نہ ماننے سے ان کے وجود

پر بالکل اثر نہیں پڑتا، الٹا یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ اقوال پایۂ ثبوت کو پہونچے تب ہی تو آپ کو ماننے سے انکار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہاں آپ کے انکاری اقوال سے اگر زیادہ سے زیادہ ثابت ہوسکتا ہے تو یہی کہ اس مسئلہ میں زمانۂ قدیم سے اختلاف چلا آتا ہے، کچھ حضرات اس کی تائید میں ہیں اور کچھ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔

ہم نے اپنی تحریر میں اسی خیال کے پیش نظر اقوال کی بحث میں کوئی اضافہ نہیں کیا، کہ جب فریق مخالف اسے تسلیم ہی نہیں کرتا تو اس بحث کو پھیلانا بے سود ہے۔ صرف اتنا لکھا کہ ان اقوال کو سند مت سمجھیے، یہ تو اس الزام کی تردید تھی کہ مسئلہ "حاضر و ناظر" بریلوی حضرات کی ایجاد ہے۔

فاضل رحمانی کے پیش کردہ تردیدی اقوال پر البتہ ہم نے تین طرح کلام کیا تھا:

(۱) آپ نے کچھ عبارتوں کے حوالے نہیں تحریر کیے ہیں، اس لیے ان سے ہم پر الزام نہیں قائم ہوسکتا، کہ خود ان اقوال کا ثبوت ہی معرض بحث میں ہے۔

(۲) اگر ان سب بے حوالہ عبارتوں کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو ان کا اور بقیہ عبارتوں کا جواب یہ ہے کہ کفر کا فتویٰ علم غیب ذاتی ماننے والوں پر ہے، عطائی تسلیم کرنے والوں پر نہیں۔

(۳) اگر کسی کتاب میں عطائی والوں پر کفر کی تصریح ہے تو یہ غلط ہے، مفتی بہ اور صحیح یہی ہے کہ ایسے آدمی پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جاسکتا۔ کیوں کہ حضور غیب جانتے تھے۔

ہم نے فاضل رحمانی کے پیش کردہ اقوال پر جو کلام کیا اس کو پایۂ ثبوت تک بھی پہونچایا، چناں چہ شق ثانی کے ثبوت میں جامع الفصولین اور تیسری شق کے ثبوت میں خزانۃ الروایہ وغیرہ کی عبارتیں پیش کی تھیں۔

لیکن نئے مصنف صاحب نے اس مقام پر بے حد چمک کر ارشاد فرمایا:

"یہ تو کوئی جواب نہ ہوا، اگر کچھ دم ہوتا تو یہ ثابت کیا جاتا کہ یہ حوالے مولانا جھنڈے نگری نے غلط دیے ہیں"۔

اس کتاب میں قدم قدم پر ہم کو یہ احساس ہو رہا ہے، کہ صاحبزادے نے لکھنؤ میں اپنے اساتذہ سے بالکل رجوع نہیں کیا، ورنہ یہ جملہ ان کے قلم سے ہرگز نہ نکلتا۔ کیوں کہ اصول مناظرہ میں یہ طے ہوچکا ہے کہ ہر مقابل کو یہ حق حاصل ہے، کہ حوالہ پیش کرنے والے سے تصحیح

نقل کرے۔اور مدعی نقل مطابق اصل ثابت نہ کر سکے تو حوالہ پیش کردہ قابل سند نہیں۔حوالوں کا صحیح صحیح پتہ نشان بتانا ہماری ذمہ داری نہیں،مولوی جھنڈے نگری،اوران کے ہوا خواہوں کے دم خم کی بات ہے۔اور معلوم ہوا کہ واقعۃً ان لوگوں کا کس بل نکل چکا ہے،کیوں کہ لاکھ غیرت دلانے پر بھی اپنے تازہ شاہ کار میں بھی ان عبارتوں کا حوالہ نہ پیش کر سکے۔

پھر آپ لاکھ تلملائیں اور ہزار تڑپیں ایسی عبارتوں پر کلام کرنے کے لیے جن کا ثبوت فراہم نہ ہو سوائے فرض کرنے کے اور کون سی صورت ہو سکتی ہے۔اسی لیے ہم نے یہ لکھا کہ:''ان سب عبارتوں کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تب بھی ہم کو مضر نہیں''۔

رہ گئی ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شرح فقہ اکبر کی عبارت تو اس میں آپ کی موروثی خیانت کا حال کھل جانے کے بعد ظاہر ہو چکا ہے کہ اس میں حکم کفر ذاتی علم غیب ماننے ہی کی بنیاد پر ہے۔اور ہماری اس تحقیق کو متاخرین کی تاویل کہہ کر گزر جانا۔اور اس پر کلام کرنے سے آنکھ چرانا دامن بچانا،آپ کی چاک دامنی کی دلیل ہے،کیوں کہ مولوی عبدالحی لکھنوی متوفی ۱۳۰۴ھ تو شاید آپ کے نزدیک متقدمین میں سے ہیں،جن کے فتاویٰ کے صفحہ اور سطر کا آپ نے حوالہ دیا ہے(اور تلاش بسیار کے بعد شاید یہی ایک حوالہ آپ کو مل سکا ہے)اور صاحب جامع الفصولین شیخ بدرالدین محمود ابن اسرائیل متوفیٰ ۸۱۸ھ متاخرین میں سے ہیں جن کا ذکر ہم نے کیا تھا۔یہ پانچ صدیوں کی الٹی گنگا بہانا غیر مقلد محققین کی ہی شان ہے،اور پھر یہ تو اصول فتویٰ نویسی کی بات تھی،اس میں مقدم و موخر کا کیا ذکر،قائل کے قول کی تفصیل جانے بغیر کفر کا حکم دینا بلاشبہ جاہل مفتیوں کا کام ہے۔

ایں گل دیگر شگفت:

ہم نے اقوال کی بحث میں اپنے کلام کی تیسری شق میں لکھا تھا۔علم غیب عطائی ماننے والوں کو کافر کہنا غلط ہے۔فتویٰ یہ ہے:

''الصحيح أنه لا يكفر ؛لأن الأنبياء عليهم السلام يعلمون الغيب، ويعرض عليهم الأشياء فلا يكون كفراً'' [خزانۃ الروایہ]

صحیح یہ ہے کہ انبیا کے لیے غیب کا قول کرنے والا کافر نہیں ہے،کیوں کہ انبیا علیہم السلام غیب جانتے ہیں اوران پر اشیا پیش کی جاتی ہیں تو کفر کیسے ہوگا؟۔

اس پہلو کو ذکر کر کے رئیس آزاد صاحب نے نہایت آزادانہ بلکہ بے حد بچکانہ حرکت کی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"ان عبارتوں (یعنی نبی کو حاضر و ناظر اور عالم الغیب کہنے سے آدمی کافر نہ ہوگا) کا اگر یہی مطلب ہے کہ نبی کا حاضر و ناظر سمجھنا فضیلت میں داخل ہے، تو اس اصول بریلوی کے موافق فقہ حنفیہ کی حسب ذیل تشریح ملاحظہ ہو:

"إن الرضا بقتل الحسين ليس بكفر"

امام حسین کے قتل پر راضی ہونا کفر نہیں۔

تو کیا قتل حسین پر رضا فضیلت کا کام ہے:

"في استقلال الوطي بامرأته الحائض. وفي استحلال اللواطة بامرأتة لا يكفر (ملخصاً)

عورت سے حالت حیض میں صحبت کرنا۔ اور اپنی بیوی سے لواطت کرنا کفر نہیں ہے۔

اس کے بعد ایک لمبی عبارت لکھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

جس طرح قتل حسین پر رضا کفر نہیں بیوی سے لواطت یا حالت حیض میں ہم بستری کفر نہیں۔ لیکن ان کے کفر نہ ہونے سے ان امور کا حلال یا پسندیدہ ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ یہ امور گناہ کبیرہ اور معصیت عظیمہ ہیں۔ اسی طرح حاضر و ناظر ماننا کفر نہ ہونے کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ یہ کار فضیلت ہے، بلکہ امور مذکورہ بالا کی طرح حرام اور گناہ ہی رہے گا۔

ہم کو یہ پورا بیان پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا، کیوں کہ آزاد صاحب کے اس بیان کی روشنی میں ہر شخص یہی خیال کرے گا کہ شاید ہم نے کہیں یہ لکھا ہو، یا ہماری کسی عبارت کا یہ منشا ہو، کہ "حاضر و ناظر کہنا کفر نہیں لہذا افضیلت ہے"۔ حالاں کہ واقعہ بالکل اس کے خلاف ہے۔ ہماری کتاب کے دو مختلف مقامات کو اپنے ذہن میں ترتیب دے کر آزاد صاحب نے یہ مضمون پیدا کیا ہے۔

اور بقول کسے "کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا" والا معاملہ ہے۔

پوری بحث کا خلاصہ گذشتہ صفحات میں پیش نظر ہے۔ اور جس کو شبہ ہو فریقین کی کتابوں سے تصدیق کر سکتا ہے۔

مسئلہ حاضر و ناظر کا باب فضائل سے ہونا ہمارا یہ ایک الگ دعویٰ ہے اور اس کے دلائل علاحدہ ہیں۔ اور اقوال علما کی بحث ایک علاحدہ بحث ہے۔ جو اس طرح چلتی ہے کہ آپ نے چند اقوال پیش کیے جن میں حاضر و ناظر یا عالم غیب کا قول کرنے والے کو کافر کہا گیا، ہم نے اس کا دفاع کرتے ہوے علمائے احناف کا یہ فتویٰ پیش کیا کہ اس کو کفر کہنا غلط ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ کفر نہیں۔ اتنی سی بات میں یہ پیوبند لگانا کہ لہذا یہ فضیلت ہے۔ یہ صرف آپ کے نہاں خانہ کی پیدا وار ہے، ہم نے کب اس قول کو دعویٰ فضیلت کے ثبوت میں پیش کیا۔ اور کہاں لکھا ہے کہ کفر نہ ہو تو فضیلت کا ہونا ضروری ہے۔ کہ آپ نے یہ شگوفہ چھوڑا اور صفحے کے صفحے سیاہ کیے۔ صاحبزادے جواب دعویٰ کو دعویٰ کی دلیل سمجھنا یہ آپ کے چھوٹے موٹے دماغ کی پیداوار ہے۔

ہنوز طفلی واز ناو نوش بے خبری زعلم خویش چہ از جہل خویش بے خبری

پھر آپ نے اپنی الٹی سمجھ کے مطابق جو کچھ کہا وہ بھی آپ کی جہالت کا آئینہ دار ہے۔ کیوں کہ قتل حسین پر راضی ہونا، وطی حائض، اور لواطت زوجہ کا معصیت ہونا ایک طے شدہ معصیت ہے۔ اس لیے یہ کفر نہ ہو تب بھی معصیت ہی رہے گا۔ لیکن حاضر و ناظر ماننا کہاں ایک طے شدہ معصیت ہے، اس کے لیے تو اسی عبارت میں صاف صاف تحریر ہے:

((إن الأنبياء يعلمون الغيب))

انبیائے کرام غیب جانتے ہیں۔

پس اگر بر سبیل تنزل ہم آپ کی یہ اپج تسلیم بھی کر لیں کہ ہم نے یہ عبارت فضیلت ثابت کرنے کے لیے پیش کی ہے تب بھی قتل حسین، وطی حائض اور لواطت زوجہ والی عبارتوں سے ہم پر الزام قائم کرنا آپ کی جہالت ہی ہوگی۔ کیوں کہ ہماری پیش کردہ عبارت میں کفر کی نفی کے بعد صاف صاف علم غیب کا ثبوت ہے۔ لأن الأنبياء يعلمون الغيب. جب کہ آپ کی پیش کردہ عبارتوں میں اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں، اس لیے وہاں کفر کی نفی سے معصیت کی نفی نہ ہوگی۔ اور یہاں معصیت کی نفی بھی نفی کفر کے بعد موجود ہے، اس لیے دونوں کی نفی ہوگی اور فضیلت ثابت ہوگی۔

پھر سن لیجیے اولاً: تو خزانۃ الروایۃ کی عبارت سے حاضر و ناظر ماننے کی فضیلت پر ہمارا

استدلال نہیں، استدلال سمجھنا صرف آپ کی خوش فہمی ہے۔لیکن اگر فضیلت ہونے پر استدلال ہو بھی تو لا یکفر سے نہیں، اسی کے بعد والی عبارت:الأنبیاء یعلمون الغیب. سے ہے،اس لیے کچھ کہنے سے پہلے کافی غور خوض کر لیا کیجیے۔

چوں بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست ۔۔۔ خطا شناس دلبرا خطا ایں جاست

باب فضائل کے چند اہم اصول:

جیسا کہ ہم نے گذشتہ میں کہیں اشارہ کیا ہے کہ غیر مقلد حضرات کی اس غلط فہمی (کہ مسئلہ حاضر و ناظر عقیدہ ہے،اور عقیدہ کا ثبوت دلیل قطعی سے ہوتا ہے،جب کہ اہل سنت و جماعت کی طرف سے اس موضوع پر جتنے دلائل پیش کیے جاتے ہیں سب ظنی الدلالۃ ہوتے ہیں،کوئی بھی اپنے مفہوم میں قطعی نہیں) کے ازالہ کے لیے میں نے باب فضائل کے چند اصول کے عنوان کے تحت یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچایا کہ عقائد میں بھی سب ایسے نہیں ہیں جن کے ثبوت کے لیے قطعی دلائل کی ہی ضرورت ہو، کچھ ایسے بھی ہیں جن کے ثبوت کے لیے ظنی دلائل بھی کافی ہیں۔اور مسئلہ حاضر و ناظر چوں کہ اسی موخر الذکر قسم میں سے ہے۔اس لیے اس کے ثبوت کے سلسلہ میں دلیل قطعی کا مطالبہ غلط ہے،اور میں نے یہ بھی بتایا کہ قسم اول قسم ثانی سے ممتاز کرنے کے لیے ثانی الذکر کو فضیلت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چناں چہ اس امر کو واضح کرنے کے لیے میں نے حسب ذیل طریقہ اختیار کیا ہے۔

(۱) عقائد و فضائل کی یہ تفریق شیخ محقق علی الاطلاق مولانا عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تحریر سے ثابت ہے، بلکہ عقائد کی تمام کتابوں میں یہ تفصیل ملے گی۔

(۲) مسئلہ کو مزید واضح کرنے کے لیے ”باب اعمال“ سے فرض اور سنت وغیرہ کی مثال دی کہ جس طرح اعمال میں فرض وہ ہے کہ دلیل قطعی سے ثابت ہو۔ واجب وسنت وغیرہ وہ ہے کہ دلیل ظنی سے ثابت ہو۔اسی طرح عقائد میں بھی یہ تفریق ہے۔

(۳) پھر نصوص علما سے یہ بات ثابت کی کہ قرآن کے جتنے معنی ہوں سب سے دلیل پکڑی جاسکتی ہے۔دیگر احتمال کی وجہ سے استدلال باطل نہ ہوگا۔

چناں چہ بحث ہی میں نے ان الفاظ سے شروع کی ہے ”سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ“مسئلہ حاضر و ناظر”“علم غیب”یا جسد اطہر کے سایہ نہ ہونے کی بحث یا اس قسم کے

دیگر مسائل ان کا تعلق عقیدہ سے بایں معنی ہرگز نہیں کہ جس طرح حضورﷺ کی رسالت کا اقرار فرض ہے، اسی طرح اس کا اقرار بھی فرض ہے، بلکہ ان کا تعلق فضائل نبیﷺ سے ہے'' اور اسی تفصیل پر بھروسہ کر کے بعد میں جہاں کہیں بھی اس موقف کے اظہار کا موقع آیا ہے ہم نے مختصراً یہ بات دہرادی ہے کہ یہ مسئلہ باب عقائد میں سے نہیں فضیلت میں سے ہے۔

ہماری اس بحث میں چند باتیں بالکل واضح ہیں:

(۱) عقائد میں ظنی اور قطعی کی یہ تفریق ہی ہمارا اصل مدعا ہے، فرض اور سنت کی مثال مسئلہ کو واضح کرنے کے لیے ہے، بالفرض یہ تمثیل یا اس کی وضاحت غلط بھی ہو تو اصل دعویٰ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیوں کہ وہ الگ دلائل سے ثابت ہے، جس کو اس سے اختلاف ہو وہ اس تفریق کی تردید کرے، فرض یا سنت کی تعریف پر اعتراض کرنا نادانی ہے۔

(۲) ہم مسئلہ حاضر و ناظر کے مطلقاً باب عقائد سے ہونے کا انکار نہیں کرتے بلکہ قطعی اور واجب التسلیم ہونے سے انکار کرتے ہیں، رہ گیا فضیلت ہو کر عقیدہ میں شامل رہنا، تو اس کے تو ہم خود ہی مدعی ہیں، جبھی تو ہم نے اسلام کے تسلیم کیے جانے والے احکام جن کو عقائد کہا جاتا ہے، ان کی دو قسمیں عقائد اور فضائل قرار دی ہیں۔

(۳) ہمارا دعویٰ یہ بھی ہے کہ قرآن کے ظنی دلائل بھی قابل استدلال ہیں، ان کو یہ کہہ کر باطل نہیں قرار دیا جا سکتا کہ احتمال پیدا ہو گیا۔ لہٰذا استدلال غلط جس کو اس سے اختلاف ہو ہمارے پیش کردہ نصوص کا رد کرے۔

لیکن قارئین کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ رئیس احمد عرف رئیس الاحرار صاحب نے نہ تو ہمارے پہلے دعویٰ کی تردید کی نہ دوسرے دعویٰ سے تعرض کیا، حد یہ ہے کہ نفی اور اثبات میں ان کا نام بھی نہیں لیا۔ بلکہ ان کا جتنا زور لگ سکا ہے، صرف اس امر پر صرف کیا ہے کہ ہم نے مسئلہ حاضر و ناظر کے باب عقائد سے ہونے کا انکار کیا ہے۔ اور مولوی عتیق الرحمٰن صاحب وغیرہ نے اس کو باب عقائد سے مانا ہے۔ لہٰذا یہ ہمارا بہت بڑا تضاد ہے۔ اور ہمارا پیر کسی بڑی لمبی زلف میں پھنس گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ اس بحث کو ہماری کتاب میں دیکھ لینے کے بعد بنے ہوئے جاہل کے علاوہ کوئی بھی اس غلط فہمی میں گرفتار نہیں ہو سکتا، کہ ہم نے مسئلہ حاضر و ناظر کے مطلقاً

باب عقائد سے ہونے کا انکار کیا ہے، بنے ہوئے جاہل کی بات ہم نے اس لیے کہی ہے کہ خود مولوی رئیس صاحب کو بھی یہ بات مسلم ہے کہ ہم نے اس مسئلہ کو باب عقائد سے مانا ہے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

''مولف ''الشاہد'' اگر چہ ان مسائل کو بایں معنی باب عقائد سے نہیں مانتے کہ ان کا اقرار بھی اقرار رسالت کی طرح فرض ہو لیکن بمعنی دیگر ضرور باب عقائد سے مانتے ہیں۔

(ابطال شواہد الشاہد)

لیجیے تعارض وتدافع کی جو زلف آزاد صاحب نے بڑی محنت سے ہمارے پاؤں میں باندھی تھی آخر میں یہ اقرار کر کے خود ہی کھول دی۔

اصل میں ہمارا کہنا بھی یہی ہے کہ مسئلہ حاضر و ناظر کا اقرار فرض نہیں ہے۔ اس لیے اس کے ثبوت کے لیے دلیل ظنی کافی ہے۔ جیسا کہ جملہ مسائل ظنیہ میں جمیع اہل اسلام کا عمل در آمد ہے۔ اور مولوی عبدالرؤف صاحب کی احتمال پیدا کر کے ہر دلیل کو ظنی بنانے کی کوشش ایک لایعنی جدو جہد ہے۔ رہ گیا یہ سوال کہ ہم نے اس کو فضیلت کے نام سے کیوں موسوم کیا، تو یہ ہماری اپج نہیں ہے، بلکہ علمائے اسلام نے اسی نام سے اس کو موسوم کیا ہے۔ چنانچہ زرقانی اور سیرت حلبیہ میں ہے:

''عادة المحدثين التساهل في غير الأحكام والعقائد مالم يكن موضوعاً.'' [شرح مواهب ،ذكر رضاعته ﷺ]

محدثین کی عادت یہ ہے کہ عقائد اور احکام کے علاوہ میں حدیث موضوع کے علاوہ سے استدلال کرتے ہیں۔

''قد قال الإمام أحمد وغيره من الأئمة :إذا روينا في الحلال والحرام شددنا، وإذا روينا في الفضائل ونحوها تساهلنا.'' [سیرت حلبیہ]

امام احمد وغیرہ اماموں نے کہا کہ حلال وحرام کے مسئلہ میں تو ہم سختی برتتے ہیں۔ اور فضائل اور ان کے امثال میں آسانی سے کام لیتے ہیں۔

اصول غلط نہیں خود بدولت ہی جہالت میں گرفتار ہیں:

دوسرا اعتراض جس پر انہوں نے پورا زور قلم صرف کیا ہے وہ فرض کی تعریف ہے، ہم

نے ظنی اور قطعی کی تشریح کرتے ہوئے کہا تھا کہ جو عمل دلیل سے ثابت ہو اس کا ماننا فرض اور اس کا منکر کافر ہے۔ اس پر مصنف ''تصحیح العقائد بابطال شواہد الشاہد'' نے قرآن عظیم کی تین آیتوں سے معارضہ قائم کیا:

(۱) ﴿اذا قرأت القرآن فاستعذ بالله من الشيطان الرجيم﴾

[النحل: س ۱۶ ـ ت ۹۸]

جب قرآن پڑھو تو اللہ پاک کی شیطان سے پناہ مانگو۔

یہ آیت دلیل قطعی ہے لیکن حنفیوں کے نزدیک بھی تلاوت سے پہلے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھنا سنت ہے۔

(۲) ﴿فاذا قضيت الصلاة فانتشروا في الأرض وابتغوا من فضل الله﴾

[الجمعة: س ـ ت]

جب نماز جمعہ پڑھ چکو تو زمین میں پھیل کر رزق تلاش کرو۔

یہ آیت بھی نص قطعی ہے، جس میں نماز جمعہ کے بعد تلاش رزق کا حکم ہے، حالاں کہ یہ حکم بھی علماے احناف کے نزدیک فرض نہیں بلکہ سنت ومستحب ہے۔

(۳) ﴿وانكحوا الايامىٰ والصالحين من عبادكم وامائكم﴾

[النور: س ۲۴ ـ ت ۳۲]

غیر شادی شدہ عورتوں کا نکاح کرو، اور نیک غلاموں اور باندیوں کی شادی کرو۔

حالانکہ یہ شادی بھی نہ فرض ہے نہ ضروری۔ اس لیے یہ ثابت ہوا کہ یہ اصول ہی غلط ہے، کہ جو دلیل قطعی سے ثابت ہو فرض ہے۔

یہ پورا اعتراض پڑھ کر ہم کو ''ابطال'' کے مولف سے زیادہ اس کے مربیوں اور اساتذہ پر افسوس ہوا، کہ یہ لوگ کس قدر لاابالی ہیں کہ ایک ''گلی ڈنڈا'' کھیلنے والے ''بالک'' کو کھیل کود کے میدان سے اٹھا کر تصنیف و تالیف کی کرسی پر بٹھا دیا۔ اور علم کی عزت وحرمت کا انہیں اک ذرا پاس نہ ہوا۔ نہ احساس ہوا کہ ہم نے یہ مقدس ڈیوٹی کیسے نااہلوں کو دی ہے۔ وجہ افسوس ملاحظہ ہو:

''رئیس صاحب کی مادر تعلیم ندوہ ہے، جہاں کے اساتذہ میں نام نہاد احناف کی کثرت ہے، اور ان کے مربی خاص مولوی عبد الرؤف صاحب جھنڈے نگری ہیں جو غیر مقلد ہیں اور

اپنے دماغ کو منطق اسلامی کا خزانہ قرار دیتے ہیں، حنفی حضرات سے گذارش ہے کہ آپ لوگوں نے اپنے شاگرد رشید کو منار اور مسلم الثبوت بھی نہیں پڑھائی۔ جس میں صاف تحریر ہے:

"والحنفية لاحظوا حال الدال فقالوا: إن ثبت الطلب الجازم بقطعي فالافتراض والتحريم، أو بظني فالإيجاب وكراهة تحريم."

[مسلم الثبوت ص:۲۶]

حنفیہ نے لفظ کا لحاظ کر کے کہا کہ طلب جازم اگر دلیل قطعی سے ثابت ہے تو فرض اور حرام ہے، اور دلیل ظنی سے ثابت ہو تو واجب اور مکروہ تحریمی ہے۔

اور غیر مقلد صاحبان سے گزارش ہے کہ آپ حضرات نے نواب صدیق حسن خاں صاحب کی کتاب "حصول المامول" بھی نہیں دیکھی جس میں وہ لکھتے ہیں:

"فالواجب في الاصطلاح مايمدح فاعله، ويذم تاركه، وينقسم إلى معين، ومخير، ومضيق، وموسع، وإلى الأعيان، وإلى الكفاية، ويرادفه الفرض عند الجمهور. وقيل: الفرض ما كان دليله قطعياً، والواجب ما كان دليله ظنياً، والأول أولىٰ."

[حصول المامول من علم الاصول ص:۳۰]

واجب اصطلاح میں وہ ہے کہ جس کا کرنے والا قابل تعریف ہو اور تارک قابل ملامت۔ اور اس کی قسموں میں معین، مخیّر، مضیق، موسع، واجب عین اور واجب کفایہ ہے، اور جمہور کے نزدیک اسی کو فرض کہا جاتا ہے۔ اور بعض لوگوں نے یہ تعریف کی ہے، کہ فرض وہ جو دلیل قطعی سے ثابت ہو اور واجب وہ جو دلیل ظنی سے۔

اس عبارت میں نواب صاحب نے فرض کی وہی تعریف کی جو ہم نے تحریر کی ہے۔ ہاں اس کو خلاف اولیٰ قرار دیا، تو کیا خلاف اولیٰ کے معنی باطل اور غلط ہوتے ہیں؟ اگر نہیں تو سوال یہ ہے کہ ہمارا قصور اس کے سوا کیا ہے؟ کہ حنفی ہونے کے ناطے ہم نے فرض کی اسی تعریف کا ترجمہ کردیا جو حنفیوں کی طرف منسوب ہے اور جس کو غیر مقلدین کے مرجع نواب صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ہاں دوسری تعریف کو اس سے بہتر قرار دیتے ہیں:

پھر وہ بریلویوں کا ایک غلط اصول کیسے ہوگیا۔ وہ تو حنفیوں کا مسلمہ اور غیر مقلدوں کا مصحح اصول ہوا۔ ہاں آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کو غلط اصول قرار دینا "غیر مقلدین کی

جہالت اور علم اصول فقہ سے ناواقفیت ہے''۔

اب ہم ان بالک صاحب کا دماغ صحیح کرنے کے لیے ردالمحتار المعروف بہ شامی سے دلائل شرعیہ کی تفصیل نقل کرتے ہیں تا کہ ان کی سمجھ میں آجائے کہ آیات مذکورہ بالا نص قطعی ہوتے ہوئے بھی ان سے ثابت ہونے والے مسائل فرض کیوں نہ ہوے:؟

''أقول: بيان ذلک أن الدلائل الشرعية أربعة: الأول قطعي الثبوت قطعي الدلالة، كنصوص القرآن المفسرة والمحكمة، والسنة المتواترة التي مفهومها قطعي. والثاني قطعي الثبوت ظني الدلالة، كآيات المؤولة. الثالث عكسه، كأخبار الأحاد التي مفهومها قطعي. الرابع ظنيهما، كأخبار الأحاد التي مفهومها ظني. فبالأول تثبت الفرض والحرام، وبالثاني والثالث الواجب وكراهة التحريم، وبالرابع السنة والمستحب.''

اس کا بیان اس طرح ہے کہ دلائل شرعیہ کی چار قسم ہے:

(۱) قطعی الثبوت قطعی الدلالۃ، جیسے: قرآن عظیم کی آیات محکمات ومفسرات اور حدیث متواتر قطعی الدلالۃ۔

(۲) قطعی الثبوت ظنی الدلالۃ، جیسے: وہ آیات جس کی تاویل میں علما کا اختلاف ہے۔

(۳) اس کا الٹا، جیسے: حدیث احاد جو قطعی الدلالۃ ہوں۔

(۴) دونوں اعتبار سے ظنی ہوں، جیسے: حدیث احاد جو اپنے مفہوم میں قطعی الدلالۃ نہ ہوں۔

قسم اول سے فرض وحرام ثابت ہوتا ہے۔ دوسری تیسری سے واجب اور مکروہ تحریمی اور چوتھی سے سنت اور مستحب۔

دیکھیے علامہ کس وضاحت سے فرماتے ہیں کہ قطعیت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ثبوت کی اور دلالت کی۔ اور جب دونوں قسم کی قطعیت ہو تو فرض ثابت ہوتا ہے۔ آپ کی ذکر کی ہوئی آیتیں قطعی الثبوت ضرور ہیں لیکن قطعی الدلالۃ ہرگز نہیں۔ بلکہ موخر الذکر دو آیتوں میں تو باتفاق علمائے کرام ''امر'' وجوب کے لیے ہے ہی نہیں۔ تخییر واباحت کے لیے ہے، اس لیے وہی ثابت ہوگا۔ آپ نے قطعی کو قطعی الثبوت میں منحصر سمجھا اس لیے اعتراض فرمادیا۔ اور آپ حضرات

معذور بھی ہیں۔آپ کو آپ کی غیر مقلدیت ان معارف علمیہ تک کب پہونچنے دے گی۔
رئیس صاحب! آدمی کو ہمیشہ اپنے جامے کے اندر رہنا چاہیے۔کیوں کہ باہر قدم رکھنے کا نتیجہ ہمیشہ خراب ہوتا ہے۔آپ کی اس جرأت رندانہ کا نتیجہ آپ نے دیکھا۔آپ کے ساتھ ساتھ آپ کے اساتذہ کی مٹی بھی پلید ہوئی۔مزید برآن یہ داغ آپ کے چہرہ کو سیاہ بنائے ہوئے ہے کہ اصل مسئلہ پر حیرت ناک خموشی اور بے نمکی اور فاضل مسائل پر یہ شوراشوری:

باخراباتِ نشیناں زکرامات خلاف
ہرسخن جائے وہر نکتہ مکانے دارد

پھڑ بازی:

منکرین علم غیب نبوت اپنے مدعا کے ثبوت میں بیش تر آیات یا احادیث اس قسم کی پیش کرتے ہیں، جو کسی خاص جزئے سے تعلق رکھتی ہوں۔مثلاً ان کا استدلال ہے کہ قرآن عظیم میں ہے:

﴿وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لاَ تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ﴾
[التوبة:س ۹۔ت ۱۰۱]

اہل مدینہ کچھ ایسے ہیں جو نفاق پر سرکش ہیں آپ انہیں نہیں جانتے ہم جانتے ہیں۔
یا آیت قرآنی:

﴿وَمَا أَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلاَ بِكُمْ﴾[الأحقاف:س ۴۶۔ت ۹]
مجھے نہیں معلوم کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔

یا اس قسم کی حدیث کہ مسئلہ (افک) میں رسول اللہ ﷺ ایک ماہ ضیق میں رہے پھر آیت نازل ہوئی، پس اگر رسول اللہ ﷺ عالم غیب ہوتے تو اللہ پاک یہ کیوں فرماتا کہ آپ نہیں جانتے۔یا آپ کیوں فرماتے کہ میں نہیں جانتا۔یا آپ غیب داں ہوتے تو مہینہ بھر کیوں پریشان رہتے۔اور وحی کا انتظار کیوں کرتے خود نہیں بتادیتے کہ میری بیوی بری ہے۔وغیرہ وغیرہ۔

علمائے اہل سنت اس قسم کے استدلال وشواہد کا جواب متعدد طریقے سے دیتے ہیں، جن سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اہل زیغ کا یہ استدلال باطل ہے۔انہیں جوابوں میں

سے ایک جواب یہ بھی ہے کہ بے شک رسول اللہ کو اس وقت معلوم نہ تھا۔ لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے بتا دیا (جیسا کہ ثبوت آگے آرہا ہے) پس اگر ہمارا یہ دعویٰ ہوتا کہ آپ پیدا ہوتے ہی جمیع ما کان وما یکون کے عالم ہوگئے، تب البتہ آپ ان آیتوں سے ہمارے خلاف استدلال قائم کر سکتے تھے۔ لیکن ہمارا تو دعویٰ یہ ہے کہ یہ علم آپ کو تدریجاً حسب تعلیم الٰہی حاصل ہوا۔ اور نزول قرآن کی تکمیل کے ساتھ ساتھ مکمل ہوا۔ پس مکمل نزول قرآن کے بعد اگر آپ کوئی آیت یا حدیث قطعی الدلالۃ لاسکیں جس سے علم غیب رسول کی نفی ہو سکے تو ٹھیک ورنہ آپ کا استدلال باطل ہے۔

ظاہر ہے کہ اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد منکرین کے دلائل کا بیش تر حصہ بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ اس لیے اپنی زخمی دلیلوں کی مرہم پٹی کے لیے رئیس احمد صاحب نے ایک ''پھڑ باندھی'' اور پیش بندی فرمائی، چنانچہ فرماتے ہیں:

''اصل بحث شروع کرنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی ضروری ہے، کہ جن آیتوں کو بریلوی لوگ رسول اللہ ﷺ کے حاضر و ناظر اور عالم الغیب ہونے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں ان آیتوں کا مطلب اگر درحقیقت یہ ہے کہ آپ حاضر و ناظر اور عالم الغیب ہیں۔ تو لازمی طور پر ماننا ہوگا کہ جس وقت یہ آیتیں اتریں اسی وقت آپ حاضر و ناظر ہو گئے۔ اس وقت کے بعد کسی ایسی آیت کا نازل ہونا ناممکن و محال ہے، جس سے آپ کے حاضر و ناظر ہونے کی نفی اور تردید ہوتی ہے۔

مثلاً: ﴿وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ.﴾

ہی کی آیت کو لے لیجیے، جب اس آیت کے تحت (مکہ میں ہی آپ) تمام چیزوں پر حاضر و ناظر ہوئے۔ تو مدینہ منورہ میں قرآن کا یہ کہنا کہ:

﴿وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ﴾

[التوبۃ: س ۹۔ ت ۱۰۱]

کیوں کہا گیا؟ کہ آپ منافقین کو نہیں جانتے''۔

[ابطال ص: ۳۶۔۳۷۔۳۸]

مطلب رئیس صاحب کا یہ ہے کہ اگر مدعیان علم غیب رسول آپ کو ابتدا ہی سے سب

چیزوں کا عالم نہیں مانتے پھر بھی ان کو لازم ہے کہ مانیں تاکہ ہم ان کے خلاف استدلال قائم کر سکیں، کیوں کہ بغیر اس مفروضے کے منکرین کی سب دلیلیں لنگڑی ہیں۔

میں کہتا ہوں: آیت رحمۃ للعالمین جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ عالم غیب اور حاضر وناظر ہیں، مکہ میں اتری، تو اس کے لیے یہ کیوں ضروری ہے کہ آپ اسی وقت ساری چیزوں کے عالم ہوں؟۔

رسالت کا منصب آپ ﷺ کو بقول آپ حضرات کے ہجرت کے ۱۲ رسال قبل مکہ میں ملا۔ (اور آپ کی منطق ہے کہ جو عہدہ جب ملے اسی وقت اس کی ساری جزئیات اور تفصیلات پر صاحب منصب کی آگاہی بھی ضروری ہے) تو کیا اپنی اسی منطق کے تحت آپ اس بات کے قائل ہوں گے کہ اسی دن آپ کو سارے احکام اسلام بتادیے گئے، اور اس کے بعد کسی ایسی آیت کا اترنا محال ہے جس میں احکام اسلامی کا بیان ہو۔ اگر نہیں تو پھر ہمارے لیے یہ ماننا کیوں ضروری ہے؟ کہ آیت رحمۃ للعالمین. کے نزول کے وقت ہر شی کا عالم ہونا بھی ضروری ہے۔

اور سنیے اللہ پاک ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَاناً لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾

ہم نے آپ پر کتاب اتاری جس میں ہر شی کا بیان ہے۔

یہ آیت شریفہ مکی ہے۔

اس کا مطلب علماے اہل سنت بیان فرماتے ہیں: بیان ما کان وما یکون، جو ہوا اور ہوگا سب کا بیان ہے۔

آپ لوگ کہتے ہیں: لكل شيء يحتاج اليه في الدين. ان ساری باتوں کا بیان ہے جس کی ضرورت دین میں پڑے۔

تھوڑی دیر کے لیے ہم اسے ہی مان لیتے ہیں، اب آپ کی منطق یہ ہے کہ جو چیز اس آیت سے ثابت ہو رہی ہے پوری کی پوری اسی وقت موجود ہونا چاہیے۔ تو سوال یہ ہے کہ آیت ﴿تبياناً لكل شيء﴾ کے نزول کے ساتھ ساتھ ہی وہ سارے احکام بیان ہو چکے تھے جن کی ضرورت دین میں ہے۔ اور پوری کتاب اتر چکی تھی جس کے اترنے کا بیان اس آیت میں ہے۔ اگر نہیں اور ضرور نہیں تو آیت رحمۃ للعالمین کے نزول کے وقت سارے علوم سے آگاہی

کیوں ضروری ہے؟ مولانا دھاندلی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے:

الٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
ناطاقتی کے طعنے ہیں عذر جفا کے ساتھ

مولانا! یہ میدان استدلال ہے، یہاں پھڑ بازی اور نظر بندی سے کام نہیں چلے گا اور مردہ دلیلوں میں آپ کے شعبدوں سے جان نہیں آئے گی۔ یہ حقیقت عالم آشکار ہو چکی ہے کہ آپ حضرات کے پاس دلیل نہیں ہے، معارضے کے لیے چند جزئیات ہیں۔ وہ بھی بعد از وقت۔

حضور جسمی کی بحث:

کتاب ''ابطال شواہد الشاہد'' کل ایک سو بارہ صفحے کی کتاب ہے، اکتالیس صفحے کے بعد دلائل شروع ہوتے ہیں، لیکن پڑھنے والوں کو حیرت ہوگی کہ حاضر وناظر نہ ہونے پر کوئی دلیل ان کے پاس نہ تھی۔ جبھی تو بحث کا آغاز معارضے سے کیا ہے۔ چناں چہ عنوان قائم کرتے ہیں ''حاضر وناظر ہونے پر شرعی استحالہ'' اور تفصیل میں چار آیتیں پیش کی ہیں۔ سورہ انعام آیت ۶۸۔ ۷۰۔ سورہ نساء آیت ۱۴۰ پارہ اٹھارہ ع ۶ آیت ۹۷۔ ہم اسی میں وہ آیت بھی شمار کر لیتے ہیں، جس کو انہوں نے سولھویں نمبر پر تحریر کیا وہ سورہ قصص آیت: ۴۴۔ ان آیات میں رسول اللہ ﷺ اور ان کی امت کو خلاف شرع مجالس میں شرکت سے منع کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی بے شمار مجلسیں ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ بحکم شرع شریک نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح بعض آیتوں میں یہ تلقین ہے کہ آپ دعا فرمائیں کہ شیطان آپ کے پاس نہ آویں۔ تو جہاں جہاں شیطان ہوں آپ وہاں نہیں ہو سکتے۔ اور آخری آیت میں تصریح ہے کہ اللہ پاک فرماتا ہے ہم جب موسیٰ علیہ السلام کو احکام عطا کر رہے تھے تو آپ طور کے مغربی حصہ میں موجود نہ تھے، پس ان سب آیتوں سے آپ کا متعدد مکانات میں حاضر نہ ہونا ثابت ہوا پھر سارے جہان پر حاضر وناظر کس طرح ہوئے؟۔

علمائے اہل سنت کا یہ کہنا کہ ان آیات کو بار بار پڑھیے، مجالس کی شرکت، شیطان کا پاس نہ آنا، اور طور کے پاس موجود نہ رہنا، یہ سب جسم سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ آپ اپنے مادی جسم کے ساتھ ان جگہوں میں نہ رہیں یا موجود نہ تھے۔ کیوں کہ مثلاً جب

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت عطا ہو رہی تھی تو رسول اللہ ﷺ پیدا ہی نہ ہوئے تھے، تو آپ کا مادی جسم وہاں کہاں موجود رہے گا۔ لیکن اس کا مطلب یہ اخذ کرنا کہ جسم کے ساتھ موجود نہ ہو تو حاضر و ناظر نہیں سخت نادانی ہے۔ اور سنی رسول اللہ ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے کے جو معنی قرار دیتے ہیں اس سے شدید جہالت ہے۔ علمائے اہل سنت نے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا ہے کہ آپ کے حاضر و ناظر ہونے کا یہ مطلب ہے کہ آپ ہر جگہ ظاہری جسم کے ساتھ موجود ہیں۔ آپ ہماری کتاب میں ''معنی حاضر و ناظر'' کا عنوان پڑھیے۔ اس میں صاف صاف تحریر ہے

(۱) سرور عالم ﷺ ایک جگہ تشریف فرما ہیں۔ اور سارے حجابات اٹھا دیے گئے ہیں۔ آپ سب کو دیکھ رہے ہیں۔

(۲) کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کہیں قوت روحانی کے ساتھ اور کہیں جسم مثالی کے ساتھ اور کہیں جسم اطہر کے ساتھ پہونچ سکتے ہیں۔

جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ہم ہر جگہ آپ کے جسم اطہر کے ساتھ موجود رہنے کے قائل نہیں۔ پس اگر کچھ آیتوں سے آپ کے جسم کے ساتھ وجود کی نفی نکلتی ہے تو ہمارا کیا نقصان؟ نقصان تو تب تھا کہ علم کی نفی ثابت ہوتی۔ اور یہ ثابت کرنا آپ کے بس کا کام نہیں۔ آپ کیا آپ کے اکابر آج تک عاجز ہیں۔

اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے آج سے پچاس سال قبل اعلان فرمایا تھا:

ہاں ہاں تمام نجدیہ دہلوی و گنگوہی، جنگلی و کوہی سب کو ہی دعوت عام ہے۔ اجمعوا شرکائکم چھوٹے بڑے سب اکٹھے ہو کر ایک آیت قطعی الدلالۃ، یا ایک حدیث متواتر یقینی الافادہ چھانٹ لائیں، جس سے صاف صریح طور پر ثابت ہو کہ تمامی نزول قرآن عظیم کے بعد اشیا مذکورہ ماکان و ما یکون سے فلاں امر حضور پر مخفی رہا جس کا علم حضور کو نہ دیا گیا۔

﴿فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَاعْلَمُوا اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِيْنَ﴾

(انباء المصطفیٰ)

جو آج تک لاجواب ہے۔

مولوی عبد الرؤف صاحب کی پیش کردہ آیات جن میں آپ کے حضور جسمی کی نفی

تھی، ہم نے ان کے جواب میں صاف صاف لکھ دیا تھا، اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں کہ ہم حضور جسمی کے گذشتہ زمانہ میں قائل ہوں، نہ اس کو آپ ہمارے بیان کردہ معنیٰ "حاضر و ناظر" سے ثابت کر سکتے ہیں، فاضل رحمانی نے خواہ مخواہ قرآن عظیم کی ان آیتوں کو پیش کر کے جن میں حضور جسمی کی نفی ہے کتاب کے اوراق میں اضافہ کیا ہے۔

اس کے بعد بھی آزاد صاحب کی یہ کذب بیانی کہ "فاضل رحمانی نے بریلوی مشن سے دریافت کیا تھا کہ جن جگہوں پر رسول اللہ ﷺ کا موجود و حاضر رہنا مناسب نہیں، کیا وہاں بھی آپ کو حاضر و ناظر مانا جا سکتا ہے؟ تو بریلوی مشن مولانا جھنڈے نگری کے اس سوال کے جواب میں خاموش رہا"، جیتی مکھی نگلنا ہے۔

آزاد صاحب بریلوی مشن خاموش نہیں رہا، آپ ہی مر گئے ہیں۔ سنایا زندوں کو جاتا ہے مردوں کو نہیں، ارشاد باری ہے:

﴿إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ﴾

[النمل: س ۲۷۔ ت ۸۰]

پھر کان کھول کر سن لیجیے دعویٰ ہمارا یہ ہے کہ..

(۱) آپ کو سب کا علم ہے اس لیے آپ حاضر و ناظر ہیں۔

(۲) آپ ایک جگہ ہیں اور سارے حجابات اٹھا دیے گیے ہیں، اس لیے آپ سب کو دیکھ رہے ہیں، اس لیے آپ حاضر و ناظر ہیں۔

(۳) آپ کسی جگہ اپنے حقیقی جسم کے ساتھ موجود ہیں اور بعض دوسری جگہ جسم مثالی کے ساتھ اور کسی جگہ روحانی طاقت سے۔ (ہر جگہ جسم حقیقی کے ساتھ نہیں) اس لیے آپ حاضر و ناظر ہیں، ان تینوں معانی میں سے کوئی ایک معنیٰ بھی ثابت ہو ہمارا مدعا ثابت ہے، اب بتایے کہ آپ کی پیش کردہ وہ آیات اور ہمارے دعویٰ میں کون سا تضاد ہے؟۔

معارضہ یا بددیانتی:

ان آیتوں کے ذکر کے بعد جن میں کچھ مقامات پر حضور ﷺ کے جسم کے ساتھ موجود نہ رہنے کا بیان ہے۔ رئیس صاحب نے ایسی آیتیں ذکر کی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو بعض جزئیات کا علم نہیں۔ چنانچہ سورۂ احقاف آیت ۹ (جس کا مفہوم یہ ہے کہ پیغمبر ﷺ

نے فرمایا: مجھے نہیں معلوم کہ میرے تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا) اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، ہم اسی کے ساتھ سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۱ کو بھی شامل کر لیتے ہیں جس میں یہ بیان ہے کہ بعض منافقین مدینہ کا حال رسول اللہ کو نہیں معلوم۔

جواب میں ہمارا یہ کہنا ہے کہ مذکورہ بالا آیات ہرگز ہمارے مدعا کے منافی نہیں۔ بلکہ ہمارا تو دعویٰ یہ ہے کہ صرف یہی دو خبریں نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ عالم غیب یا حاضر و ناظر آپ خدا کے بتانے اور مشاہدہ کرانے سے ہوے ہیں۔ پس اگر کسی آیت سے یہ ثابت ہو جائے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے منافقین مدینہ کا حال اور حضور ﷺ اور مسلمانوں کے انجام کی خبر حضور ﷺ کو نہیں دی، تب البتہ ہمارے مدعا کے خلاف ہوگا۔ لیکن حقیقت حال یہ نہیں ہے، بلکہ مفسرین کا کہنا یہ ہے کہ آیت مبارکہ ﴿لا أدري ما يفعل بي ولا بكم﴾ (مجھے نہیں معلوم کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا ہوگا) ابتدائے حال کی ترجمان ہے۔ بعد میں رسول اللہ ﷺ کو سب کی اطلاع دے دی گئی۔ چنانچہ کتاب الناسخ میں امام ابوداؤد فرماتے ہیں:

”عن عكرمة عنه رضى الله تعالىٰ عنه في قوله تعالىٰ: ﴿ولا أدري ما يفعل بي ولا بكم﴾، قال: نسختها آية الفتح، فقال رجل من المؤمنين: هنيالك يا نبي الله! قد علمنا الآن ما يفعل بك، فماذا يفعل بنا؟ فانزل الله في سورة الأحزاب ﴿ وبشر المؤمنين بأن لهم من الله فضلاً كبيراً ﴾ وقال: ﴿ليدخل المؤمنين والمؤمنات جنات﴾ الآية. فبين الله ما يفعل بهم.“

[بحوالہ الدولۃ المکیہ ص: ۲۲۷۔۲۲۸]

حضرت عکرمہ انہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آیت مبارکہ: ﴿ولا أدرى ما يفعل بى ولا بكم﴾ کو سورۂ فتح کی آیت ﴿ليغفر لک الله﴾ نے منسوخ کر دیا۔ آیت فتح کے بعد ایک مسلمان نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ کو مبارک ہو، اب تو ہم کو بھی معلوم ہو گیا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ ہمارے ساتھ کیا ہوگا یہ البتہ نہیں معلوم، تب سورۂ احزاب کی آیت اتری کہ مسلمانوں کو اللہ کے فضل عظیم کی بشارت دے دو اور اللہ مومنین اور مومنات کو جنت میں داخل کرے گا۔ پھر تو سبھی کا انجام معلوم ہو گیا۔

یوں ہی کمالین حاشیہ جلالین میں ہے:

"قال ابن الجوزی الصحیح في معنی آیة قول الحسن وعن ابن عباس وانس وعکرمة وقتادة معناه: لا أدري حالي ولا حالکم في الآخرة ،ثم نزل بعد ﴿لیغفرلک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر﴾ فقالوا:هنیالک قد علمنا ما یفعل بک ،ثم نزل ﴿لیدخل المؤمنین والمؤمنات جنات﴾."

[کمالین مطبع فاروقی ص:٤١٤]

ابن جوزی نے کہا کہ آیت کے معنی میں صحیح حسن بصری کا قول ہے۔ابن عباس،انس،عکرمہ،اور قتادہ سے ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ آخرت میں مجھ کو اپنا اور تمہارا حال معلوم نہیں لیکن اس کے بعد سورہ فتح کی آیت نازل ہوئی تو صحابہ نے کہا کہ آپ کو مبارک ہو اب تو ہم کو بھی آپ کا حال معلوم ہو گیا، پھر مومنوں کے جنتی ہونے کی بشارت نازل ہوئی۔

اب تو صاف صاف واضح ہو گیا کہ حضور ﷺ نے لاعلمی کا اظہار پہلے فرمایا تھا، بعد میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو خود ان کے اور دیگر اہل اسلام کے حال کی خبر دے دی۔

لیکن ہم کو رئیس صاحب کی ذہانت پر حیرت ہے کہ یہ تشریحات موجود ہوتے ہوئے بھی کہ آیت مبارکہ لا أدری منسوخ ہے اور بعد میں رسول اللہ ﷺ کو سب کی خبر دے دی گئی ہے، چمک کر اسی منسوخ آیت سے استدلال کرتے ہیں۔اور اسی کو مسلمانوں کا اجماعی مسئلہ قرار دیتے ہوئے انہیں شرم بھی نہیں ہوتی۔سچ فرمایا مخبر صادق نے:

"إذالم تستحي فاصنع ماشئت."

بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن۔

دوسری آیت:

﴿ومن أهل المدینة مردوا علی النفاق لا تعلمهم نحن نعلمهم﴾

[التوبة:س ٩۔ت ١٠١]

اہل مدینہ میں کچھ سرکش منافق ہیں آپ ان کو نہیں جانتے ہم جانتے ہیں

اس کے بعد بھی:

﴿مَّا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾[آل عمران:س ٣۔ت ١٧٩] اتری۔

امام طبری فرماتے ہیں:

''یعنی بقوله :﴿ما كان الله ليذر المؤمنين على ما أنتم عليه﴾من التباس المؤمن بالمنافق، فلا يعرف هذا من هذا، حتى يميز الخبيث من الطيب، يعني بذلك حتى يميز الخبيث، وهو المنافق المستر لكفر، من الطيب، وهو المؤمن المخلص الصادق الايمان.'' [طبری جلد رابع ص:۱۱۶]

اللہ پاک نے اپنے قول (اللہ تعالیٰ مومنین کو اس حالت پر نہیں چھوڑے گا جس پر تم ہو) سے یہ مراد لی ہے کہ مومن ومنافق گھلے ملے ہیں اس کا اس سے امتیاز نہیں ہوتا تو وہ خبیث یعنی منافق کو جو کفر چھپاتا ہے مومن مخلص صادق الایمان سے صاف صاف الگ اور ممتاز رہے گا۔

امام بغوی آیت مبارکہ:

﴿وَلَوْ نَشَاءُ لَأَرَيْنَاكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُم بِسِيمَاهُمْ﴾[محمد:س ۴۷۔ت ۳۰]

ہم چاہیں تو آپ کو انہیں دکھادیں تو آپ انہیں علامتوں سے پہچان لیں

کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''قال أنس: ما خفي على رسول الله ﷺ بعد نزول هذه الآية شيء من المنافقين، كان يعرفهم بسيماهم.''

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد کوئی منافق بھی حضور ﷺ پر پوشیدہ نہیں رہا سب کو علامتوں سے پہچان گئے۔

امام بغوی آیت مبارکہ کی شان نزول میں فرماتے ہیں:

''قال السدي: قال رسول الله ﷺ :عرضت علي أمتي كما عرضت علىٰ آدم ، وأعلمت من يؤمن بي، ومن يكفر، فبلغ ذلك المنافقين فقالوا استهزاء: زعم محمد ﷺ أنه يعلم من يؤمن به ومن يكفر ممن يخلق بعد، ونحن معه وما يعرفنا، فبلغ ذلك رسول الله ﷺ فقام على المنبر، فحمد الله وأثنى عليه ثم قال: ما بال أقوام طعنوا في علمي، لا تسئلوني عن شيء فيما بينكم وبين الساعة إلا نبأتكم.'' [حاشیہ دولۃ المکیہ ص:۱۵۳]

امام سدی فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے اوپر میری امت کے سب لوگ پیش کیے گئے، جس طرح حضرت آدم علیہ السلام پر ان کی اولاد پیش ہوئی تھی، تو میں نے اس کو بھی پہچان لیا جو مجھ پر ایمان لائے اور اس کو بھی جو کفر کرے گا۔ اس پر منافقین نے مذاق اڑایا کہ پیغمبر ﷺ آیندہ پیدا ہونے والے انسانوں میں مومنوں اور کافروں کے جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں، اور ہم ان میں کافر ہیں ہمیں ہی نہیں جانتے، تب آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر اللہ کی حمد وثنا کی پھر منافقین کو للکارا کہ کچھ لوگوں کو کیا ہو گیا کہ میرے علم میں طعنہ کرتے ہیں، آج سے قیامت تک کی جو خبر چاہو پوچھو بتاؤں گا۔

ان نصوص کی مزید وضاحت کی ضرورت قطعاً نہیں۔ یہ بانگ دہل اعلان کر رہی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو بعد میں ہر ہر منافق کا علم ہو گیا تھا۔

کیا اب ہم بھی رئیس صاحب سے انہیں کے لب ولہجہ میں پوچھ سکتے ہیں، کہ حضرت عکرمہ، ابن جوزی، امام طبری، امام بغوی، امام سدی، وغیرہ ائمہ اسلام پر وہابی مشن کیا فتویٰ لگائے گا؟ حق یہ ہے کہ وہابی مذہب کی بنا اس قسم کی چالاکیوں پر ہے۔ منسوخ آیتوں سے استدلال کریں، مدعی کو اپنی مرضی کے موافق ترمیم پر مجبور کریں۔ مدعی پر غلط اقرار کا الزام قائم کریں۔

علوم خمسہ کی بحث:

آیات نفی میں: ﴿ان اللہ عندہ علم الساعۃ وینزل الغیث. الآیۃ﴾

[لقمان: س ۳۱۔ ت ۳۴]

رئیس صاحب نے پور زور صرف کیا ہے، اس لیے ہم بھی تھوڑی تفصیل سے بات کرتے ہیں۔

بحث کو سمجھنے کے لیے یہ ضری ہے کہ پہلے علمائے اہل سنت و جماعت کا موقف بیان کر دیا جائے۔ حضرت مولانا احمد رضا خاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جو بقول رئیس صاحب اس مسئلہ کے موجد اور بانی ہیں ان کا بیان سنیے:

”فاللہ تعالیٰ۔عزت عظمتہ۔ أعطی حبیبہ ﷺ علوم جمیع الأولین والأخرین، وأراہ الشرق والغرب والعرش والفرش، وجعلہ شاھد ملکوت

السموات والأرض، وعلمه ما كان وما يكون من أول يوم إلى القيامة.“

[الدولۃ المکیہ ص:۱۲۲]

اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے اپنے حبیب ﷺ کو تمام اولین وآخرین کا علم دیا، مشرق ومغرب اور عرش وفرش دکھائے، اور آسمان وزمین کی بادشاہیوں کا شاہد بنایا، پہلے دن سے قیامت تک ہونے والے حوادث کا علم بخشا۔

اسی میں ہے:

”وقد ثبت علم جميع الخمس سوى الساعة على خلاف فيها.“

علوم خمسہ (قیامت، بارش، فی الارحام، کل کیا کمائیں گے، اور کہاں مریں گے) میں قیامت کے علاوہ وہ سب کا علم آپ کو ہے۔ علم قیامت میں کچھ لوگوں کو اختلاف ہے۔

مزید فرماتے ہیں:

”فانا لا ندعى أنه ﷺ قد أحاط بجميع معلومات الله سبحانه وتعالىٰ؛ فإنه محال للمخلوقات، وسنلقي عليك أن تعليم الله تعالىٰ لنبيه ﷺ كان بالقرآن، والقرآن نزل نجماً نجماً ولم يكن ينزل كل وقت، فصدق البعض في الأوقات وفي المعلومات جميعاً.“ [کتاب مذکور ص۴۸]

ہم اس بات کا دعویٰ نہیں کرتے کہ رسول اللہ ﷺ نے تمام معلومات الٰہی کا احاطہ کرلیا ہے، کہ یہ تو مخلوق کے لیے محال ہے اور ہم تمہیں یہ بھی بتائیں گے کہ اللہ پاک نے اپنے پیغمبر کو قرآن عظیم کے ذریعہ تعلیم دی اور وہ تھوڑا تھوڑا کر کے اترا۔ ہر دم اس کا نزول جاری ہی نہیں رہتا تھا۔ تو معلوم ہوا کہ رسول کا علم معلومات کے لحاظ سے بھی بعض اور وقت کے اعتبار سے بھی بعض ہے۔

ان عبارتوں سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوئیں:

(۱) رسول اللہ ﷺ کا علم بعطائے الٰہی ہے۔

(۱) دو حدوں کے بیچ محصور ہے، یعنی ابتدائے آفرینش سے آخری دن تک۔

(۳) علوم خمسہ ان میں داخل ہے، قیامت کے بارے میں بعض علما کو اختلاف ہے، وہ کہتے ہیں: کہ آپ کو قیامت کا علم نہ تھا۔

(۴) علیٰ اختلاف الاقوال یہی علم ما کان وما یکون ہے،سو وہ بھی آپ کو شروع سے معلوم نہ تھا تدریجاً حاصل ہوا،اس لیے تکمیل علم سے پہلے اگر کسی چیز کے علم کی آپ سے نفی کی گئی ہوتو یہ امر آپ کے عالم ما کان وما یکون ہونے کے منافی نہیں ہے۔اب رئیس صاحب کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

آیت پاک میں صراحت ہے کہ موجودہ پانچ چیزوں کا علم رسول اللہ ﷺ کو بھی نہیں ہے۔ [ابطال ص:۴۷]

ہماری گذارش ہے کہ یہ صریح جھوٹ ہے،آیت قرآنی کے الفاظ یہ ہیں:

(۱) ﴿إِنَّ اللهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾[لقمان:س ۳۱۔ت ۳۴]

بے شک اللہ کے پاس ہے،قیامت کا علم۔

(۲) ﴿وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ﴾[لقمان:س ۳۱۔ت ۳۴]

اور اتارتا ہے مینہ۔

(۳) ﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ﴾[لقمان:س ۳۱۔ت ۳۴]

اور جانتا ہے جو کچھ ماؤں کے پیٹ میں ہے۔

(۴) ﴿وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَداً﴾[لقمان:س ۳۱۔ت ۳۴]

اور کوئی جان نہیں جانتی کہ کل کیا کمائے گی۔

(۵) ﴿وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ﴾[لقمان:س ۳۱۔ت ۳۴]

اور کوئی جان نہیں جانتی کہ کس زمین میں مرے گی۔

ان پانچ فقروں میں کس فقرے کا یہ ترجمہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی پانچ باتوں کا علم نہ تھا۔؟ پھر جھوٹ ہوا یا نہیں۔آپ نے لفظ صراحت لکھ تو دیا لیکن اس کے معنی ہی نہیں سمجھے،پہلے فقرے کا ترجمہ ساتھ ہے،اس میں خدا کے لیے علم قیامت کا ثبوت ہے۔دوسرے ٹکڑے میں بارش اتارنے کا ذکر ہے۔اس میں علم کا تذکرہ ہی نہیں۔تیسرے ٹکڑے میں بھی علم ما فی الارحام کا ثبوت ذات باری کے لیے ہے۔بعد کے دو ٹکڑوں میں البتہ دوسروں سے علم کی نفی ہے۔لیکن خصوصیت سے رسول اللہ ﷺ کے اسم مبارک کی تصریح نہیں،اس لیے خاص طور سے آپ کی ذات سے ان علوم کی نفی کی صراحت کا دعویٰ کرنا جھوٹ ہی ہوا۔

ہاں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جب ان دونوں ٹکڑوں میں غیر اللہ سے علم کی نفی کی گئی، تو رسول اللہ ﷺ سے بھی ہوگئی۔ اسی طرح جب پہلے ٹکڑے میں علم قیامت کو ذات الٰہی کے ساتھ خاص کیا گیا تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ دوسروں سے اس کی نفی ہو۔ اور دوسروں میں حضور بھی داخل ہیں، لہٰذا حضور سے بھی علم قیامت کی نفی ہوئی۔ بلاشبہ یہی بات صحیح ہے لیکن اس کو کون پڑھا لکھا آدمی صراحت سے تعبیر کرے گا۔ اس کو ثبوت اور لزوم کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر آپ کے لیے تو پڑھنے لکھنے کا ماتم کرنا ہی بے کار ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت مذکور سے تین علم، قیامت، کسب اور موت کی نفی غیر خدا سے ثابت ہوتی ہے۔ بقیہ دو علم بارش اور علم ارحام یہ اب بھی ویسے ہی رہ گئے اور اس آیت مبارکہ کے الفاظ کی دلالت ان کی نفی پر نہیں۔ اس لیے اب اس کے علاوہ چارۂ کار نہیں کہ کہا جائے کہ صحیح بخاری شریف میں ہے کہ آیت: ﴿عنده مفاتح الغيب لا يعلمها الا هو﴾ میں مفاتح الغیب ''یہی پانچ چیزیں ہیں، اور انہیں کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس لیے اس تفسیر نبوی کی روشنی میں جب یہ پانچوں مفاتیح غیب ہیں تو ان کو بھی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس طرح بقیہ دو کی نفی بھی آیت سے ثابت ہوئی۔

ہمارا بھی یہی کہنا ہے کہ آپ کو صاف صاف اقرار کرنا چاہیے تھا۔ کہ علوم خمسہ کی نفی کے ثبوت کے لیے مدار حدیث نبوی ہے، قرآن کی صراحت نہیں۔ اور آپ نے اس ٹون میں کہہ دیا کہ عوام یہ سمجھ بیٹھیں کہ قرآن میں انہیں الفاظ میں مرقوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ان پانچ چیزوں کا علم نہ تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا کار طفلاں خراب خواہد شد

ہم نے آیت مذکورہ بالا کی وضاحت میں عرض کیا تھا: بلاشبہ اس آیت اور دیگر آیات نفی میں ماسوا اللہ سے علم غیب کی نفی کی گئی ہے، لیکن نفی علم ذاتی کی ہے عطائی کی نہیں۔ رئیس صاحب کو ہماری اس تفریق سے اگر انکار تھا تو انہیں ایسے دلائل اور نصوص پیش کرنے تھے، کہ عطائی کی بھی نفی ثابت ہو۔ لیکن ناظرین کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ رئیس صاحب نے صحابہ کے فتاویٰ کہہ کر حضرت ابن عباس اور ام المؤمنین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے انہیں اقوال کو دہرایا ہے جن کو وہ ''موضوع سخن'' کے عنوان سے ایک دفعہ پیش کر چکے تھے۔ بے چارے کیا کرتے ان

کے پاس سوائے اس کے کوئی پونجی ہی نہیں۔اسی لیے پوری کتاب میں اسی کو پینترا بدل بدل کر دہراتے ہیں۔

ہماری گذارش ہے کہ اولاً تو ان روایتوں میں ذاتی عطائی یا بالاستقلال اور بالاعلام کا کوئی ذکر ہی نہیں، اس لیے ان اقوال کو عطائی کی نفی کے ثبوت میں پیش کرنا اپنے دیوالیہ ہونے کا ثبوت دینا ہے۔

ثانیاً: ان دونوں قول پر ہم گذشتہ اوراق میں سیر حاصل بحث کر آئے ہیں، ورق الٹ کر انہیں دیکھ لیا جائے اور رئیس صاحب کے ہمت مردانہ کی داد دی جائے۔ہم نے بزرگوں سے سنا ہے: ایک ڈھیٹ ہوتا ہے اور ایک اس سے بھی آگے گبرڈھیٹ، مولانا کے لیے ایک تیسرا درجہ بھی ایجاد کرنا پڑے گا۔

ہاں فتاویٰ کے سلسلہ میں اپنے مسلک سے ہٹ کر ایک نئی چیز پیش کی ہے، یعنی عظیم القدر تابعی اور جلیل الشان امام تفسیر حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول وہ بھی بے سند۔حوالہ در منثور اور تفسیر ابن کثیر کا ہے، مگر حیرت یہ ہے کہ اصل عبارت نقل کرنے کی جرأت آزاد صاحب نے کیوں نہیں کی۔خیر ان کی طرف سے ہم ہی یہ خدمت ادا کیے دیتے ہیں۔

”قال قتادة: أشياء استاثر الله بهن فلم يطلع عليهن ملكاً مقربا ولا نبياً مرسلاً“

کچھ چیزوں کے علم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے خاص کرلیا ہے تو اس پر نہ تو مقرب فرشتہ آگاہ ہے نہ نبی مرسل۔

”فلا تدري متىٰ تقوم الساعة، في أي سنة، أوفي أي شهر، أو ليل، أو نهار، فلا يعلم أحد متىٰ ينزل الغيث ليلاً أونهاراً. فلا يعلم أحد ما في الأرحام أذكرأم انثى، أحمر أو أسود، وما هو ما تكسب غداً، خير أم شر. أي ليس أحد من الناس يدري أين مضجعه، أ في بحرأم بر، أو سهل أو جبل.“

[ابن کثیر جلد۳، ص:۴۵۵]

قیامت کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کس سال، کس مہینہ، کس تاریخ، دن یا رات میں قائم ہوگی، بارش کو کوئی نہیں جانتا کہ دن رات میں کب نازل ہوگی۔ماں کے پیٹ کا حال

کسی کو معلوم نہیں کہ مذکر ہے یا مؤنث ہے، لال ہے کالا ہے یا کیا ہے، یہ بھی نہیں جانتا کہ کل کیا کرے گا، بھلا یا برا۔ یعنی کوئی نہیں جانتا کہ اس کا مرقد کہاں ہوگا، خشکی میں تری میں، پہاڑ میں میدان میں۔

سوال یہ ہے کہ اگر حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عبارت کا وہی مطلب ہے جو آزاد صاحب کا خیال ہے، تو ان حدیثوں کا کیا جواب ہے جنہیں ہم نیچے ذکر کر رہے ہیں۔ اور ہم حضرت قتادہ کا قول مانیں جو بقول آپ کے صحابہ کے تربیت یافتہ ہیں۔ یا حضرت قتادہ کے مربیوں کے بھی مربی اور آقا، آقائے دو جہاں ﷺ کا قول تسلیم کریں۔

حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ کسی کو نہیں معلوم کہ قیامت کس سن کس مہینہ اور کس تاریخ کو رات یا دن میں قائم ہوگی، مگر رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

''عن ميمون ابن مهران عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: ويوم القيامة يوم عاشورا.'' [غنیۃ الطالبین جلد۲، ص:۴۶]

حضور ﷺ نے فرمایا: کہ قیامت دسویں محرم کو قائم ہوگی۔

جس کا صاف مطلب یہی ہوا کہ قیامت محرم کے مہینہ میں دس تاریخ کو دن میں قائم ہوگی۔ لیکن اس کے آگے بھی ملاحظہ ہو:

''وعن ابي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: خير يوم طلعت عليه الشمس يوم الجمعة، فيه خلق آدم، وفيه أدخل الجنة، وفيه أخرج منها، ولا تقوم الساعة إلا يوم الجمعة.'' [رواہ مسلم۔ مشکوۃ ص:۱۱۹]

تمام دنوں میں اچھا جمعہ کا دن ہے، اسی میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا فرمائے گئے، اسی میں جنت میں داخل کیے گئے۔ اسی میں جنت سے نکالے گئے۔ اور قیامت بھی جمعہ کے دن ہی قائم ہوگی۔

دوسری حدیث شریف ہے:

''وعنه وما من دابة إلا وهي مضجعة يوم الجمعة شفقاً من الساعة إلا الجن والانس.'' [رواہ مسلم۔ مشکوۃ ص:۱۱۹]

سارے جان دار جمعہ کے دن صبح سے ہی قیامت کے خوف سے لرزاں و ترساں رہتے

ہیں جن اور انسان کے علاوہ۔

کیا یہ حدیثیں پکار پکار کر نہیں کہہ رہی ہیں کہ حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علی الرغم ان کے آقا اور رسول اللہ ﷺ نے قیام قیامت کا مہینہ، تاریخ، دن اور ٹائم سب بتا دیا۔ سنہ بلاشبہ نہیں بتایا۔ تو اس وقت عرب میں سن کا رواج ہی کہاں تھا۔ کم از کم دن، تاریخ، ٹائم، اور مہینہ میں تو قول قتادہ کی صاف تردید ہے۔

اسی طرح حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ بارش کب ہوگی، کوئی نہیں جانتا۔ مگر ان کے آقا، آقائے نامدار مدنی تاجدار ﷺ کا قول سنیے ارشاد فرماتے ہیں:

”ثم يرسل الله المطر كأنه الظل، فينبت منه أجساد الناس.“

[مشکوٰۃ ص:۴۸۱]

اللہ ایک بارش بھیجے گا پھوہار جیسی تو لوگوں کے جسم اس سے اگ جائیں گے۔

کامل ابن اثیر میں ہے:

”قال أهل بيت من مزينة لصاحبهم، وهو بلال بن حارث المزني رضي الله تعالىٰ عنه: قد هلكنا فاذبح لنا شاة، قال: ليس فيهن شيء، فلم يزالوا به حتى ذبح، فسلخ عن عظم أحمر فنادىٰ يا محمداه، فرأى في المنام أن رسول الله ﷺ أتاه فقال: ابشر بالحياة.“

[کامل لابن اثیر جلد۲، ص:۲۷۴]

قبیلہ مزینہ کے کچھ لوگوں نے اپنے سردار بلال ابن حارث مزنی سے کہا: قحط سے ہم لوگ تباہ ہو گئے ہمارے لیے ایک بکری ذبح فرما دیجیے انہوں نے فرمایا: بکری میں گوشت بالکل نہیں رہ گیا ہے، مگر ان لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر آپ نے بکری ذبح کی، کھال اتاری گئی تو سرخ سرخ ہڈیاں نکل آئیں۔ یہ دیکھ کر آپ نے دور سے پکارا: یا محمداہ۔ ان کے خواب میں سرکار تشریف لائے اور فرمایا: خوش ہو جاؤ زندگی آ گئی۔

اب بتائیے کہ ہم قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات مانیں یا ان کے آقا حضرت بلال کی جو کہتے ہیں کہ حضور سید عالم ﷺ نے مجھے بارش کی خوش خبری سنائی۔ اور ان کے بھی آقا سید عالم ﷺ کی جو آج ہی قرب حشر کی اس بارش کا ذکر فرماتے ہیں جس سے مردہ جسموں میں جان

آجائے گی۔صلی اللہ علیہ و الہ الامجاد وسلم۔

یہ بھی حضرت قتادہ کی طرف منسوب ہے کہ انہوں نے فرمایا: پیٹ میں ہونے والے بچے کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں کہ نر ہے یا مادہ، اور کالا ہے یا گورا۔لیکن آیئے مخبر صادق ﷺ کی صحیح حدیث مبارک سنیئے:

"عن أنس بن مالک عن النبي ﷺ قال: إن الله تبارک وتعالیٰ وکّل بالرحم ملکا یقول: یا رب! نطفة، یا رب! علقه، یارب! مضفة، فإذا أراد الله أن یقضي خلقه قال: أذ کر أم أنثیٰ، شقي أم سعید، فکتب في بطن أمه."

[بخاری شریف ج اول، ص:۴۶]

حضور ﷺ فرماتے ہیں: کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے رحم پر ایک فرشتہ مقرر فرمایا ہے جو کہتا رہتا ہے یا اللہ ابھی نطفہ ہے، ابھی علقہ ہے، ابھی بستہ خون ہے، پس جب خدا اسے پیدا کرنا چاہتا ہے تو پوچھتا ہے: یہ مذکر ہوگا یا مؤنث، نیک بخت ہوگا یا بد بخت، پس ویسا ہی ماں کے پیٹ میں ہی لکھ دیتا ہے۔

رئیس صاحب اس صحیح حدیث کو پڑھ کر بتائیں کہ جو فرشتہ ماں کے شکم میں مبعوث ہوا، اس کو پیدا ہونے سے پہلے ہی خدا نے مذکر اور مونث ہونا بتایا یا نہیں؟ اور خدا کے بتانے کے بعد بھی فرشتے کو قبل ولادت معلوم ہوا یا نہیں؟ اور نہیں معلوم ہوا تو شکم مادر میں لکھ کیسے دیا۔ کہ لڑکا ہوگا یا لڑکی۔اور نیک بخت ہوگا یا بد بخت وغیرہ وغیرہ، یا پھر شاید یہ فرشتہ بھی آپ کے نزدیک خدا ہوگا۔کہ بقول آپ کے "اللہ پاک نے کسی کو اس کا علم دیا ہی نہیں"۔

دوسری حدیث مبارک خود سید عالم ﷺ کے بارے میں ملاحظہ ہو:

"عن أم الفضل بنت الحارث أنها دخلت علی رسول الله ﷺ فقالت: یا رسول الله !اني رأیت حلماً منکراً ألبتة قال: ماهو؟ قالت: إنه شدید، قال: ما هو؟ قالت: رأیت کأن قطعة من جسدک قطعت ووضعت في حجري، فقال رسول الله ﷺ: رأیت خیراً، تلد فاطمة۔ان شاء الله۔ غلاماً یکون في حجرک، فولدت فاطمة الحسن."

[مشکوۃ جلد۲، ص:۲۵۸]

ام الفضل بنت حارث حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا حضور میں نے

ایک بھیانک خواب دیکھا ہے، حضور نے فرمایا: وہ کیا ؟عرض کیا : بہت سخت ،ارشاد ہوا: کہو توبولیں: میں نے دیکھا کہ آپ کے جسم سے ایک گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر میری گود میں رکھا گیا ،آپ نے فرمایا: یہ تو بہت بہتر ہے۔ خدا نے چاہا تو فاطمہ کے بیٹا پیدا ہوگا جو ولادت کے بعد تیری گود میں رکھا جائے گا، تو حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ولادت ہوئی۔

جناب آزاد صاحب بتائیں کہ حضور ﷺ حضرت ام الفضل کو ولادت امام حسن کی پیش گی بشارت دے کر کیا معاذ اللہ خدا ہو گئے۔ اور یہ علم ما فی الارحام کا بیان ہوا یا نہیں؟۔ ایک دوسری پیش گوئی جو اس سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ سنیے اور سر دھنیے:

”فان جاء ت به أكحل العينين، سابغ الاليتين، خدلج الساقين ،فهو لشريک بن سمحاء، فجاء ت به كذٰلک، فقال النبي ﷺ: لو لا ما مضى من كتاب الله لكان لي ولها شان.“ [مشکوٰۃ جلد۲،ص:۱۷]

(ایک صحابی نے اپنی بیوی کے خلاف دعویٰ کیا کہ اس کے شکم میں شریک بن سمہاء کا نطفہ ہے) آپ نے فرمایا: اگر بچہ سرمگیں آنکھ والا، پھرے پھرے سرین والا، موٹی پنڈلیوں والا ہوا تو شریک بن سمحاء کا ہی نطفہ ہے، بچہ ویسا ہی پیدا ہوا جیسا آپ نے فرمایا تھا۔ تب آپ نے فرمایا: اگر کتاب اللہ میں میاں بیوی کے لیے لعان کا حکم نہ آیا ہوتا تو آج اس کا اور میرا دوسرا معاملہ ہوتا۔

اس حدیث مبارک میں سرکار نے ماں کے پیٹ میں بچہ کس کا ہے، کس رنگ وروغن کا ہے، کس حلیہ ونقشہ کا ہے سب بتادیا۔ ”اقوال کی بحث“ کے ضمن میں آپ خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول مؤطا کے حوالہ سے سن چکے ہیں کہ کس درجہ اعتماد و وثوق کے ساتھ اپنی بیٹی ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمارہے ہیں: میں دیکھ رہا ہوں کہ بنت خارجہ کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ تیری تیسری بہن ہے۔

میرا دعویٰ ہے کہ علم ما فی الارحام کی روایتوں سے پورا ایک رسالہ تیار کیا جاسکتا ہے، لیکن ہم اس بحث کو یہاں ایک حیرت انگیز روایت پر ختم کرتے ہیں جسے صاحب سیرۃ ابن ہشام نے ابن اسحاق اور دیگر مورخین کی سند سے بیان کیا ہے:

”حتى إذا كان بعرق الطبيه لقوا رجلاً من الأعراب، فسألوه عن

الناس، فلم يجدوا عنده خبراً، فقال له الناس: سلّم على رسول الله ﷺ، قال: أو فيكم رسول الله، قالوا: نعم، فسلم عليه. ثم قال: إن كنت رسول الله فأخبر عما في بطن ناقتي هذه، فقال له مسلمة بن سلامه بن دفش: لا تسئل رسول الله ﷺ فأنا أخبرك عن ذلك. تذوت عليها ففي بطنها سخلة منك، فقال: رسول الله ﷺ أفحشت على الرجل ثم أعرض من مسلمة.“

[سیرت ابن ہشام جلد۲،ص:۲۵۲]

حضور ﷺ اپنے لشکر کے ساتھ جب مقام عرق طیبہ پر پہونچے تو ایک دیہاتی ملا، لوگوں نے اس سے قریش کی خبر پوچھی، اسے کوئی اطلاع نہ تھی، تب لوگوں نے اس سے کہا کہ تم رسول اللہ کو سلام کرلو، اس نے کہا: کیا تمہارے رسول اللہ بھی ہیں، بتایا گیا کہ ہاں، اس نے آکر آپ کو سلام کیا پھر کہا: اگر آپ رسول ہیں تو بتایئے کہ میری اونٹنی کے پیٹ میں کیا ہے۔ مسلمہ ابن سلامہ نے اسے مخاطب کر کے کہا: حضور سے کیا پوچھتا ہے، آمیں تجھے بتادوں، تو نے اس اونٹنی سے جفتی کھائی تو تیرا ہی نطفہ اس کے شکم میں ہے، حضور ﷺ نے مسلمہ سے فرمایا: تو نے اس کے ساتھ فحش گوئی کی اور منہ پھیرلیا۔

حضرت امام قتادہ کی طرف سے یہ قول بھی مروی ہے: ”لا تدري نفس ماذا تكسب غداً، أي: خيراً أم شراً. “کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا کمائے گا، بھلائی یا برائی۔ لیکن ہمارا کہنا ہے کہ وہ ساری حدیثیں اور اقوال جو ہم نے ام المؤمنین اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اقوال کی وضاحت میں ذکر کیے ہیں، یہاں دہرائے جاسکتے ہیں۔ کہ ان میں ہر روایت میں علم مافی الغد کا بیان ہے، بخاری کتاب الحج سے مزید دو حدیثیں ہم ذکر کر رہے ہیں، جس سے اندازہ ہوگا کہ کس وسعت و کثرت کے ساتھ احادیث نبوی میں کل کی خبریں دی گئی ہیں:

”عن عائشة قالت: فدخل عليّ رسول الله ﷺ وأنا أبكي فقال: ما يبكيك يا هنتاه، قلت: سمعت قولك لأصحابك فعمدت العمرة، قال: ماشانك، قلت: لا أصلي قال: لا يضرك، إنما أنت امرأة من بنات آدم، كتب الله عليك ما كتب عليهن، كوني في حجك، فعسى الله أن يرزقها.“

[بخاری اول،ص:۲۱۶]

حضور ﷺ میرے پاس آئے اور میں رو رہی تھی، آپ نے پوچھا کیوں رو رہی ہو، میں نے عرض کی کہ آپ کو عمرہ کا حکم فرماتے سنا تو میں نے عمرہ کی نیت کر لی، فرمایا: پھر رونے کی کیا بات ہے۔ عرض کی میں نماز نہیں پڑھ سکتی، فرمایا: (غم کی بات نہیں) تم بھی عورت ہو اللہ پاک نے جیسے ساری بنات آدم پر ایک چیز لکھ دی ہے تم پر بھی، ارکان حج میں مصروف رہو، جلد ہی اللہ پاک عمرہ بھی نصیب فرمائے گا۔

"قال النبي ﷺ من الغد يوم النحر وهو بمنىٰ: نحن نازلون غداً بخيف بني كنانة حيث تقاسموا على الكفر، يعني بذلك المحصب."

[بخاری اول، ص:۲۱۶]

حضور ﷺ نے یوم نحر کی صبح کو منیٰ میں فرمایا: ہم کل خیف بنی کنانہ میں قیام کریں گے جہاں کافروں نے کفر پر معاہدہ کیا تھا (یعنی وادی خیف)۔

اور حضرت قتادہ کی تفسیر میں یہ ٹکڑا بھی ہے، کوئی نہیں جانتا اس کی قبر کہاں بنے گی جنگل میں کہ ویرانے میں، یا خشکی میں کہ تری میں۔ لیکن حضور سید عالم ﷺ نے نہ صرف یہ کہ اپنے وصال کی خبر پائی، بلکہ اہل راز حضرات کو مطلع بھی کیا۔

بخاری شریف میں ہے:

"قال عمر: فما تقول؟ قلت: أجل رسول الله ﷺ أعلمه له، قال: ﴿إذا جاء نصر الله والفتح﴾ فذلك علامة أجلك، ﴿فسبح بحمد ربك واستغفره، إنه كان توابا﴾." [بخاری ثانی، ص:۷۷۳]

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے فرمایا: سورۂ اذا جاء کے بارے میں تم کیا کہتے ہو، تو وہ بولے اس میں رسول اللہ ﷺ کو ان کی وفات کی خبر دی گئی ہے کہ مکہ فتح ہو تو یہ آپ کی وفات کی علامت ہے، پس آپ حمد الٰہی بجا لائیں، توبہ و استغفار کریں، وہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔

اس حدیث مبارک میں اس بات کی تصریح ہے کہ اللہ پاک جل جلالہ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو دنیا سے تشریف لے جانے کی پیشگی خبر دے دی تھی، پھر لفظ یہ ہے کہ یہ شہادت حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ادا فرما رہے ہیں جو آیت: ﴿ان اللہ عندہ علم

الساعة. ﴾ کی تفسیر میں: ”من قال: إنه يعلم من هذه الأشياء فقد كفر بالقرآن العظيم.“ کہہ چکے ہیں، تو کیا ایک دفعہ پھر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے اوپر کفر کا فتویٰ دیا۔

خبر وصال کی مزید تفصیل مندرجہ ذیل احادیث سے ہوتی ہے:

”عن معاذ بن جبل لما بعثه رسول الله ﷺ إلى اليمن خرج معه رسول الله ﷺ يوصيه ومعاذ راكب ورسول الله ﷺ يمشي تحت راحلته، فلما فرغ قال: يا معاذ، إنك عسىٰ أن لا تلقاني بعد عامي هذا، ولعلك تمر بمسجدي هذا وقبري فبكى معاذ جشعاً لفراق رسول الله ﷺ.“

[مشکوۃ شریف ص:]

حضرت معاذ ابن جبل سے روایت ہے کہ حضور سید عالم ﷺ نے جب ان کو یمن کا گورنر بنا کر روانہ کیا، تو ہدایات دینے کے لیے ان کے ساتھ ساتھ چلے، معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو اونٹ پر تھے اور رسول اللہ ﷺ زمین پر پیدل چل رہے تھے، وصیت سے فارغ ہو کر فرمایا: اے معاذ یہ بات ہونے والی ہے کہ اس سال کے بعد تم مجھ سے ملاقات نہ کر سکو گے، اور میری مسجد میں میری قبر پر گزر رو گے۔ حضرت معاذ یہ سن کر آپ کی جدائی کے غم سے تڑپ اٹھے اور رونے لگے۔

یہ حدیث مبارک سال اور جگہ کا تعین کر رہی ہے، اب خاص دن کی تشریح ملاحظہ ہو:

”عن أنس قال: لما ثقل النبي ﷺ جعل تغشاه الكرب، فقالت فاطمة: واكرب أباه، فقال لها: ليس على أبيك الكرب بعد اليوم. رواه البخاری“

[مشکوۃ ص:۵۴۷]

حضور سید عالم ﷺ کا مرض جب بڑھ گیا تو تکلیف میں بھی بے حد اضافہ ہوا، یہ دیکھ کر حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ چیخ پڑیں ہائے ابا کو کتنی تکلیف ہے، آپ نے ان سے فرمایا: بیٹی آج کے بعد تیرے باپ کو کبھی تکلیف نہ ہوگی۔

ارشاد نبوی نہ صرف موت کا دن مقرر کر رہا ہے، بلکہ برزخ کی حیات کامراں کی پیش خبری بھی فرما رہا ہے۔ الغرض حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جس قول کا آزاد صاحب نے بڑے طمطراق سے حوالہ دیا تھا۔ ہم نے حدیث مبارک کی تشریحات سے اس کے ایک ایک

ٹکڑے کی وضاحت کردی۔ کیا رئیس صاحب اپنے عامل بالحدیث ہونے کی لاج رکھیں گے، یا اب بھی قول قتادہ پر ہی ایمان لائیں گے۔

اس کے بعد رئیس صاحب نے ایک ایسی حدیث نقل کی ہے جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس معرکۂ رستاخیز میں ان کے حواس بھی ان کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((أوتيت مفاتيح كل شيء إلا الخمس.)) مجھے ہر شی کے علم کی کنجی دی گئی علوم خمسہ کے سوا۔

سوال یہ ہے کہ آزاد صاحب کا اس حدیث رسول ﷺ پر اگر ایمان ہے اور اس کی صداقت پر دل سے یقین ہے اور اس کے معنی وہی ہیں جو انہوں نے بتائے ہیں تو یہ ان کی غیر مقلدیت کو چیلنج ہے، فوراً اپنے باطل مذہب سے توبہ صادقہ کریں اور صاف صاف اعلان کریں کہ حضور ﷺ کو علوم خمسہ کے سوا سارے ہی علوم کا علم تھا۔ اور آپ کے علم مبارک سے پانچ چیزوں کے علاوہ کسی چیز کا علم خارج نہیں ہے، کوئی غیر مقلد، کوئی سلفی، یا کوئی وہابی جو اس حدیث کی تشریح کے موافق حضور ﷺ کو ان پانچوں کے علاوہ جمیع اشیاء ما کان وما یکون کا عالم مانے! اگر نہیں تو ظالمو! جس حدیث کو تم خود قابل اعتقاد نہیں سمجھتے اس سے ہم پر حجت کس بوتے پر قائم کرتے ہو۔ کیا یہ عامہ مسلمین کو دھوکہ دینا نہیں ہوا؟ کیا قیامت قائم نہ ہوگی؟۔ اور کیا انصاف نہ ہوگا؟۔

بتا دُیا رو بروز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

شاید رئیس صاحب کو یہ معلوم تھا کہ علمائے اہل سنت اس حدیث کا یہ جواب دیتے ہیں کہ بلاشبہ جب تک رسول اللہ ﷺ کو نہیں بتایا گیا تھا نہیں معلوم تھا، یہ حدیث اسی وقت کی ہے۔ اور بعد میں ضرور بتایا گیا، جبھی تو اور صحیح حدیث کے حوالہ سے گذرا کہ خمسہ میں سے ہر فرد کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی۔

اسی لیے ایک ایسی حدیث بھی نقل کی جس سے ان کے زعم میں اخیر تک حضور ﷺ کو قیامت کا علم نہیں دیا گیا۔ (سوچا ہوگا چلو علوم خمسہ نہ سہی علم قیامت ہی کی نفی ثابت ہو جائے۔ زخمی دل کو کچھ تو قرار آجائے لیکن وہ سمجھتے نہیں فما لهم من قرار.) فرماتے ہیں:

”عن جابر مرفوعاً قال: يقول قبل الموت بشهر: تسئلوني عن الساعة إنما علمها عند الله.“

حضورﷺ نے اپنی وفات سے ایک مہینہ پہلے فرمایا: تم مجھ سے قیامت کا وقت پوچھتے ہو، اس کا علم تو خدا کے پاس ہی ہے۔

مثل مشہور ہے کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، مگر ہمارے آزاد صاحب بے سہارے کے ہی ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ حدیث میں ہے قیامت کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کسی چیز کے علم کے خدا کے پاس ہونے کا اگر یہ مطلب ہے کہ دوسرا اس کو نہیں جانتا، تو دنیا کے یہ سارے علوم جنہیں رئیس صاحب جیسے کم سواد لوگ بھی جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں یا نہیں ہیں۔ اور ضرور ہیں، تو جب وہ علوم بھی اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہیں جنہیں دوسرے جانیں، اور وہ علوم بھی جنہیں دوسرے جانیں۔ تو ان علوم کے اللہ تعالیٰ کے پاس ہونے سے رسول اللہﷺ کے عالم ہونے کی نفی کیسے نکلے گی؟ رئیس صاحب علم ایک نور ہے جو مشکاۃ نبوت سے مقتبس ہوتا ہے، اور آپ اسی مشکاۃ نبوت کی لو مدھم کرنے کے درپے ہیں، اس لیے اسی طرح اندھیرے میں بھٹکیں گے۔

دیکھیے امام رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ علم قیامت کے بارے میں کیا فرماتے ہیں: چناں چہ آیت مبارکہ: ﴿عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَداً إِلَّا مَنِ ارْتَضَى مِن رَّسُولٍ﴾ [الجن: س ۷۲۔ ت ۲۶] کی تفسیر میں فرماتے ہیں: کہ علیٰ غیبہ سے مراد علم قیامت ہے، پھر خود ہی اعتراض وارد کر کے جواب دیتے ہیں:

”فإن قيل: فإذا حملتم ذلك على القيامة فكيف قال: ﴿إلا من ارتضىٰ من رسول﴾، مع أنه لا يظهر هذا الغيب لأحد من رسله، قلنا: بل يظهر عند القرب من القيامة، وكيف لا، وقد قال يوم تشقق السماء بالغمام، وتنزل الملائكة تنزيلاً، ولا شك أن الملائكة يعلمون في ذلك الوقت قيام القيامة.“ [تفسیر رازی ۲۹، ص: ۱۶۸۔۱۶۹]

اگر یہ کہا جائے کہ غیب سے مراد علم قیامت لو گے تو الا من ارتضیٰ من رسول کا مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو قیامت کا علم بتاتا ہے۔ حالاں کہ یہ تو کسی کو معلوم

نہیں ہوسکتا ۔جواب یہ ہے کہ رسولوں کو قیامت کا علم ہونے میں کوئی حرج نہیں ۔اللہ قرب قیامت میں ان کو بتادے گا، بلکہ یہ بات تو واقعی ہے، اللہ پاک قرآن میں فرماتا ہے: جس دن آسمان بادل کے ساتھ پھٹ پڑے گا اور فرشتے اتریں گے تو وہ فرشتے بلاشبہ اس وقت ہی سے قیام قیامت کے عالم ہوں گے۔

اس طرح امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قبل قیامت ہی، صرف رسول ہی نہیں خاص فرشتے بھی اس کے قیام کے وقت سے باخبر ہوں گے۔

الغرض رئیس صاحب کی یہ عجیب ڈھٹائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بتانے سے بھی رسول اللہ کو علم قیامت نہیں ہوسکتا۔شاید ان کے پاس کوئی مخصوص وحی آئی ہے کہ اخیر وقت تک بھی اللہ پاک نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں بتایا؟ إنا لله وإنا إليه راجعون. ومعاذ الله رب العالمين.

ثانیاً:۔ایک مہینہ مدت تو بہت زیادہ ہوتی ہے، اگر چند ساعت قبل از وصال بھی آپ نے علم قیامت کی نفی کی ہوتی تب بھی یہ امکان باقی رہتا کہ اس کے بعد علم قیامت کی تلقین ہوئی ہو۔کیوں کہ مدعیان علم غیب وصال تک آپ کے علم کی تکمیل کے قائل ہیں ۔اور آپ کی بیان کردہ مدت کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف نہ صرف وحی غیر متلو بلکہ وحی متلو کا نزول ثابت ہے۔

”قد أخرج الإمام أحمد عن أنس بن مالك ۔رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۔أن الله عزوجل تابع الوحي على رسول الله ﷺ قبل وفاته حتى توفي وأكثر ما كان يوم توفي رسول الله ﷺ.“

امام احمد انس ابن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے رسول اللہ ﷺ پر وفات سے پہلے تک مسلسل وحی نازل فرمائی بلکہ خاص وصال کے دن تو کثرت کے ساتھ۔

ثالثاً: رئیس صاحب نے اس کتاب کی تصنیف میں شاید دیانت وامانت گھول کر پی ڈالی ہے۔گذشتہ صفحات میں آیت مبارکہ:﴿ان الله عنده علم الساعة. ﴾کے سلسلہ میں ایک خیانت مجرمانہ کا ذکر کر چکا ہوں، یہاں بھی شیخ ملا علی قاری اور شیخ محقق علیہما الرحمۃ والرضوان کی عبارتیں نقل کر کے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان کی عبارت کے کس لفظ، یا جملہ کا ترجمہ یا مطلب

ہے کہ آپ عالم غیب اور حاضر و ناظر نہ تھے۔

﴿وَاِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ ونیست علم بہ تعیین وقت آں مگر نزد خداوند عز وجل یعنی از وقت قیامت کبریٰ پرسید آں خود معلوم من نیست و آنرا جز خداے تعالیٰ نداند۔ لا یعلمها إلا هو، یعني: تسئلونني عن القیامة الکبریٰ، وعلمها عند الله وما أعلمه هو القیامة الصغریٰ''۔ [مرقاۃ، ص:۲۲۴]

قیامت کے وقت کی تعیین کا علم خدا کو ہی ہے۔ یعنی تم مجھ سے قیامت کبریٰ کے بارے میں پوچھتے ہو، وہ تو خود مجھ کو معلوم نہیں اور اس کو خداے تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، اس کو خدا ہی جانتا ہے، یعنی مجھ سے قیامت کبریٰ کے بارے میں پوچھتے ہو، اس کا علم تو خدا کے پاس ہے میں تو قیامت صغریٰ کو جانتا ہوں۔

یہ ہے دونوں بزرگوں کی عبارت جس کے حوالہ سے رئیس صاحب نے یہ تحریر کیا ہے ''ان دونوں حنفیوں نے اس حدیث کا مطلب یہی بتایا ہے کہ آپ عالم غیب اور حاضر و ناظر نہ تھے۔'' کیا صرف علم قیامت میں ہی عالم غیب اور حاضر و ناظر ہونا منحصر ہے، اگر نہیں تو اس کے انکار کا مطلب عالم غیب اور حاضر و ناظر ہوں کس طرح ہوا؟۔ سچ فرمایا گیا ہے: ''اذا لم تستحی فاصنع ماشئت ''شرم و حیا رخصت کرکے آدمی جو چاہے کرے۔ اور ہمارے مولانا رئیس صاحب نے خیر سے شرم و حیا کا آزار ہی نہیں پالا کہ ہوگی تو رخصت کرنے کی ضرورت پڑے گی۔

اس کے بعد رئیس صاحب نے جو دو حدیثیں ذکر فرمائی ہیں ان کا تعلق علم فی الغد اور قول قتادہ رضی اللہ تعالیٰ کے مضمون سے ہے جس کے بارے میں کافی عرض کیا جا چکا ہے۔

اس مضمون کے اخیر میں رئیس صاحب نے چند کتابوں کے حوالہ سے یہ کہا ہے کہ ان پانچوں کے علم کو اللہ کی ذات کے ساتھ مخصوص ماننا اور آپ کی ذات سے ان کی نفی ماننے کا عقیدہ رکھنا فرض و واجب ہے۔

ذیل میں ہم مذکورہ کتابوں سے فرداً فرداً بحث کرتے ہیں:

مدارک شریف:

رئیس صاحب نے مدارک شریف جلد سوم ص: ۲۱۹ کے حوالہ سے لکھا ہے: ''امام

ابو حنیفہ جن کی تقلید کا دم بریلوی لوگ بھرتے ہیں کہتے ہیں کہ ان پانچوں کا علم اللہ کی ذات سے مخصوص ہے کوئی دوسرا نہیں جانتا۔

اولاً: ہم کو نہایت افسوس ہے کہ ہمارا سابقہ ایک ایسے نو آموز سے ہے جو علم کی ابجد سے بھی ناواقف ہے، اس لیے وہ نہایت بے باکی سے بات کہہ گزرتا ہے، جسے اہل علم زبان پر لاتے شرماتے ہیں۔ چناں چہ رئیس صاحب کو کون بتائے کہ صاحبزادے تقلید کا تعلق اعمال سے ہے، مسئلہ مذکورہ کا تقلید سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقلید کا طعنہ بالکل بے موقع ہے، وہ الٹے آپ کو ہی منہ چڑھا رہا ہے۔

ثانیاً: امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا نام تو آپ نے لے دیا اور مدارک شریف کا حوالہ بھی آپ نے دے دیا، لیکن امام نسفی اور امام اعظم رضوان اللہ تعالیٰ علیہما میں کتنے زمانہ کا فاصلہ ہے، دونوں بزرگوں کے درمیان کتنے واسطے ہیں، کیا آپ اس قول کو امام اعظم تک سند متصل سے پہونچا سکتے ہیں۔ کیا اب تفسیری روایتوں اور تاریخی کہانیوں پر ہی آپ کے مذہب کا دارومدار رہ گیا ہے۔ مولانا اپنے غیر مقلد اور عامل بالحدیث ہونے کا کچھ تو خیال فرمایئے۔ اور اس قسم کے بے سند اقوال پیش کرنے سے شرمایئے۔

ثالثاً: امام نسفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نقل کی ہوئی روایت آپ نے ایک جگہ دیکھ لی اور پوری کتاب میں جگہ جگہ انہوں نے کیا لکھا ہے شاید اس سے قصداً اغماض کیا۔ آیئے ہم آپ کو ان سب کی سیر کرائیں۔ آیت مبارکہ:

﴿یجتبی من رسله من یشاء.﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

”ولكن الله يرسل الرسول فيوحي إليه بأن في الغيب كذا، وإن فلانًا في قلبه النفاق، وفلانًا في قلبه الإخلاص، فيعلم من جهة إخبار الله لا من جهة نفسه. والآية حجة على الباطنية، فإنهم يدعون ذلك العلم لإمامهم، فإن لم يثبتوا له النبوة ماروى المخالفين للنص حيث اثبتوا علم الغيب لغير الرسول، وإن اثبتوا النبوة له صاروا مخالفين لنص آخر، وهو قوله خاتم النبيين.“

[آل عمران مدارک مع الاکلیل ص:۸۵]

لیکن اللہ تعالیٰ رسول بھیجتا ہے تو ان کی طرف وحی کرتا ہے کہ غیب میں یہ ہے، اور فلاں

منافق ہے، اور فلاں کے دل میں اخلاص ہے، تو اللہ کا رسول اللہ کے خبر دینے سے غیب جانتا ہے، خود نہیں جانتا، اور یہ آیت فرقہ باطنیہ پر حجت ہے، کیوں کہ وہ اپنے اماموں کے لیے غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں (تو دو حال سے خالی نہیں) انہیں نبی نہیں مانتے ہیں، تو اس آیت کی مخالفت کہ غیر نبی کے لیے غیب ثابت کرتے ہیں، اور اماموں کو نبی مانتے ہیں تو آیت مبارکہ خاتم النبیین کی مخالفت کرتے ہیں۔

یہ عبارت چیخ چیخ کر اعلان کر رہی ہے کہ اللہ پاک اپنے رسولوں کو غیب کی خبر دیتا ہے۔ اس لیے ان کے لیے غیب کا اثبات کرنا قرآن وحدیث کے خلاف نہیں، البتہ غیر نبی کے لیے غیب کا دعویٰ قرآن کے خلاف ہے۔

دوسری آیت: ﴿عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَداً إِلَّا مَنِ ارْتَضَى مِن رَّسُولٍ﴾ [سورة الجن] کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

﴿عَالِمُ الْغَيْبِ﴾ خبر مبتدأ، أي: هو عالم الغيب ﴿فَلَا يُظْهِرُ﴾ فلا يطلع ﴿عَلَى غَيْبِهِ أَحَداً﴾ من خلقه ﴿إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ﴾، إلا رسولا قد ارتضاه لعلم بعض الغيب ليكون أخباره بالغيب معجزة له، فإنه يطلعه على غيبه ماشاء، و﴿من رسول﴾ بيان لمن ارتضاه، والولي إذا أخبر بشيء فهو جازم عليه لكنه أخبره بناء على روياه، أو بالفراسة على أن كل كرامة للولي فهي معجزة للرسول."

"وذكر في التاويلات، قال بعضهم: في هذه الآية بدلالة تكذيب المنجمة وليس كذلك، فإن فيهم من يصدق خبره، وكذلك الطبيبة يعرفون طبائع النبات، وذلك لا يعرف بالتامل، فعلم بأنهم وقفوا على علمه من جهة رسول انقطع أثره وبقي علمه في الخلق." [مدارک جلد رابع ص:۳۰۶]

اللہ تبارک وتعالیٰ عالم الغیب ہے، تو مخلوق میں سے کسی کو اپنے غیب پر مطلع نہیں کرتا، مگر رسولوں میں سے جس کو پسند کرتا ہے، انہیں بعض علوم غیبیہ کی خبر دینے کے لیے منتخب فرماتا ہے کہ اپنے خاص غیب میں سے جس کو چاہے بتادے اور یہ رسول کے لیے معجزہ ہو جائے۔ اور ولی جب کسی چیز کی خبر دیتا ہے تو گویا اس کا یقین رہتا ہے، لیکن یہ اخبار بالغیب

رویائے صادقہ یا فراست ایمانیہ کے طور پر ہوتا ہے۔ کہ ولی کی کرامت رسول کا معجزہ ہوتا ہے۔

تاویلات میں لکھا ہے کہ اس آیت میں منجمین کی خبر کی البتہ تکذیب ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں، منجموں کی بہت سی خبریں صحیح ہوتی ہیں۔ اسی طرح طبیب بھی دواؤں کی خاصیات بتاتے ہیں جو عقلی سوچ بچار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی کسی رسول کا بتایا ہوا علم ہی ہے جس کے نشانات کا بھی اب پتہ نہیں مگر علم ان کا اب بھی باقی ہے۔

یہ عبارت بھی پکار پکار کا اعلان کر رہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے رسولوں کو اپنے مخصوص غیب پر مطلع کرتا ہے۔ اور نہ صرف رسول بلکہ رسولوں کے واسطہ سے اولیا بھی غیب پر مطلع ہوتے ہیں اور اس کی یقینی خبر دیتے ہیں۔ بلکہ اطبا بھی دواؤں کے یقینی خواص میں بلاشبہ رسولوں کے خوشہ چیں ہیں۔

پس صورت حال یہ ہے تو سورۃ لقمان کی تفسیر میں ذکر کی ہوئی اس روایت: ''منصور نے خواب میں ملک الموت کو دیکھا تو ان سے اپنی عمر کی میعاد دریافت کی، انہوں نے پانچوں انگلیوں سے اشارہ کیا، معبرین میں سے کسی نے پانچ سال کی مدت بتائی، تو کسی نے پانچ مہینہ اور کسی نے پانچ دن۔ حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خبر ہوئی تو فرمایا: اشارہ قرآن کی آیت مبارکہ: ﴿ان اللہ عندہ علم الساعۃ.﴾ کی طرف ہے، کہ ان پانچوں کا علم سوائے خدا کے اور کسی کو نہیں''۔

تو اس کا مطلب امام نسفی کے نزدیک یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بتانے سے بھی رسول اللہ ﷺ کو معلوم نہیں ہوسکتا اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا ہی نہیں۔ بلکہ صاف مطلب یہ ہے کہ یہ علم اسرار ہے، عوام کو بتانے کا نہیں، ورنہ کیا ملک الموت بھی موت کے وقت سے پیشگی آگاہ نہیں؟۔ پھر روح کیسے قبض کرتے ہیں؟ اور پھر بخاری شریف کی اس حدیث کا کیا مطلب ہوگا، جس میں رحم پر ایک فرشتہ موکل کرنے کی تصریح ہے، جو شکم مادر میں ہی موت، رزق اور شقی اور سعید لکھ دیتا ہے۔ کیا وہ بھی بے جانے پوچھے ہی موت کا وقت لکھ دیتا ہے؟ رئیس صاحب آپ نے عداوت مصطفیٰ ﷺ کا خمار دیکھا جس نے آپ کو کہیں کا نہیں رکھا۔

عینی شرح بخاری:

عمدۃ القاری جلد ۲ ص ۱۸ کے حوالہ سے رئیس صاحب نے تحریر فرمایا:

"علامہ عینی حنفی نے امام زجاج سے نقل کر کے سکوت کیا کہ جس نے ان پانچوں میں سے کسی کے علم کا دعویٰ کیا اس نے قرآن مجید کے ساتھ کفر کیا"۔

ہم کو حیرت ہے کہ یہ شخص کس طرح جیتی مکھی نگل جاتا ہے، اور ڈکار تک نہیں لیتا۔ امام عینی نے امام زجاج کا قول نقل کرنے سے چند سطر پہلے فرمایا:

"رواه البخاري مطولاً باب سوال جبرئيل عن الإيمان والإسلام ولفظه "في خمس لا يعلمهن الا الله."

امام بخاری نے یہ پوری حدیث باب سوال جبرئیل کتاب الایمان میں نقل کی جس میں جبرئیل امین علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے ایمان اور اسلام کے بارے مین پوچھا تھا، وہاں ان الفاظ میں حدیث ہے: في خمس لا يعلمهن الا الله۔ [عینی جلد ۷، ص: ۶۰]

جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ حدیث کتاب الایمان میں بھی نقل فرمائی ہے۔ اصولاً یہ دیکھنا چاہیے کہ امام عینی نے وہاں بھی کچھ کہا ہے یا نہیں؟۔ اور ہم خوب سمجھتے ہیں کہ رئیس صاحب نے اس مقام کو بھی ضرور دیکھا ہے۔ لیکن اس کا حوالہ اس لیے نہیں دیا ہے کہ اس کے اظہار میں رئیس صاحب کی موت ہے۔ کیوں کہ اس کے اظہار کے بعد ہم پر افترا کا جو الزام لگایا ہے اس کی قلعی بھی کھل جاتی اور امام زجاج کے قول کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے۔ وہاں امام عینی فرماتے ہیں:

"(في خمس الى آخره) قال القرطبي لا مطمع لأحد في علم شيء من هذه الأمور الخمس بهذا الحديث، وقد فسر النبي ﷺ قول الله تعالىٰ ﴿وعنده مفاتح الغيب لا يعلمها الا هو﴾ بهذه الخمس، وهو الصحيح، قال: فمن ادعىٰ علم شيء منها غير مسند إلى رسول الله ﷺ كان كاذباً في دعواه." [عمدۃ القاری جلد اول ص: ۲۹۰]

(في خمس) امام قرطبی نے فرمایا: ان پانچوں میں سے کسی کے علم کا کوئی لالچ نہ کرے، یہ بات اس حدیث سے ثابت ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے آیت مبارکہ مفاتح الغیب کی انہیں پانچ سے تفسیر فرمائی ہے اور یہی صحیح ہے۔ پس اگر کوئی ان میں سے کسی چیز کے علم کا رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت کیے بغیر دعویٰ کرے تو وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حدیث مبارکہ ((في خمس لایعلمهن إلا الله)) کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ بھی نہیں جانتے، نہ یہ مطلب ہے کہ وہ بھی نہیں جانتا جو یہ کہے کہ مجھے ان کا علم رسول اللہ ﷺ کے بتانے سے ہوا۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ نہیں جانتا جو بطور خود اٹکل سے جاننے کا مدعی ہے۔ حضور کے واسطہ سے ان امور کے علم کا دعویٰ کرنے والا جانتا ہے، تو خود حضور کیوں نہ جانیں گے۔

ناظرین! غور فرمائیں، اس وضاحت وتشریح کے بعد امام عینی کیا بولتے، پس امام عینی کا کوئی قصور نہیں کہ وہ چپ رہے ان کو تو جو بولنا تھا بول چکے، جو کچھ قصور ہے رئیس صاحب کا ہے کہ سن کر بھی ان سنی کردی۔ مگر اس کی رئیس صاحب سے کیا شکایت کی جائے۔

ارشاد الٰہی ہے: ﴿إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ﴾
[النمل پ۲۷۔ت ۸۰]

نہ مردوں کو حق بات سنائی جاسکتی ہے نہ بہرے حق کی پکار سن سکتے ہیں۔

ارشاد الساری لاحمد قسطلانی:

اس کتاب کے ساتھ بھی رئیس صاحب نے وہی معاملہ کیا، جسے امام عینی کی عمدۃ القاری کے ساتھ روا رکھا، صورت حال یہ ہے: امام بخاری نے حدیث جبرئیل علیہ السلام کے بیان کے لیے جو عنوان قائم کیا ہے اس عنوان کی تشریح کے سلسلہ میں امام قسطلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ضمناً یہ فرماتے ہیں:

"یدخل فیه اعتقاد وجود الساعة، وعدم العلم بوقتها لغیر الله تعالیٰ؛ لأنهما من الدین." [قسطلانی ج۲، ص:۱۱۴]

قیامت کے وجود کا اعتقاد اور اس کے وقت کا غیر اللہ کے لیے معلوم نہ ہونا دینی مسائل میں داخل ہیں۔

اتنی ہی عبارت پر رئیس صاحب نے وہ عمارت کھڑی کی ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا کہ "ان پانچوں کا علم اللہ تعالیٰ کے لیے خاص اور رسول اللہ ﷺ سے اس کی نفی کا عقیدہ فرض و واجب ہے"۔ جب کہ امام قسطلانی نے صرف قیامت کا نام لیا ہے بقیہ علوم کا نہیں۔

پھر ص:۱۱۶ پر حدیث مبارکہ في خمس لا یعلمهن کی تفسیر کرتے ہوئے

فرماتے ہیں:

”قال القرطبي: لا مطمع لأحد في علم شيء من هذه الأمور الخمس لهذا الحديث، فمن ادعیٰ علی شيء منها غیر مستند إلی رسول الله ﷺ کان کاذباً في دعواه.“ [قسطلانی اول، ص:۱۱۶]

امام قرطبی نے فرمایا کہ کوئی بھی ان پانچ امور کے علم کا لالچ نہ رکھے، اگر کسی نے ان میں سے کسی کے علم کا دعویٰ رسول اللہ ﷺ کا واسطہ دیے بغیر کیا تو وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہوگا۔

اس عبارت کا صاف مطلب یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا واسطہ دے کر کہ ان کے ذریعہ سے معلوم ہوا اگر کوئی شخص ان امور خمسہ کے علم کا دعویٰ کرے تو ہرگز غلط نہ ہوگا۔ اس توضیح کے بعد جاہل سے جاہل آدمی بھی یہی فیصلہ کرے گا کہ امام قسطلانی نے طراز باب کی تشریح میں جو عدم علم لــغیــر اللہ فرمایا ہے اس غیر سے مراد مستنداً الی رسول اللہ نہیں ہے، ورنہ امام قسطلانی یہاں اس کا استثنا نہیں کرتے۔ کیا اتنی سی بات امام قسطلانی بھول سکتے ہیں کہ دو صفحہ پیچھے میں نے کیا کہا ہے اور اب دو صفحہ بعد اس کا خلاف کیسے کر رہا ہوں۔ یہ کام تو رئیس صاحب کا ہے۔ ﴿تومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض﴾

بیضاوی شریف:

اس کتاب کے ساتھ محترم جناب رئیس صاحب نے عجیب مذاق کیا ہے۔ بیضاوی شریف جلد۲، ص:۵۶ کے حوالہ سے وہ دعویٰ کیا ہے جس کا ذکر ہم گزشتہ سطور میں کر آئے ہیں۔

ہمارے یہاں بیضاوی شریف مطبع مصطفیٰ البابی ۱۳۵۸ھ ہے، اس میں ہم نے مذکورہ حوالہ تلاش کیا جو اس صفحہ میں ناپید ہے۔ اس لیے مختلف مقامات پر اس بحث کو تلاش کیا۔ جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

امام بیضاوی آیت مبارکہ: ﴿یومنون بالغیب﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

”والمراد به الخفي الذي لا يدركه الحس ولا يقتضيه بديهة العقل، وهو قسمان: قسم لا دليل عليه وهو المعنى بقوله تعالیٰ: ﴿وعنده مفاتح الغيب لا يعلمها الا هو﴾ وقسم نصب عليه دليل كصانع وصفاته واليوم الآخر وأحواله وهو المراد في هذه الآية.“ [بیضاوی اول، ص:۱۴]

غیب سے مراد وہ پوشیدہ امر ہے جسے حس نہ معلوم کر سکے، اور بداہۃً عقل نہ جان سکے، غیب کی دو قسمیں ہیں: (۱) جس پر کوئی علامت نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے قول مفاتح الغیب میں وہی غیوب مراد ہیں جن پر علامت نہیں۔ اور ایک قسم وہ جس پر علامتیں ہوں جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، قیامت اور اس کے احوال۔ آیت یومنون بالغیب میں یہی مراد ہیں۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: بعض غیوب کو بندہ دلائل سے معلوم کو سکتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور یوم آخر اور اس کے احوال، اور کچھ غیب ایسے ہیں جن کو دلائل وبراہین سے معلوم نہیں کیا جا سکتا جیسے مفاتح الغیب یا علوم خمس۔

پھر سورۂ آل عمران آیت مبارکہ: ﴿ما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"ما کان الله ليؤتي أحدكم علم الغيب فيطلع على ما في القلوب من كفر وإيمان، ولكن الله يجتبي لرسالته من يشاء فيوحي إليه ويخبره ببعض المغيبات أوينصب له مايدل عليها." [بیضاوی اول، ص: ۱۱۷]

اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کو علم غیب دے کر دلوں میں چھپے ہوے کفر وایمان پر مطلع نہیں کرتا، لیکن اپنی رسالت کے لیے جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ تو اس کی طرف وحی کرتا ہے، اس کو بعض مغیبات کی خبر دیتا ہے۔ اور ان کے لیے غیب پر علامت مقرر فرماتا ہے۔

سورۂ بقرہ میں دو قسمیں کیں "مالا دليل عليه وما دليل عليه" ما دلیل علیہ تو عامہ مومنین کا حصہ قرار دیا۔ اب یہ مالا دلیل علیہ ہی تھا جس کے لیے فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے لیے ان پر دلیل بھی قائم فرماتا ہے، اور وحی کے ذریعہ بھی خبر دیتا ہے۔ بات یہاں بھی اگرچہ واضح ہے مگر سورہ جن شریف میں تسمہ بھی لگا نہیں رکھا فرماتے ہیں:

"أي: على غيبه المخصوص به علمه ﴿الا من ارتضیٰ﴾ لعلم بعضه حتى يكون معجزة له، ﴿من رسول﴾ بيان لمن، واستدل به على ابطال الكرامات، وجوابه تخصيص الرسل بالملك، والإظهار بما يكون بغير واسطة، وكرامات الأولياء على المغيبات إنما تكون تلقياً عن الملائكة."

[بیضاوی جلد ۲، ص ۴۰۴]

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص غیب پر جو اس کی ذات کے لیے خاص ہے اطلاع و علم کے لیے پسندیدہ رسولوں کو چن لیتا ہے، اس آیت سے اولیائے کرام کے علم غیب کا انکار کیا گیا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ رسول کی تخصیص فرشتوں سے ہے، اور اظہار وہ ممنوع ہے جو بے واسطہ ہو۔ اور اولیائے کرام جو غیب ظاہر فرماتے ہیں وہ فرشتوں کے واسطہ سے ہے۔

یہ عبارت ببانگ دہل اعلان کر رہی ہے کہ وہ غیب جس کو بیضاوی مخصوص بذات باری مانتے ہیں۔ انہیں پر رسولوں کے مطلع ہونے کے قائل ہیں، بلکہ اولیاء اللہ بھی ازروے کرامت ان پر مطلع ہوسکتے ہیں۔

اب اس اعلان وو ضاحت کے بعد رئیس صاحب کو اختیار ہے، چاہے حق سنیں چاہے اپنی ہی کہے جائیں۔

تفسیر امام رازی:

امام رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تفسیر کے ساتھ بھی رئیس صاحب نے وہی معاملہ کیا جو امام بیضاوی کی تفسیر کے ساتھ۔ ہمارے پاس تفسیر کبیر کے دو نسخے ہیں: ایک جدید الطبع صرف تفسیر کبیر کا جو تیس جلدوں میں ہے۔ دوسرا قدیم نسخہ جس کے حاشیہ پر تفسیر ابو سعود ہے، رئیس صاحب نے اپنا مخصوص دعویٰ تفسیر کبیر جلد ششم ص: ۵۰۳ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔ اول الذکر نسخے کی جلد ششم میں پانچ سو صفحے ہیں ہی نہیں۔ ثانی الذکر کے صفحہ پانچ سو تین پر رئیس صاحب کے دعویٰ کا کہیں دور دور پتہ نہیں۔ دعویٰ کا کیا ذکر پورے صفحہ میں علم غیب کا ہی کوئی تذکرہ نہیں۔ البتہ پوری تفسیر کبیر میں بہت سی جگہوں پر امام رازی نے علم غیب کے مباحث ذکر فرمائے ہیں۔ ہم یہاں ان میں سے کچھ ذکر کرتے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد واضح ہو جائے گا کہ ان تشریحات کے ہوتے ہوئے ناممکن ہے کہ امام رازی وہ بات کہیں جس کو رئیس صاحب ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

چنانچہ امام صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ یومنون بالغیب کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

”الثاني: هو قول جمهور المفسرين. إن الغيب هو الذي يكون غائباً عن الحاسة، ثم هذا الغيب ينقسم إلى ما عليه دليل، وإلى ما ليس عليه دليل، فالمراد من هذه الآية مدح المتقين بأنهم يومنون بالغيب الذي دل عليه

دلیل۔'' [تفسیر رازی دوم ص: ۲۷]

دوسرا قول جمہور مفسرین کا ہے کہ غیب اسے کہتے ہیں جو حاسہ سے غائب ہو، غیب کی دو قسمیں ہیں: وہ جس پر دلیل وقرائن ہوں اور وہ جس پر کوئی دلیل وقرینہ نہ ہو۔ تو اس آیت مبارکہ میں متقیوں کی اس بات پر تعریف کی گئی ہے کہ وہ اس غیب پر ایمان لاتے ہیں، جو قرائن واسباب سے جانا جاتا ہے۔

یہاں امام رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے وہی بات کہی ہے، جسے امام بیضاوی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ غیب کی دو قسمیں ہیں: بادلیل اور بے دلیل۔ اور بادلیل غیب مومنوں متقیوں کو حاصل ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ دوسری جگہ بھی اس مسئلہ پر نص فرماتے ہیں:

''العبد یعلم الغیب أم لا؟ قلنا: قد بینا أن الغیب ینقسم إلی ماعلیه دلیل، وإلی مالا دلیل علیه. أما الذي لا دلیل علیه، فهو سبحانه وتعالیٰ العالم به لا غیر، وأما الذي علیه دلیل فلا یمتنع أن تقول نعلم من الغیب مالنا علیه دلیل.'' [تفسیر رازی دوم ص: ۲۸]

بندہ غیب جانتا ہے یا نہیں، ہم بتا چکے ہیں۔ کہ غیب کی دو قسمیں ہیں، تو جس غیب پر دلیل نہیں ہے اس کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ دوسرا نہیں، اور جس غیب پر دلیل ہے، اس کے لیے ہم دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم اس کو جانتے ہیں۔

اس طرح امام رازی اور قاضی بیضاوی دونوں بزرگوں نے اس امر کی تصریح فرمادی کہ غیب کی ایک قسم ایسی ہے جو بندوں کو قطعاً حاصل ہے۔ اور وہابی حضرات کے اس پروپیگنڈے کی قلعی کھول دی کہ ''غیب خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا'' ہاں غیب کی ایک قسم ایسی ضرور ہے۔ جو مخصوص بذات باری تعالیٰ ہے، اور قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں وہی ''مفاتح الغیب'' ہیں۔

غیب دانی میں نبی اور غیر نبی برابر ہیں یا انبیا کو کچھ برتری حاصل ہے۔ اس امر پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''فان سنة اللہ جاریة بأنه لا یطلع عوام الناس علی غیبه، بل لا سبیل لکم إلیٰ معرفة ذلک الامتیاز إلا بالامتحانات، فأما معرفة ذلک علی سبیل

الاطلاع من الغیب فھو من خواص الأنبیاء، فلھذا قال: ﴿ولکن یجتبي من رسله من یشاء﴾"
[تفسیر رازی نہم ص:۱۱۱]

اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے کہ عام لوگوں کو اپنے غیب پر مطلع نہیں کرتا، ان کے لیے علم غیب کی معرفت کا ذریعہ تجربہ اور اسباب وذرائع ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرستادہ بھیج کر غیب کی اطلاع کرے یہ انبیا کے خواص سے ہے، اسی لیے قرآن عظیم میں فرمایا گیا ہے کہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے اطلاع دیتا ہے۔

یہ بات صاف ہوجانے کے بعد کہ انبیا علیہم السلام غیب دانی میں عوام کی طرح اسباب وذرائع کے پابند نہیں، انہیں براہ راست تعلیم الٰہی کے ذریعہ یہ علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ سوال قابل غور ہے کہ انبیا علیہم السلام کو تعلیم کے ذریعہ جو غیب حاصل ہوتا ہے وہ کون سا علم غیب ہے، وہ جو عوام کا حصہ یعنی مادلیل علیہ ہے، یا وہ غیب ہے جو مالا دلیل علیہ ہے۔ یعنی جس کو امام رازی نے مخصوص بذات باری فرمایا۔ اور امام بیضاوی نے مفاتح الغیب کہا۔ اس امر کی وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو:

"احتج أھل الإسلام بھذہ الآیة علی أنه لا سبیل إلی معرفة المغیبات إلا بتعلیم اللہ تعالیٰ، وأنھا لا یمکن التوسل إلیھا، وتظھرہ قوله تعالیٰ: ﴿عندہ مفاتح الغیب﴾. وقوله: ﴿عالم الغیب فلا یظھر علی غیبه أحداً إلا من ارتضیٰ من رسول﴾"
[تفسیر رازی ثانی ص:۲۰۹]

اہل اسلام نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ غیب کی معرفت کا ذریعہ صرف تعلیم الٰہی ہے، علم نجوم، کہانت، عرافہ، وغیرہ سے اس کا علم حاصل نہیں ہوسکتا، اس امر کی تائید اللہ تعالیٰ کے قول ﴿عِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ﴾ اور ﴿عَالِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْھِرُ عَلٰی غَیْبِهٖ أحَداً الآیة﴾ سے ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جس غیب کی معرفت کا ذریعہ صرف تعلیم الٰہی ہے، دوسرے اسباب وذرائع سے حاصل نہ ہوسکے، وہ وہی علم غیب ہے جس پر کوئی دلیل نہ ہو اور جس کو رازی وقاضی علیہما الرحمہ نے "مفاتح الغیب" اور "مخصوص بذات باری" کہا ہے، ورنہ وہ غیب جس پر دلیل ہے اس کے بارے میں فیصلہ ہی کر آئے ہیں کہ وہ اسباب وذرائع سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ تعلیم کے ساتھ

خاص نہیں۔ پس یہی مخصوص غیب تعلیم کے ساتھ خاص اور تعلیم غیب انبیا کے لیے خاص۔ تو ثابت ہوا کہ مفاتح الغیب بذریعہ تعلیم انبیا علیہ السلام کو معلوم ہوتے ہیں۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی اس اصولی بحث نے ہی آزاد صاحب کی اس فضا بندی کا مطلع صاف کر دیا کہ امام رازی رسول اللہ ﷺ سے ان پانچوں علم کی نفی فرض قرار دیتے ہیں "لیکن علوم خمسہ میں سے خاص علم قیامت کی تعلیم واطلاع دہی کی وضاحت نے (حوالہ گذرا) تو سر بازار ننگا کر دیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیگر اشیا غیب مخصوص بذاتہ تعالیٰ کے بارے میں بھی امام رازی کی تصریحات ہدیۂ ناظرین کی جائیں۔ فرماتے ہیں:

﴿ولا رطب ولا يابس إلا في كتاب مبين﴾. وفائدة هذا الكتاب أمور: أحدها أنه تعالىٰ انما كتب هذه الأحوال في اللوح المحفوظ لتقف الملائكة على نفاذ علم الله تعالىٰ في المعلومات، وأنه لا يغيب عنه مما في السموات والأرض شيء، فيكون في ذلك عبرة تامة كاملة للملائكة الموكلين باللوح المحفوظ، لأنهم يقابلون به ما يحدث في صحيفة هذاالعالم فيجدونه موافقاًله." [تفسیر رازی جلد ۱۳، ص: ۱۱]

ہر خشک وتر لوح محفوظ میں ہے۔ اس کتاب کے چند فائدے ہیں: پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ فرشتے مکتوبات لوح محفوظ کے ذریعہ ساری کائنات میں علم الٰہی کے نفاذ پر آگاہ ہوں کہ آسمان وزمین کی کوئی شی بھی علم الٰہی سے غائب نہیں ہو سکتی، اور ان فرشتوں کو عبرت تامہ کاملہ حاصل ہو جو لوح محفوظ کا عالم میں رونما ہونے والے حادثوں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ تو جیسا اس میں لکھا رہتا ہے ویسا ہی دنیا میں ہوتا پاتے ہیں۔

اللہ اللہ لوح محفوظ پر مقرر فرشتوں کی عبرت تامہ وکاملہ اور علم الٰہی کے نفاذ کی تعلیم کے لیے لوح محفوظ ان کے پیش نظر کر دی گئی، کہ آیندہ واقعات کی رپورٹ لوح محفوظ میں دیکھیں، اور ہونے والے حوادث کا ان سے مقابلہ کریں۔

لیکن جس رسول کو سارے انسانوں کے لیے عبرت وبصیرت کا سرمایہ، سبب معرفت علم قدرت الٰہی بنا کر بھیجا انہیں ہی لوح محفوظ تو کیا آنے والے واقعات سے بھی بے خبر رکھا۔ انا للہ

وانا الیہ راجعون۔

مگر ہماری گزارش تو آزاد صاحب سے یہ ہے کہ یہ وہی امام رازی ہیں جو بقول آپ کے رسول ﷺ کو علوم خمسہ سے بے خبر ماننا فرض قرار دے رہے تھے۔ کہ وہ علم الٰہی کا خاصہ ہے۔ موکلان لوح محفوظ کے لیے اتنے فراخ دل کیسے ہو گیے۔ کہ نہ صرف علوم خمسہ بلکہ خشک وتر کا عالم بنا دیا۔ کیا معاذ اللہ یہ فرشتے بھی ذات الٰہی میں کوئی حصہ رکھتے ہیں؟ سبحان اللہ فر من المطر وقام تحت المیزاب، بارش سے بھاگ کر پرنالے کے نیچے کھڑا ہونا اسی کو کہتے ہیں۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات عالیہ اور بھی ہیں، فی الحال ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

خازن شریف:

اس کتاب میں رئیس صاحب نے ہاتھ کی صفائی سے خوب خوب کام لیا ہے۔ کم پڑھے لکھے ناظرین پر یہ تاثر قائم کرنے کے لیے کہ موصوف کی تائید میں بہت ساری کتابیں ہیں، ڈھیروں حوالے اور سارے ہی اساطین اسلام ہیں۔ ایک ہی حوالہ بار بار روپ بدل کر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً: علامہ نسفی کی تفسیر جلد سوم ص: ۲۱۹ کی عبارت کا حوالہ تین جگہ دیا، ایک جگہ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف منسوب کر کے، دوسری دو جگہوں پر امام نسفی کے کلام کی حیثیت سے، پھر صفحہ کے نمبر میں بھی یہ چابک دستی فرمائی کہ دو جگہ جلد سوم ص: ۳۱۹، لکھا اور ایک جگہ ۲۱۹ کہ بے علم دیکھے تو سوچے علاحدہ علاحدہ حوالے ہیں، اور جانکار ٹوکے تو تاویل سامنے ہے کہ کتابت کی غلطی ہے۔ مقصد یہ کہ جس طرح اور جتنے لوگ دھوکہ میں پڑ سکیں فائدہ ہی فائدہ ہے۔

تفسیر کبیر اور بیضاوی کا حال اوپر لکھ آے ہیں۔ تفسیر ابو سعود میں صفحہ موجود جلد کا حوالہ غائب ہے۔ اسی قسم کا کرتب تفسیر خازن شریف کے ساتھ بھی روا رکھا ہے۔ جلد خامس ص: ۱۸۳، کی عبارت کا حوالہ تین جگہ دیا، ایک جگہ ضرف صفحہ نمبر کا، دو جگہ عبارت لکھی اس میں یہ چالاکی کی کہ ایک جگہ ذرا تھوڑی اور دوسری جگہ پر کچھ طویل، صفحات کے حوالہ میں دو جگہ ص: ۱۸۳ اور ایک جگہ ۱۸۵، مقصد غالباً یہی کہ نادان دیکھے تو کہے واہ واہ کیا حوالوں کی بھرمار ہے۔ اور دانا ٹوکے تو تاویلوں کا سہارا لیا جاے۔

ذیل میں ہم امام خازن کی محولہ عبارت بھی نقل کرتے ہیں۔ اوراس کے بعد خود ان کا فیصلہ بھی تا کہ اہل انصاف خود ہی فیصلہ کرلیں کہ رئیس صاحب حق ودیانت کا گلہ گھوٹنے میں کہاں تک کامیاب ہوے ہیں:

﴿ان الله عنده علم الساعة﴾ عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال: مفاتيح الغيب خمس، ﴿إن الله عنده علم الساعة﴾ الآية. ومعنى الآية أن الله عنده علم الساعة، فلا يدرى أحد من الناس متى تقوم الساعة، في أي سنة، أو أي شهر، أو أي يوم ليلاً ونهاراً، قال ابن عباس: من هذه الخمسة لا يعلمها ملك مقرب ولا نبي مصطفىٰ، فمن ادعىٰ أنه يعلم شيئاً من هذه فإنه كفر بالقرآن؛ لأنه خالفه.'' [تفسیر خازن خامس ص:۱۸۳]

اللہ کے پاس قیامت کا علم ہے۔ ابن عمر سے روایت ہے کہ مفاتیح غیب پانچ چیزیں ہیں جن کا بیان ﴿ان الله عنده علم الساعة﴾ والی آیت میں ہے۔ تو آیت کے معنی یہ ہوے کہ کوئی یہ نہیں جانتا کہ قیامت کب قائم ہوگی، کس سن کس مہینہ کس دن یا رات میں۔ اور ابن عباس فرماتے ہیں کہ ان پانچوں کا علم نہ مقرب فرشتہ کو ہے نہ نبی مرسل کو، تو جو کوئی ان میں سے کسی کا دعویٰ کرے تو اس نے قرآن کا کفر کیا کہ اس کی مخالفت کی۔

خازن شریف کی یہ پوری عبارت، حضرت ابن عمر کے قول ابن عباس کے فرمان اور تفسیر قتادہ کے بعض حصوں کا مجموعہ ہے، جس میں سے بعض کو تو رئیس صاحب نے بار بار پیٹ کیا ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم ان پر پوری روشنی ڈال چکے، دوبارہ اعادہ تطویل لا طائل ہے۔ لیکن امام خازن رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی تفسیر کی دوسری جلد ص:۲۶۶، پر خود ہی اس مسئلہ کا فیصلہ فرما دیا ہے، کسی دوسرے کے لیے باقی نہیں لگا رکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

﴿ولو كنت أعلم الغيب﴾ يريدون وقت الموت ﴿لاستكثرت من الخير﴾ يعني: من العمل الصالح، وقيل: إن أهل مكة لما سئلوا رسول الله ﷺ عن الساعة أنزل الله تعالىٰ الآية الأولىٰ وهذه الآية، ومعناه: إنا لا ندعي علم الغيب حتى أخبركم عن وقت قيام الساعة، وذلك لمّا طلبوه بالإخبار عن الغيوب فذكر أن قدرته قاصرة عن علم الغيب، فإن قلت: قد أخبر ﷺ

عن المغيبات، وقد جاءت أحاديث في الصحيح بذلك، وهو من أعظم معجزاته ﷺ، فكيف الجمع بينه وبين قوله: ﴿ولو كنت أعلم الغيب لاستكثرت من الخير﴾، قلت: يحتمل أن يكون قاله ﷺ على سبيل التواضع والأدب، والمعنى لا أعلم الغيب إلا أن يطلعني الله عليه ويقدره لي، ويحتمل أن يكون قال ذلك قبل أن يطلعه الله عزوجل على الغيب، فلما أطلعه الله عزوجل أخبر به كما قال تعالىٰ: ﴿فلا يظهر على غيبه أحداً إلا من ارتضى من رسول﴾ أو يكون خرج هذا الكلام مخرج الجواب عن سؤالهم، ثم أظهره الله تعالىٰ سبحانه على أشياء من المغيبات فأخبر عنها۔"

[تفسیر خازن دوم، ص: ۲۶۶]

اگر میں غیب جانتا، مطلب یہ کہ موت کا وقت جانتا تو بھلائی جمع کر لیتا یعنی عمل صالح۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے قیامت کے بارے میں سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے پہلی اور یہ آیت اتاری، اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ میں علم غیب کا مدعی نہیں ہوں کہ تم کو قیام قیامت کا وقت بتاؤں، ایسا ہے کہ جب لوگوں نے آپ سے غیب کی خبریں دریافت کیں تو آپ نے فرمایا: کہ میری طاقت غیب کی دریافت سے قاصر ہے، اس پر اگر تم یہ اعتراض کرو کہ حضور ﷺ نے تو غیبوں کی خبر دی اور صحیح میں اس کا بیان بہت حدیثوں میں ہے، اور اخبار بالغیب حضور ﷺ کے عظیم معجزات میں سے ہے، تو آیات اور احادیث میں توفیق اور تطابق کیسے ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ حضور کا اخبار بالغیب برحق ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بتلائے بغیر نہیں جان سکتا۔ اور یہ بھی تطبیق کی ایک صورت ہے کہ کہا جائے: انکار تب کیا کہ اللہ نے انہیں مطلع نہیں کیا تھا۔ اور جب مطلع کر دیا تو بتا دیا۔ آیت مبارکہ **فلا یظھر الآیۃ** میں بھی تو یہی ہے کہ اللہ اپنے پسندیدہ رسولوں کو اپنے غیب پر اطلاع دیتا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انکار انہیں جواب دے کر خاموش کرنے کے لیے ہو۔ بعد میں خدا نے بتایا تو لوگوں کو خبر دے دی۔

امام خازن رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مذکورہ بالا تصریح کے مطابق کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے قیامت کے وقت اور موت کی گھڑی کا حال دریافت کیا۔ آپ نے ان کے جواب میں ارشاد فرمایا: میری طاقت غیب کی دریافت سے قاصر ہے، اتنی عبارت کا مطلب وہی ہوا جو رئیس

صاحب کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ ﷺ موت اور قیامت کا وقت نہیں جانتے۔ لیکن امام خازن اس مقام پر خود ہی نکتہ سوال اٹھاتے ہیں، کہ حضور علیہ الصلاۃ والتسلیم نے بے شمار غیوب کی خبر دی، اور یہ اخبار بالغیب آپ کے عظیم ترین معجزات میں سے ہے۔

پھر اس صاف صاف انکار کا کیا مطلب اور ان بے شمار روایتوں کا کیا جواب؟ اور پھر خود ہی جوابات مرحمت فرماتے ہیں:

پہلا جواب:۔ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کو غیوب کی خبر ہے۔ انکار تو اضعاً فرمایا ہے، کہ میرا غیب کی اطلاع دینا تو تعلیم الٰہی پر موقوف ہے۔

دوسرا جواب:۔ غیب کے علم کا انکار اس وقت فرمایا گیا جب تک اس کی اطلاع من جانب اللہ نہ تھی، جب اطلاع ہوئی آپ نے لوگوں کو اس کی خبر دی۔

تیسرا جواب:۔ انکار کافروں کو خاموش کرنے کے لیے تھا۔ ورنہ حضور علیہ السلام نے حسب اطلاع الٰہی ضرور غیوب کی خبر دی۔

اس شد و مد کے ساتھ اثبات علم اور انکار کی تاویل کے بعد بھی رئیس صاحب کا امام خازن کو منکرین کی صف میں شمار کرنا، دیانت کے کس خانہ میں آئے گا۔ اس کا فیصلہ ہم ناظرین پر چھوڑتے ہیں۔ اسی طرح امام خازن نے بار بار تعلیم الٰہی اور اطلاع زبانی کی تکرار کر کے رئیس صاحب کی اس ہٹ دھرمی کی بھی قلعی کھولی، جو علم غیب ذاتی اور عطائی کی تفریق پر انہیں چراغ پا بنا دیتی ہے۔

تفسیر جلالین شریف:

تفسیر جلالین شریف عربی میں قرآن عظیم کا لگ بھگ ترجمہ ہے، عموماً محذوفات اور متعلقات کے اظہار اور واجبی تشریح پر وہ اکتفا کرتے ہیں۔ اسی لیے حسب عادت انہوں نے ﴿ان اللہ عندہ علم الساعۃ.﴾ کی تفسیر میں بھی بقدر کفایت ترجمہ پر ہی اکتفا کیا ہے، اسی پر رئیس صاحب نے وہ عمارت کھڑی کی ہے، کہ ”ان پانچوں کے علم کی نفی نبی ﷺ کی ذات مبارکہ سے فرض و واجب ہے“۔ حالانکہ جلالین میں اس موقع سے نبی ﷺ کا نام بھی نہیں لیا گیا ہے، صرف یہ فرمایا ہے: ﴿لا یعلم أحد من الثلاث غیر اللہ.﴾ اللہ تعالیٰ کے علاوہ نہیں جانتا۔

لیکن جلالین کے حاشیہ میں امام صاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جو کچھ فرمایا ہے اس سے آیت مبارکہ کی پوری تشریح بھی ہو جاتی ہے اور منکرین علم غیب رسول اللہ ﷺ کی پوری طرح صفرا شکنی بھی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

”قوله: ﴿عنده مفاتح الغيب﴾ أنه منفرد بعلم الغيب لا يعلمها إلا هو، فلا ينافي أن بعض الأنبياء والأولياء يطلعه الله على بعض المغيبات والحادثة قال تعالىٰ: ﴿عالم الغيب﴾ الآية.“ [حاشیہ صاوی جلد ۲، ص: ۱۷]

ارشاد الٰہی مفاتح غیب جنہیں خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، اس کا مطلب یہ ہے کہ علوم غیب کے ساتھ باری تعالیٰ مستقل بالذات ہے۔ تو یہ آیت اس بات کے منافی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی یا ولی کو بعض غیوب پر مطلع کرے۔ کہ آیت مبارکہ ﴿فلا يظهر على غيبه﴾ کا مطلب یہی ہے۔

﴿لو كنت أعلم الغيب﴾ الآية، إن قلت: إن هذا يشكل مع تقدم أنه اطلع على جميع مغيبات الدنيا والآخرة. والجواب أنه قال تواضعاً أو أن علمه بالغيب كلا علم حيث إنه لا قدره له على تغيير ما قدر الله“

[تفسیر صاوی جلد ۲، ص: ۹۸]

اگر میں غیب جانتا تو بھلائی جمع کر لیتا، اگر تم اعتراض کرو کہ اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا و آخرت کے تمام غیوب پر رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی، پھر اس آیت کا کیا مطلب؟ تو میں کہوں گا کہ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ نے تواضعاً اپنی ذات سے علم کی نفی فرمائی ہے۔ یا یہ کہ علم الٰہی کے مقابلہ میں یہ علم نفی کے برابر ہے کہ حضور کو قدرت الٰہی کے بدلنے پر قدرت نہیں۔

”أي من حيث ذاتها. أما باعلام الله العبد فلا مانع منه، كالأنبياء وبعض أوليائه، وقال تعالىٰ: ﴿لا يحيطون بشيء من علمه إلا بما شاء﴾ وقال تعالىٰ: ﴿علم الغيب﴾ الآية. وكذا أولىٰ فلا مانع من كون الله يطلع بعض عباده الصالحين على بعض هذه المغيبات، فتكون معجزة للنبي وكرامة للولي، ولذلك قال العلماء الحق: إنه لم يخرج نبينا من الدنيا حتى اطلعه على تلك

الخمس ولكنه أمر بكتمها." [صاوی ثالث، ص:۲۱۵]

اللہ تعالیٰ کو ذاتی علم ہے، لیکن اللہ کے بتانے سے بندوں کو بھی غیب کا علم ہونے میں کوئی ممانعت نہیں ہے، جیسے انبیا، اولیا، خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کہ اللہ کے علم کا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا مگر جتنا خدا چاہے۔ اور فرماتا ہے: اللہ عالم الغیب ہے وہ اپنے غیب پر پسندیدہ رسولوں کے سوا کسی کو مطلع نہیں کرتا، تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض نیک بندوں کو بعض غیوب پر اطلاع بخش دے جو نبی کا معجزہ ہوا اور ولی کی کرامت۔ یہی وجہ ہے کہ علما نے فرمایا: کہ حضور ﷺ اس وقت تک دنیا سے تشریف نہ لے گئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں "علوم خمسہ" کی تعلیم دی، ہاں دوسروں سے چھپانے کا البتہ انہیں حکم تھا۔

سبحان اللہ! امام صاوی نے تو آزاد صاحب کی ننھی جان پر قیامت کبریٰ ہی قائم فرمادی۔ نہ صرف یہ کہ انبیا و اولیا کے لیے غیب ثابت کیا، سید الانبیا ﷺ کے لیے تو دنیا و آخرت کے جمیع غیوب کا ثبوت مانا۔ اور بالخصوص "علوم خمسہ" ان کے لیے تو یہ تصریح کی کہ جب تک وہ سب معلوم نہ ہوئے رسول اللہ دنیا سے تشریف ہی نہ لے گئے۔ رئیس صاحب سے پوچھنا چاہیے: کیا یہ امام صاوی بھی بریلوی ہی تھے؟۔

گر یہی بے خبری حضرت والا ہوگی تار و پود پدری سب تہ و بالا ہوگی

اس پورے مضمون میں چوں کہ ہمارا انداز "جواب آن غزل اور ترکی بہ ترکی" کا رہا ہے۔ اس لیے رئیس صاحب کے کرتب پر زیادہ توجہ رہی، لیکن ناظرین اگر غور اور توجہ سے کام لیں گے تو مسئلہ علم غیب کے تمام پہلوؤں کی بھی پوری وضاحت ہو رہی ہے۔

مثلاً: پہلی بات یہ کھل کر سامنے آ گئی کہ تمام علماے اسلام حضور سید عالم ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے مطلقاً علم غیب کے قائل ہیں، کیوں کہ سب نے یک طرفہ یہی تصریح کی ہے کہ تعلیم الٰہی سے بعض غیوب کا علم انبیاء کو حاصل ہے۔ اور کچھ نے انبیاء کے ساتھ ساتھ اولیا کے لیے بھی اس کا قول کیا ہے، اور بعض طبیبوں کے لیے بھی انبیاء کے وساطت سے اس علم کے قائل ہیں اور بعض نے سب کو دعویٰ علم غیب کی اجازت دی ہے، بشرطیکہ وہ علم بواسطہ نبی ﷺ ہو۔

"قاضی بیضاوی" اور "امام رازی" علیہما الرحمۃ والرضوان نے اس موضوع پر زیادہ عقلی انداز اختیار کیا ہے۔ اور ما دلیل علیہ و ما لا دلیل علیہ دو قسمیں کر کے ہر ایک کے جاننے والوں کی

تفصیل ذکر کی ہے، اور مالا دلیل علیہ کو تعلیم الٰہی سے انبیاء اور اولیاء کے لیے خاص فرمایا ہے۔ اس لیے انبیا علیہم السلام کے لیے علم غیب عطائی کا دعویٰ افتراء یا نیا مذہب نہیں ہے۔ خالص افترا اور بدعت ضلالہ وہ حرکت ہے جو رئیس صاحب اور ان کے گروپ سے صادر ہوئی، کہ انبیا علیہم السلام مطلقاً علم غیب نہیں جانتے، اور اس سلسلہ میں جن جن عبارتوں شخصیتوں یا کتابوں کا انہوں نے سہارا لیا ہے، اس میں یا تو سراسر فراڈ کیا ہے۔ یا صرف یک طرفہ بیان لیا ہے، دوسرے پہلو کو قصداً چھوڑ دیا ہے۔

دوسری بات یہ واضح ہوئی، کہ بہت سے اعلام امت نے علما کے قول "بعض علم غیب" کی وضاحت کی کہ رسول اللہ ﷺ کو جمیع علوم دنیا و آخرت کی تعلیم دی گئی۔ جیسا کہ امام صاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بیان سے گزرا۔ یعنی وہ بعض غیب جس کا ذکر عام مخصوص علما میں ہے۔ اس میں اور علم جمیع غیوب اور ما کان و ما یکون میں منافات نہیں، موجودات کے لحاظ سے یہ لاکھ کل اور تمام ہو لیکن علم الٰہی کے اعتبار سے بعض اور تھوڑا ہی ہے کہ متناہی کو غیر متناہی سے کوئی نسبت نہیں۔

تیسری بات خاص علوم خمسہ کے بارے میں ظاہر ہوئی کہ معتد بہ گروہ علما کا یہ خیال ہے کہ یہ علوم بھی رسول اللہ ﷺ کو ضرور بتائے گئے بلکہ جب تک ان کی تعلیم مکمل نہ ہوئی حضور ﷺ دنیا سے تشریف نہ لے گئے۔ ہاں علما کا دوسرا گروپ اس طرف بھی گیا ہے کہ خاص قیام قیامت کا علم کسی کو نہیں حتی کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی، اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی ذات کے لیے خاص فرمایا۔ جیسا کہ اس کی وضاحت مجدد مائۃ رابع عشر اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے کلام سے شروع میں ہی کی گئی۔

چوتھا امر یہ واضح ہوا کہ رسول اللہ ﷺ و علی آلہ الامجاد کے لیے علم جمیع ما کان و ما یکون کا دعویٰ صرف مولانا احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ یا ان کے معتقدوں کی ہی ایجاد نہیں ہے، اس مضمون میں جن جن بزرگوں کے حوالوں سے اس امر کی تصریح گزری وہ سب مولانا احمد رضا خاں صاحب سے پہلے ہی گزر چکے ہیں۔ امام احمد صاوی ان سب میں موخر ہیں۔ پھر بھی ان میں اور مولانا احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ولادت میں ۱۳۱ رسال کا فاصلہ ہے، اس طرح امام احمد رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ولادت سے تیس سال قبل ہی علم غیب مصطفیٰ ﷺ کے ان

سارے مراحل کی توضیح وتفصیل ہو چکی تھی جن کی ایجاد کا الزام یہ "نام نہاد موحدین" امام احمد رضا کے سر عائد کرتے ہیں۔

پانچواں مسئلہ جو دن کے اجالے میں آ گیا وہ علم غیب کی ذاتی وعطائی تقسیم کا ہے۔ جس بنیاد پر رئیس صاحب نے ہمارے علمائے کرام پر افترا کرنے کا الزام قائم کیا تھا۔ الحمدللہ تعالیٰ علمائے کرام کی تصریحات نے واضح کر دیا کہ اس افتراء پردازی کے واقعی مرتکب خود رئیس صاحب ہی ہیں۔ گویا:

یہ کیسا امتحان جذب دل الٹا نکل آیا
ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

ذاتی اور عطائی:

تیسرے مرحلہ میں ان آیات کا شمار آ سکتا ہے، جن میں اللہ پاک نے علم غیب کو اپنا خاصہ بتایا ہے۔ اور خود رسول اللہ ﷺ کی زبان سے بھی یہی کہلوایا ہے، رئیس صاحب نے اس موضوع کی صرف دو آیتوں: ﴿عندہ مفاتح الغیب الآیة. ﴾(انعام) اور ﴿ان اللہ عندہ علم الساعة. الآیة. ﴾(لقمان) کا اعادہ کیا ہے، جب کہ اب تک طرفین کی بحث میں نفی کی اور کئی آیتوں کا ذکر آ چکا ہے۔

ہم نے اپنی کتاب حاضر وناظر میں اس مقام کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا تھا۔ اور آیات نفی کے مقابلہ میں ان آیات کا ذکر کیا تھا، جن میں خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسولوں کو علم غیب عطا فرمانے کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اور پھر کتب تفاسیر اور تصریحات علما سے ان دونوں اقسام کی آیات میں متعدد تطبیقیں بیان کی تھیں۔ جن میں سے دو یہاں ذکر کرتے ہیں:

(۱) جہاں آیات میں علم کی نفی کی گئی ہے، وہاں مراد "علم کلی غیر متناہی ہے"۔ اور جہاں جہاں حضور ﷺ یا دیگر انبیا علیہم السلام کے لیے اثبات ہے، وہاں علم بعض یعنی جمیع ما کان وما یکون مراد ہے۔ وہیں ہم نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ علم بعض اور علم ما کان وما یکون میں کوئی منافات نہیں، دونوں ایک دوسرے پر صادق آتے ہیں۔

(۲) جہاں جہاں غیر اللہ سے علم غیب کی نفی کی گئی ہے، ان آیتوں میں "علم ذاتی" مراد ہے۔ جہاں جہاں اس کا ثبوت ہے "علم عطائی" ...

رئیس صاحب کو ان مباحث علمیہ پر کچھ کہنے کی جرأت تو ہوئی نہیں یک طرفہ نفی کی مذکورہ بالا دو آیتیں ذکر کر کے فرماتے ہیں:

''کہ عبدالمنان نے ذاتی اور عطائی کی تفریق کر کے جھوٹ بولا ہے۔ اور اس سلسلہ میں جتنی کتابوں کا حوالہ دیا ہے غلط ہے۔ ان کی عبارت یہ ہے:''

''اگر جھوٹ بکنے کی کوئی سزا ہے، اور یقیناً ہے، تو بلا شک علمائے اسلام پر افترا پردازی کے سبب بریلوی لوگ ضرور ماخوذ ہوں گے''۔ [ابطال ص:۵۱]

لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔

ہم نے باقاعدہ کتابوں کی عبارتیں لکھی تھیں اور علما کے نام تحریر کیے تھے۔ مگر رئیس صاحب نے ایک غمزۂ شاہدانہ میں سب کو جھوٹ کہہ کر فرصت لی۔ اب اس ہٹ دھرمی کا ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کیا جواب ہے کہ دوبارہ انہیں کتابوں کا مطبع اور صفحہ اور عبارتوں کے ساتھ حوالہ دیں۔ اور رئیس صاحب کے ساتھ ساتھ ان کے پورے طایفے کو چیلنج کرتے ہیں کہ کچھ بھی غیرت وحمیت ہو تو کسی ایک حوالہ کو بھی غلط ثابت کر کے اپنی تحریر کی لاج رکھیں ورنہ اپنے دھرم سے توبہ کریں جو شاید اسی قسم کی دھاندلی اور منہ زوری پر قائم ہے۔

(۱) پہلا نام ہم نے علامہ خفاجی کا لیا تھا ان کی عبارت حاضر ہے:

''(واتفاق معانيها على الاطلاع على الغيب) أي الأمور الغيبة، وهذا لا ينافي الآيات الدالة على أنه لا يعلم الغيب إلا الله، وقوله: ﴿لو كنت أعلم الغيب لأستكثرت من الخير﴾ فإن المنتفى علمه من غير واسطة، وأما اطلاعه بإعلام الله تعالىٰ فأمر محقق لقوله تعالىٰ: ﴿فلا يظهر على غيبه أحداً إلا من ارتضىٰ من رسول﴾''

[نسیم الریاض شرح شفاے قاضی عیاض، جلد ثالث ص:۱۵]

حدیثیں غیب کی اطلاع پر متفق المعنی ہیں، غیب سے مراد امور غیبیہ ہیں اور یہ ان آیتوں کے منافی نہیں ہے جن میں غیر اللہ سے غیب کی نفی کی گئی ہے۔ یا حضور کا ارشاد ہے کہ میں غیب جانتا تو بھلائی جمع کر لیتا، کیوں کہ جس علم کی نفی ہے وہ بلا واسطہ (ذاتی) ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے بتانے کے بعد (عطائی) تو ... محقق ہے ... اپنے غیب پر اپنے پسندیدہ

رسولوں کے علاوہ کسی کو مطلع نہیں کرتا۔

(۲) دوسرا نام حضرت امام مناوی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا وہ فرماتے ہیں:

"فأما قوله:﴿لا يعلمها إلا هو﴾ففسر بأنه لا يعلمها أحد بذاته ومن ذاته إلا هو،لكن قد تعلم باعلام الله تعالىٰ فان ثمه من يعلمها، وقد وجدنا ذلك لغير واحد، كما رأينا جماعة علموامتي يموتون، وعلموا ما في الأرحام حال حمل المرأة ، بل وقبله."

[فیض القدیر شرح جامع صغیر للعلامہ عبد الرؤف المناوی باب حرف المیم مخطوطہ خدا بخش خان لائبریری پٹنہ۔۳۰۹۸]

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ "غیب خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا" اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی خود اپنی ذات سے اس کے سوا نہیں جانتا لیکن اللہ کے بتانے سے تو جاننے والے ہیں۔ تحقیق کہ ہم نے اس کو بہت لوگوں کے لیے ثابت پایا۔ ہم نے ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ موت کے وقت سے آگاہ ہے، اور بعض کو حمل کے حالات سے واقف پایا بلکہ حمل سے پہلے بھی اس کا علم ان کو تھا۔

تیسرا نام علامہ شیخ ابن قاضی کا تھا ان کی تحریر یہ ہے:

"تزوجها بلا شهود، وقال: الله ورسوله، أو الله والملك شهود كفر؛ إذ اعتقد أن الرسول أو الملك يعلم الغيب، أقول:فان قيل: يشكل بأنه روي عن النبي ﷺ أنه يوم فتح مكة وفي حفر الخندق أخبر بفتح كسرىٰ وقيصر، فوقع كماأخبر وأمثاله عنه ﷺ كثير لا تنكر، وعن عمر رضى الله عنه أمر يا سارية الجبل مشهور، وكذا عن السلف في كتاب الثقات مذبور. يجاب بأنه يمكن التوفيق بأن المنفي هو العلم بالاستقلال لا العلم بالإعلام أو المنفي هو المجزوم به لا مظنون، ويؤيد"قوله تعالىٰ:﴿أتجعل فيها من يفسد فيها﴾ الآية ؛لأنه غيب أخبر به الملائكة ظناً منهم، أو بإعلام الحق فينبغي أن يكون كفراً لوادعاه لالو أخبر به بإعلام في نفسه، أو يقظه بنوع من الكشف ؛إذ لا منافاة بينه وبين الآية لمامر من التوفيق والله أعلم."

[جامع الفصولین [illegible] مطبوعہ [illegible] الامام محمود ابن اسرائیل

الشہیر بابن قاضی مسماۃ کتب خانہ مدرسہ اسلامیہ اندر کوٹ میرٹھ رقم۔ ۱۰۸۲]

عورت سے بغیر گواہوں کے نکاح کیا، اور کہا کہ اللہ اور رسول، یا اللہ اور فرشتے گواہ ہیں تو کفر کیا، اس لیے کہ اس نے یہ اعتقاد کیا کہ رسول یا فرشتے غیب جانتے ہیں۔ میں کہتا ہوں: اس حکم پر یہ اعتراض ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ اور خندق کھودتے وقت قیصر و کسریٰ کے مفتوح ہونے کی خبر دی جو من وعن واقع ہوئی، رسول اللہ ﷺ کی اس قسم کی دوسری پیش گوئیاں بھی بہت ہیں جن کا انکار ممکن نہیں، اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ''یا ساریۃ الجبل'' والا واقعہ بھی مشہور ہے، اسی طرح سلف صالحین سے قابل بھروسہ کتابوں میں بے شمار روایتیں ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں تطبیق ممکن کہ جس علم غیب کی نفی ہے وہ علم بالذات ہے، وہ علم نہیں جو کسی کے بتانے اور عطا سے ہو۔ یا یہ جواب ہے کہ جس علم کی نفی ہے وہ علم قطعی یقینی ہے وہ نہیں جو غالب گمان تک پہونچائے۔ ہمارے اس جواب کی تائید قرآن عظیم کی آیت مبارکہ ﴿أتجعل فیها من یفسد﴾ سے ہوتی ہے، کیوں کہ اس آیت میں ملائکہ نے ایک غیب کی خبر دی ہے۔ یا تو گمان وقیاس سے یا اللہ تعالیٰ کی تعلیم وعطاء کے بعد۔ پس مناسب یہی ہے کہ کفر جب ہو کہ علم ذاتی کا دعویٰ کرے، اور اگر یہ دعویٰ ہو کہ نیند میں یا بیداری میں بذریعہ کشف بتایا گیا تو کوئی حرج نہیں ہے کہ اس میں کوئی منافات نہیں۔ تطبیق اوپر گزر چکی۔

چوتھا نام علامہ محمد شنوانی کا تھا ان کی تصریح بھی ملاحظہ ہو:

''قوله: لا یعلم متی تقوم الساعة إلا الله، هذا إشارة إلی علوم الآخرة، فلا یعلم ذلک نبي مرسل ولا ملک مقرب، قال بعض المفسرین: لا یعلم هذه الخمس علم الدنیا ذاتیاً بلا واسطة إلا الله، فالعلم بهذا الصفة مما اختص الله به، وأما بالواسطة فلا یختص به تعالیٰ.''

[حاشیہ مختصر البخاری المعروف بحاشیۃ الشنوانی ص: ۲۳۹۔ ۲۴۰، سطر ۲۱ تا ۲۳، المطبع المصریہ ۱۲۸۶ھ، موجودہ رضا لائبریری رامپور کتاب، ۸]

اور یہ قول کہ ''لا یعلم متی تقوم الساعة الا الله'' یہ علوم آخرت کی طرف اشارہ ہے۔ تو اس کو نہ تو کوئی نبی مرسل جانتا ہے نہ فرشتہ مقرب، بعض مفسرین نے کہا کہ ان علوم خمسہ کو کوئی نہیں جانتا، مطلب یہ ہے کہ علم ذاتی بلا واسطہ اللہ تعالیٰ کی خصوصیت ہی ہے،

اور علم بالواسطہ تو یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص نہیں۔ (بلکہ یہ تو غیر خدا کے ساتھ ہی خاص ہے)
پانچواں نام علامہ نیشا پوری کا تھا، اور ان کی تفسیر سے مندرجہ ذیل عبارت بھی ہم نے نقل کی تھی:

"أی قل لا أعلم الغیب، فیکون فیه دلالة علی أن الغیب بالاستقلال لایعلمه الا الله."

یعنی آپ فرمایئے کہ میں غیب نہیں جانتا، اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ غیب بالاستقلال (ذاتی) خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

[نیشا پوری جلد رابع ص:۱۲۶، مطبع میمنہ مصر]

اسی جلد میں مزید تتبع اور تلاش سے اس موضوع پر ایک دوسری عبارت بھی ملی جو اس سے زیادہ عام اور واضح طور پر علم غیب کے عطائی ہونے کا اعلان کر رہی ہے:

﴿فامنوا بالله ورسله﴾ ومن جملة الإیمان بالله أن تعتقدوه وحده علاماً للغیوب، ومن جملة الإیمان بالرسل أن تنزلوهم منازلهم أن تعلموهم عبیداً مصطفین لا یعلمون من الغیب إلا ما علمهم الله تعالیٰ"

(تفسیر غرائب القرآن، ت۱۷۹ ۲/۳۱۷)

اللہ و رسول پر ایمان لاؤ۔ اللہ پر ایمان لانے کا مطلب ہے کہ تم اس کو اکیلا غیب کا جاننے والا اعتقاد کرو، اور رسولوں پر ایمان لانے کا مطلب ہے کہ انہیں خدا کا برگزیدہ بندہ جانو، اور تسلیم کرو کہ انہیں اسی غیب کا علم ہے جسے اللہ نے انہیں بتایا۔

اللہ تعالیٰ تنہا غیب کا جاننے والا ہے اور رسول خدا کے بتانے سے۔ ذاتی اور عطائی کہ اس سے زیادہ واضح تقسیم اور کیا ہوگی؟۔

امام رازی اور قاضی بیضاوی کی تشریحات گزشتہ بحث میں ہدیۂ ناظرین کی جا چکی ہیں، جس کے مطالعہ سے علم غیب کے ذاتی اور عطائی ہونے کا بیان آفتاب کی طرح روشن ہو چکا ہے۔

پھر رئیس صاحب ہمیں اجازت دیں گے کہ وہی الفاظ ہم انہیں واپس کر دیں جو انہوں نے ہمارے بارے میں کہے تھے کہ "عطائے تو بہ لقائے تو" کی مثل صادق آئے۔ اگر جھوٹ بکنے کی کوئی سزا ہے اور یقیناً ہے تو بلا شک علمائے اسلام پر اس افترا پردازی کے سبب مولوی رئیس

صاحب ضرور ماخوذ ہوں گے۔

الحمد للہ کہ ہم نام بنام علما کے حوالہ جات اور تصحیح نقل سے کما حقہ عہد برا ہو چکے۔ صرف ایک نام باقی ہے جس کے سلسلہ میں رئیس صاحب کی خدمت گزاری ابھی باقی ہے۔ یعنی محقق علی الاطلاق شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سو وہ بھی حاضر ہے:

بحث یوں چل رہی تھی کہ مولوی عبد الرؤف صاحب جھنڈے نگری نے بخاری شریف سے ﴿مفاتح الغیب﴾ کی تفسیر نقل کی کہ یہ علوم خمسہ ہیں، اور انہیں کا علم سوائے خدائے پاک کے اور کسی کو نہیں۔

ہم نے اشعۃ اللمعات سے اس حدیث کی شرح نقل کی کہ نہ جاننے کا مطلب مطلقاً عدم علم نہیں ہے، بلکہ عقلی جدوجہد سے جاننے کی نفی ہے۔ تو تعلیم الٰہی سے ان امور کا علم بھی غیر خدا کو ہوسکتا ہے۔ چنانچہ شیخ کی عبارت یہ ہے:

''مراد آں نست کہ بے تعلیم الٰہی بحساب عقل کس ایشاں راندانند''

[اشعۃ اللمعات ص:۴۲]

نہ جاننے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے بتائے بغیر اپنی عقل سے کوئی نہیں جان سکتا۔

اور ملا علی قاری، امام قرطبی، عینی، اور قسطلانی، رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے حوالہ سے وہ ٹکڑا نقل کیا جو اس حدیث کی تفسیر میں یوں تحریر ہے کہ ''ان علوم خمسہ میں سے کسی کے علم کی طمع کسی کو نہ ہو، اور جو کوئی رسول اللہ ﷺ کے واسطے کے بغیر ان میں سے کسی علم کا دعویٰ کرے کاذب ہے (تفصیلات اصل کتاب اور اس جدید تحریر میں دیکھی جاسکتی ہیں)''۔

ہمارا حوالہ غلط تھا تو رئیس صاحب کو صاف صاف اس کی تکذیب کرنی چاہیے تھی، کہ ''اشعۃ اللمعات'' میں یہ عبارت نہیں، ان کو نہیں مل رہی تھی تو ہم سے مدد طلب کرتے ہم پیش کر دیتے۔ لیکن اس صورت میں حق واضح ہوتا، رئیس صاحب کو حق سے غرض نہیں۔ آزادی سے مطلب ہے۔۔ اس لیے کیا یہ اشعت اللمعات کے مختلف مقامات سے وہ عبارتیں نقل کیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک سے علم قیامت کی نفی ہے۔ اور اسی پر یہ زوردار بیان قلم بند کر دیا کہ عبد المنان بلکہ پوری بریلوی برادری مفتری و کذاب ہے۔

اور آخرت کے ... کہ علوم خمسہ بلکہ جمیع

غیوب کا علم رسول اللہ ﷺ کو اللہ کے دینے سے ہے۔(عطائی ہے)اور شیخ فرماتے ہیں کہ قیامت کا علم اللہ پاک نے کسی کو بتایا ہی نہیں۔

حالاں کہ جب صورت حال یہ ہے کہ یہ دونوں ہی بیان شیخ کے ہیں،تو ہم پر الزام قائم کرنے اور شیخ کے موخر الذکر بیان سے استدلال قائم کرنے کے بجائے یہ کہنا چاہیے تھا کہ شیخ کے بیان میں تدافع ہے۔اس لیے ان کا کوئی بیان قابل استدلال اور لائق اعتماد نہیں کہ:**اذا تعارضا تساقطا۔**

لیکن رئیس صاحب نے سیدھا راستہ چھوڑ کر الزام تراشی کی جس کی پوری قلعی ہم کھول چکے ہیں۔اب چند جملے حضرت محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے بیان سے استدلال کرنے کے سلسلہ میں بھی عرض ہیں:

(۱)دعویٰ رئیس صاب کا یہ ہے کہ''آپ کو علم غیب عطا نہیں کیا گیا''دلیل میں حضرت شیخ کی جو عبارت پیش کی ہے،اس میں صرف علم قیامت کی نفی ہے،پس شیخ کی اس عبارت سے آپ کا دعویٰ کیسے ثابت ہوا۔کیا اپنے مربی مولوی عبد الرؤف صاحب کا پڑھایا ہوا سبق بھول گئے کہ''دعویٰ عام ہو تو خاص دلیل سے ثابت نہیں ہوسکتا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رئیس صاحب کو اپنی کمزوری کا احساس تھا۔اسی لیے شیخ کی عبارت میں اپنی طرف سے بشمول علوم خمسہ کا پیوند بھی لگایا ہے۔

(۲)آپ نے شیخ کی جس عبارت سے قیامت کے علم عطائی کی نفی پر استدلال کیا ہے،وہ اس عبارت کے بعد ہے جو ہم نے ص:۴۲،کے حوالہ سے پیش کی ہے اور جس کو آپ نے چپ رہ کو تسلیم کیا ہے۔اس لیے آپ کا یہ استدلال غلط جیسا کہ ہم نے اوپر کہا کہ:**اذا تعارضا تساقطا** چلیے شیخ سے آپ استدلال کیجیے نہ ہم۔شیخ کے علاوہ ائمہ کے جو نصوص ہم نے پیش کیے ہیں،اس کا دام چکایئے۔

(۳)ہم گذشتہ ابحاث میں وضاحت کے ساتھ تحریر کرآئے ہیں کہ:خود علمائے اہل سنت میں قیامت کے وقت کے علم کے بارے میں دونوں قول ہیں۔

(۱)اللہ پاک نے وقت قیامت کا علم کسی کو نہیں بتایا۔بقیہ علوم خمسہ کا علم عطا فرمایا۔

(۲)دیگر علوم خمسہ کے ساتھ ساتھ قیامت کا علم بھی آپ کو عطا کیا گیا۔

پس کیا یہ ممکن بلکہ عین صواب نہیں کہ شیخ محقق بھی انہیں علما میں سے ہوں جو دیگر علوم خمسہ کا علم تو رسول کو مانتے ہیں، اس کو انہوں نے ص:۴۲ والی عبارت میں بیان کیا۔ اور خاص قیامت کا علم نہیں، اس کو بعد والی عبارتوں میں واضح فرمایا۔ اس طرح شیخ کی عبارت کا ظاہری تعارض بھی دفع ہو جاتا ہے۔ اور ذاتی اور عطائی کی تفریق بھی خوب سمجھ میں آجاتی ہے۔

الغرض قصور نہ ہمارا ہے نہ شیخ کا نہ علمائے اسلام کا۔ اصل قصور مولوی رئیس احمد صاحب کی کجی اور نا پختہ علم کا ہے۔ جس نے انہیں ہر میدان میں ٹھوکر کھانے پر مجبور کیا ہے۔ ورنہ علم غیب کے ذاتی اور عطائی ہونے کا مسئلہ طبقۂ علما میں کوئی نزاعی مسئلہ ہے ہی نہیں۔

حضور مخبر صادق ﷺ کے خادم خاص نے فرمایا: ''اللهم أعوذبک من رأس الستين وأمارات الصبيان. ''یا اللہ میں ۶۰ھ اور لونڈوں کی سربراہی سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

گایا ہوا گیت:

اس قسم کے اختلافی مسائل بہت دنوں سے ردوقدح اور بحث ونظر کا موضوع بنے ہوئے ہیں اور طرفین سے بے شمار انسانوں نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے، جس کا ایک افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ حضرات وہابیہ (چاہے دیوبندیہ ہوں چاہے غیر مقلدین) ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ شبہات جن کا بار بار ازالہ کیا جا چکا ہے جب کہیں بحث ہوتی ہے تو بے کسی شرمساری اور جھجک کے از سر نو پھر انہیں شبہات کو بڑے طمطراق سے پیش کرتے ہیں۔ جیسے یہ کوئی مبتکر خیال ہو۔

ہمارے مہربان جناب رئیس صاحب نے بھی علوم خمسہ کی بحث میں جو آیتیں پیش کی ہیں اور ان پر جو کچھ کہا ہے ان میں بیشتر کی حیثیت ''گائے ہوئے گیت'' کے سوا کچھ نہیں، جو باتیں علمائے اہل سنت نے بار بار صاف کر دی ہیں وہ اپنی دھن میں مگن انہیں کے اعادہ در اعادہ میں مصروف ہیں۔ گویا:

ہم کہے جائیں گے حال دل مضطر اپنا اس سے مطلب نہیں احباب سنیں یا نہ سنیں

چناں چہ رئیس صاحب نے چھ آیتوں کو نفی علم غیب کی دلیل اور تردید حاضر وناظر کا ثبوت بنا کر پیش کیا ہے جو حسب ذیل ہیں

(۱) ﴿وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ﴾ [یٰسٓ: س ۳۶۔ت ۶۹]

ہم نے رسول اللہ ﷺ کو شعر نہیں سکھایا اور یہ آپ کے مناسب بھی نہیں۔

لہذا ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ شعر اور ہر وہ علم نہیں جانتے جو آپ کے شایان شان نہیں، جیسے سحر و کہانت و سیمیا وغیرہ۔

(۲) ﴿وَرُسُلاً قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلاً لَّمْ نَقْصُصْهُمْ﴾

[النساء: س ۴۔ت ۱۶۴]

بہت سے گزشتہ رسولوں کا بیان ہم نے آپ پر کیا اور بہت سے رسولوں کا قصہ آپ سے بیان نہ کیا۔

قرآن میں صرف معدود نبیوں کا قصہ بیان ہے، تو یہ بات قطعی طور پر معلوم ہو گئی کہ ہزاروں نبیوں کے حالات آپ کو نہیں بتائے گئے۔

(۳) ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم﴾ [السجدة: س ۳۲۔ت ۱۷]

کوئی جان نہیں جانتی جو اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپائی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آرام و آسائش کے جو سامان و نعمتیں جنت میں چھپا رکھی ہیں ان کا علم کسی کو نہیں، تو یہ بھی رسول اللہ کے معلومات سے خارج ہوئیں۔

(۴) ﴿يَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلاً.

[بنی اسرائیل: ۱۷۔ت ۸۵]﴾

لوگ آپ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں آپ کہہ دیجیے وہ میرے رب کے حکم سے ہے اور جو کچھ تمہیں علم دیا گیا ہے تھوڑا ہے۔

تو روح کا علم بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، اور کوئی حتی کہ رسول اللہ بھی نہیں جانتے۔

(۵) ﴿أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِن بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ﴾

[ابراهیم: س ۱۴۔ت ۹]

کیا تم لوگوں کے پاس ان لوگوں کی کوئی خبر نہ آئی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، قوم نوح و عاد و ثمود ان تینوں قوموں کے بعد ایسی قومیں ہوئیں جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔

(٦) ﴿إِذْ يُرِيكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلاً وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيْراً لَّفَشِلْتُمْ﴾

[الانفال: س ٨۔ ت ۴۳]

یعنی جنگ بدر کے موقع پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو خواب میں کفار کی تعداد کم کر کے دکھائی۔

اس آیت میں بھی آپ کے حاضر وناظر ہونے کی نفی ہے کہ کفار کی تعداد آپ کو کم کر کے دکھائی۔

ان شبہات کا جواب دیا چکا ہے:

اب ہم مذکورہ بالا شبہات کی تاریخ بیان کرتے ہیں:

مولانا احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اول الذکر تین شبہات کو اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''الدولۃ المکیہ'' کے حاشیہ میں ان الفاظ میں نقل کیا۔ اور جواب دیا:

''وههنا شبه أخرىٰ لوهابية الهند وبعض العنود.''

ہندوستانی وہابیوں اور بعض معاندین کے کچھ دوسرے شبہات بھی ہیں۔

چنانچہ اول الذکر شبہ کے جواب میں فرماتے ہیں:

''أولا يعقل من له عقل ،أن المراد الملكه، أي: ماقدرناه أن ينشي شعرًا، وعليه يدل حديث أبي داؤد والطبراني والبيهقي عن ابن عمرو بن العاص رضي الله تعالىٰ عنهما سمعت رسول الله ﷺ يقول: ما أبالي ما أوتيت أن أنا شربت ترياقاً، أو تعلقت تميمة ،أو قلت شعراً من قبل نفسي.''

کیا جس کے پاس عقل ہے وہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ آیت میں علم سے مراد ''ملکہ'' ہے، یعنی ہم نے حضور ﷺ کو شعر بنانے پر قدرت نہ دی (یہ مطلب نہیں کہ حضور شعر جانتے بھی نہیں) اور اس مضمون پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جسے ابوداؤد، طبرانی اور بیہقی نے عبداللہ ابن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ میں (حق ناحق) کسی چیز کی پروہ نہیں کروں گا۔ اگر میں نے تریاق پیا یا گنڈا لٹکایا یا اپنی طرف سے شعر بنایا۔

مطلب یہ ہوا کہ آیت نمبر ا، میں رسول اللہ ﷺ کے شعر جاننے کی نفی نہیں ہے شعر بنانے کی نفی ہے۔

دوسری آیت سے پیدا کیے جانے والے شبہ کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

''وقوله تعالیٰ: ﴿رسلا لم نقصصهم عليك﴾ فهل قال: ولا نقص أبداً.''

اللہ تعالیٰ نے یہی تو فرمایا کہ بہت سے رسولوں کا اب تک آپ سے بیان نہیں کیا، یوں تو نہ کہا کہ آئندہ بھی کبھی بیان نہیں کریں گے۔

مطلب یہ کہ گزشتہ زمانہ میں بیان نہ کرنے کا تذکرہ ہے، لیکن جب آئندہ اس نے اپنے رسول کو ان رسولوں کا بیان بتادیا تو اب اس آیت سے عدم علم پر استدلال کیسے صحیح ہوگا۔

تیسری آیت سے پیدا کیے جانے والے شبہ کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا:

''تعلم النفي في الحال، ولا دلالة على نفيه في الاستقبال، ويكفي لصدق ما أخفىٰ جمال الله الذي يتجلى لهم.''

اس آیت میں بھی فی الحال علم جنت کی نفی کا ذکر ہے، آئندہ کی نفی پر کوئی دلالت نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آیت میں صرف اس نعمت کے علم کی نفی ہے جو چھپا کر رکھی گئی ہے، ان انعامات جنت کی تو نہیں جن کا بیان صاف صاف ہوا اور چھپی ہوئی نعمت دیدار الٰہی ہے۔

اہل سنت و جماعت کے دوسرے بڑے عالم حضرت مولانا نعیم الدین صاحب مرادآبادی (استاذ العلماء) رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب ''الکلمۃ العلیا'' میں پہلے اور دوسرے اور چوتھے شبہ کا جواب دیا۔

چناں چہ شبہ اولیٰ کو حافظ ''واحد نور'' رامپوری کی طرف منسوب کیا اور انہیں کے الفاظ میں اس طرح بیان کیا:

''بھلا جو علم کہ سراسر برے ہیں، ان کی قباحت و برائی شرع شریف میں ثابت ہے، جیسے علم سحر، کہانت اور طلسم کے ساتھ آں حضرت ﷺ کیوں کر متصف ہوسکتے ہیں''۔

حضرت مولانا نے جواب میں ایک طویل بحث فرمائی ہے، جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جس کا خلاصہ تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ کہ آیت مبارکہ میں علم شعر کی نفی نہیں ہے۔ بلکہ شعر گوئی کی نفی ہے۔

جس طرح لوگ کہتے ہیں کہ میں روٹی پکانا نہیں جانتا، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ روٹی کس طرح پکتی ہے۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ روٹی پکانے کی اسکیم تو معلوم ہے، لیکن مجھے روٹی پکانے کی پریکٹس نہیں ہے، اسی طرح آیت مبارکہ میں علم شعر کی نفی نہیں ہے۔ بلکہ شاعری اور پریکٹس کی نفی ہے''۔

دوسری آیت سے پیدا کیے جانے والے شبہ کے جواب میں حضرت مولانا نعیم الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تحریر فرمایا: آیت شریفہ کی مراد یہ ہے کہ ہم نے بواسطہ وحی جلی کے قصد نہیں کیا، یہ علم نہ ہونے کی دلیل نہیں، کیوں کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے بواسطہ وحی خفی کے اس پر مطلع کیا۔ چناں چہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مرقات شرح مشکاۃ میں فرماتے ہیں:

''وعن الإمام أحمد عن أبي أمامة قال أبو ذر: يا رسول الله !كم وفاء عدة الأنبياء؟ قال: مئة ألف وأربعة عشرون ألفًا. الرسل من ذلك ثلاثة مأة وخمسة عشر جماً غفيراً. هذا لا ينافي قوله تعالىٰ: ﴿لقد أرسلنا رسلاً من قبلك منهم من قصصنا عليك ، ومنهم من لم نقصص عليك﴾؛ لأن المنفي هو التفصيل ، والثابت هو الإجمال، أو النفي مقيد بالوحي الجلي ، والثبوت متحقق بالوحي الخفي.'' [مرقاۃ المفاتیح، شرح حدیث جبرئیل: جلد اول ص:۵۸]

حضرت امام احمد نے ابی امامہ سے روایت کی حضرت ابوذر نے کہا یا رسول اللہ ﷺ انبیاء کی تعداد کتنی ہے، آپ نے فرمایا: ایک لاکھ ۲۴ ہزار جن میں تین سو پندرہ رسول ہیں، یہ بہت بڑی تعداد ہے''۔ یہ حدیث قرآن عظیم کی آیت من لم نقصص کے معارض نہیں ہے، اس لیے کہ آیت میں تفصیلی بیان کی نفی ہے، اجمالی بیان کی نفی نہیں ہے۔ یا آیت کا مطلب یہ ہے کہ وحی جلی کے لیے بیان نہیں کیا، مگر وحی خفی کے ذریعہ تمام رسولوں کا بیان ثابت اور متحقق ہے۔

چوتھے شبہ کے بارے میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

سبحان اللہ جانب مخالف کس درجہ عقیل ہیں، بھلا یہ آیت کے کس لفظ کا ترجمہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو روح کا علم نہیں تھا۔ امام محمد غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں:

''ولا تظن أن ذلك لم تكن مكشوفاً له ﷺ ؛لأن من لم يعرف الروح فإنه لم يعرف نفسه، فكيف يعرف الله سبحانه، ولا يبعد أن يكون

مکشوفاً لبعض الأولیاء والعلماء.''

یہ گمان مت کرو کہ یہ رسول اللہ ﷺ کو بھی معلوم نہ تھا، بھلا جو روح کو نہ جانے وہ اپنے نفس کو کیا پہچانے گا۔ تو اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت کیسے ہوگی۔ بعض اولیا اور علما کو بھی اس کا معلوم ہونا خلاف قیاس نہیں۔

پانچویں آیت جس میں یہ ہے کہ قوم نوح وعاد وثمود کے بعد ایسی قومیں گزریں جن کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں'' اسی طرح کی دوسری آیتیں جن میں یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے لشکر (فرشتوں) کو خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا'' یا یہ آیت کہ آسمان وزمین کے غیب کو خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ ان سب کا جواب شروع سے ہی علماے اسلام یہ دیتے رہے ہیں۔ ان آیات میں علم ذاتی کی نفی ہے، علم عطائی کی نہیں، کیوں کہ ان تین قوموں کے بعد ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی قومیں وجود میں آئیں جن کا ذکر قرآن عظیم میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔ پس یہ کون کہہ سکتا ہے کہ خداے پاک بتانا چاہے تب بھی اس کا علم کسی کو نہیں ہوسکتا، اور جب اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا: ﴿وعلمک مالم تکن تعلم﴾ آپ جو کچھ نہیں جانتے تھے ہم نے آپ کو سب بتایا۔ ﴿فلا یظھر علی غیبه أحداً الا من ارتضیٰ من رسول.﴾ اپنے غیب پر اللہ تعالیٰ اپنے پسندیدہ رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے مطلع کرتا ہے تو ہم کو انکار کی کیا گنجائش؟۔

چھٹی آیت میں ایک خاص جزئی واقعہ کا بیان ہے، جو ہمارے دعویٰ غیب کے ہرگز منافی نہیں کہ ہم تدریجاً کے قائل ہیں، جزئیات سے استدلال اجمالی جواب خود ہم نے الشاہد میں اور دیگر تمام علماے امت اپنی تصانیف میں برابر دیتے چلے آرہے ہیں۔ اس لیے یہ چھ نمبر بلاشبہ ''گاے ہوے گیت'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔

علم شعر:

چاہیے تو یہ تھا کہ رئیس صاحب ان مباحث کے سلسلہ میں بات کو کچھ آگے بڑھاتے، مثلاً شعر میں ہی وہ یا تو یہ ثابت کرتے کہ آیت ''وما علمناہ الشعر'' میں لفظ علم سے مراد دانستن ہے ملکہ نہیں ہے۔ یا یہ ثابت کرتے کہ رسول اللہ ﷺ کو شعر کا علم دانستن کے معنی میں بھی نہیں ہے لیکن کیا تو یہ:

''کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: ''ما أنا بشاعر ''میں شاعر نہیں ہوں، فتاویٰ قاضی خاں میں ہے کہ وہ شخص کافر ہے جو آپ کو شعر کا واقف کار کہے''۔

اس سے بڑی سادہ لوحی اور کیا ہوگی کہ دعویٰ تو ہے اس بات کا کہ آں حضرت ﷺ شعر نہیں جانتے اور دلیل دے رہے ہیں کہ شعر نہیں کہتے، بھلا جو سخن فہمی اور سخن سنجی کے فرق کو نہیں سمجھ پاتے اسے تصنیف کی کیا ضرورت ہے؟۔

اول اندیش وآں گہے گفتار ‏ ‏ ‏ ‏ پاے پیش آمدست وپس دیوار

اور یہ بھی آپ کی سخن فہمی ہی ہے کہ آپ نے قاضی خاں کا فتویٰ نقل کر دیا اور ان کی عبارت کا مطلب تک نہیں سمجھے، ان کا مطلب بھی یہی ہے کہ حضور کو شاعر کہنا ان کی توہین اور جو آپ کی توہین کرے دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

.رئیس صاحب کی یہ بے خبری بھی دیکھنے کے لائق ہے کہ جوش تحریر میں اپنے خصم کی دلیل نقل کر گئے، چناں چہ ابو داؤد کے حوالہ سے ایک ایسی حدیث نقل کی جس میں صاف صاف ملکہ شعر گوئی کی نفی ہے، ارشاد نبوی ہے: ''میں اپنی طرف سے شعر کہنے کی استطاعت نہیں رکھتا''، اہل علم خوب جانتے ہیں کہ ملکہ کا دوسرا نام استطاعت ہے، اور ہم بار بار یہی کہہ رہے ہیں کہ قرآن عظیم کی اس آیت میں آپ کے شعر جاننے کی نفی نہیں۔ شعر گوئی اور ملکہ کی نفی ہے۔

رہ گیا اشعار کا علم تو آپ نے اشعار اور شعرا پر برمحل تنقیدیں اور تبصرے فرمائے ہیں، اشعار کی برجستہ اصلاح فرمائی ہے۔ کلام موزوں ومنثور کا فرق بتایا ہے، اور یہ امور علم شعر کے بغیر ناممکن ہیں۔

روایت میں آیا ہے کہ جاہلی شاعر امرأالقیس کے بارے میں آپ نے فرمایا:

((امرؤالقیس صاحب لواء الشعراء الی النار))

(مسند أحمد: ۲/ ۲۲۸)

شعرائے عرب میں سب سے بڑا اور جہنم کی طرف ان کا جھنڈا لے کر چلنے والا امرأ القیس شاعر ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ آج تک امرأالقیس پر اس سے زیادہ صحیح تبصرہ ہو ہی نہیں سکا۔

کسی نے مولا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: آپ کفار قریش کی ہجو کیوں نہیں کرتے،

انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ اجازت دیں تب، لوگوں نے آپ سے عرض کی، آپ نے فرمایا:

"ان علیاً لیس عنده مایراد في ذلك ،ثم قال: ما یمنع القوم الذین نصروا رسول إلیه بسلاحهم أن ینصروه بألسنتهم ،فقال حسان: أنا لها."

علی کے پاس وہ نہیں ہے جو ان سے چاہا جارہا ہے، اس کے بعد آپ نے قوم انصار کو خطاب کر کے فرمایا: جن لوگوں نے رسول خدا کی مدد اپنی تلواروں سے کی وہ اپنی زبانوں سے ان کی مدد کیوں نہیں کرتے تب حضرت حسان ابن ثابت نے کہا میں یہ کروں گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدح وقدح کے مختلف مدارج کا علم تھا اور یہ بھی جانتے تھے کہ کس شاعر میں کس چیز کی کتنی صلاحیت ہے۔

ایک دفعہ حضرت حسان بن ثابت اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ کی ہجو کا فرق بتاتے ہوئے فرمایا:

اور نظم ونثر دونوں کے بارے میں آپ نے فرمایا:

"إن من الشعر لحكمة وإن من البيان لسحرا." (حلیۃ الاولیاء: ۷/ ۲۶۹)

بہت سے اشعار میں حکمت کی باتیں ہوتی ہیں اور کتنے بیان بھی جادو کی تاثیر رکھتے ہیں۔

پوری دنیائے شعر وادب پر اس سے زیادہ جامع اور تعمیری تبصرہ اور کیا ہوسکتا ہے۔

حضرت کعب ابن زبیر نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا جس کا ایک مصرع تھا: "وسیف من سیوف الهند مسلول" آپ نے برمحل تصحیح فرمائی "وسیف من سیوف الله مسلول" شعر سے ذوق رکھنے والا ہر آدمی دیکھ سکتا ہے کہ ایک لفظ کے اس ردوبدل نے اس مصرع کو زمین سے آسمان پر پہونچا دیا۔

ان شہادتوں کی موجودگی میں کس ذی شعور آدمی کا یہ حوصلہ ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سخن فہمی اور علم شعر سے انکار کر سکے، آپ کو تنقیدی بصیرتوں سے بے بہرہ قرار دے؟ لاریب کہ حضور نبی کریم ﷺ کو ان امور میں کمال حاصل تھا۔ رہ گئی سخن سنجی اور شعر گوئی تو بلاشبہ آپ اس سے پاک تھے۔

آیت کی ایک دوسری تفسیر:

امام جلال الدین محلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس طرح نقل فرمائی:

﴿وما علمناه﴾ النبي ﴿الشعر﴾ رد لقولهم إن ما أتى به من القرآن شعر، وما ينبغي يسهل له الشعر، ﴿إن هو﴾ليس الذي أتى به ﴿إلا ذكر﴾ عظة ﴿وقرآن مبين﴾ [جلالین نصف اخیر ص:۳۷۲]

ہم نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو شعر نہیں سکھایا، یہ آیت کافروں کے اس قول کا رد ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو قرآن لائے ہیں وہ تو شعر ہے، شعر بنانا آپ کے لیے آسان نہیں، یہ قرآن تو وعظ اور کھلا ہوا بیان ہے۔

''حينئذ تصير المعنىٰ ليس القرآن بشعر.'' [صاوی ج:۳،ص:۳۲۳]

اس تفسیر کی روشنی میں قرآن کی آیت: ﴿ما علمناه الشعر﴾ کے معنی ہوئے کہ قرآن شعر نہیں۔

اس تفسیر کی روشنی میں ساری بحث ہی ختم ہو جاتی ہے کہ آیت مبارکہ قرآن کے شعر ہونے کا انکار کر رہی ہے نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم شعر جاننے کا۔ مگر رئیس صاحب تو رئیس صاحب ہیں انہیں کسی کی کیا پرواہ۔

عقل ہوتی تو خدا سے نہ لڑائی لیتے ۔۔۔ یہ گھٹائیں اسے منظور بڑھانا تیرا

گزشتہ رسولوں کا علم:

رئیس صاحب کو آیت نمبر ۲ کے سلسلہ میں اگر کچھ بات بڑھانی تھی تو یہ ثابت کرتے کہ آیت شریفہ ﴿رسلا لم نقصصهم عليك﴾ کے نزول کے بعد دیگر رسولوں کا بیان نہ تو وحی جلی کے ذریعہ اترا نہ تو وحی خفی کے ذریعہ جیسا کہ ان کے خصم کا کہنا ہے۔ لیکن کیا تو وہ کیا جس سے ان کی نیک نیتی کا بھرم کھل گیا اور ان کی عربی دانی کا بھی۔

نیت کی صفائی کا مسئلہ تو یہ ہے کہ انہوں نے مشکاۃ کی شرح مرقات جلد اول ص:۵۰ خازن جلد اول ص:۵۱۹، وجلد سادس ص:۸۶، مع معالم، تفسیر کبیر جلد ۷، ص:۲۳۰، سراج منیر جلد ۳، ص:۴۹۸ کا حوالہ دیا اور یہ لکھا کہ:

''ان میں متفقہ طور پر یہ کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سے رسولوں کا تعارف نہیں کرایا گیا، نہ ان کے حالات بتائے گئے، بلکہ بہتوں کا نام تک نہ بتایا گیا جس کا حاصل یہ ہے کہ

اگر کل انبیا کی تعداد آپ کو اجمالی طور پر بتلادی گئی، مگر ان کے اسماء اور حالات نہ بتائے گئے تھے اور آخر میں نتیجہ یہ نکالا۔"

یہ بات قطعی طور پر معلوم ہوگئی کہ ہزاروں نبیوں کے حالات آپ کو نہیں بتائے گئے۔

[ابطال ص:۵۵]

رئیس صاحب نے اپنی اس عبارت میں تین باتیں کہیں:

(۱) بہت سے رسولوں کے تفصیلی حالات آپ کو نہیں بتائے گئے اگر چہ سب کی تعداد بتادی گئی۔

(۲) یہ بات مذکورہ بالا محدثین اور مفسرین نے متفقہ طور پر کہی ہے۔

(۳) نہ صرف چند مفسرین ومحدثین نے کہا بلکہ یہ بات قطعی (یقینی) ہے۔

سوال یہ ہے کہ کسی بات کے قطعی اور یقینی ہونے کیے لیے خبر متواتر کی ضرورت ہوتی ہے، اور رئیس صاحب اپنے دعویٰ کے ثبوت میں خبر متواتر تو کیا لاتے صحاح ستہ کی بھی کوئی حدیث پیش نہ کر سکے، صرف تفسیری اور کمتر درجے کی کتب احادیث کا حوالہ دیا وہ بھی صرف صفحہ نمبر کا۔ کیا انہیں روایتوں سے قطعیت ثابت ہوتی ہے؟ ہم مولوی رئیس احمد صاحب کے پورے طائفے کو اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ چیلنج سنا چکے ہیں۔ تھوڑی ترمیم کے ساتھ دہراتے ہیں:

"تمام نجدیہ دہلوی وگنگوہی جنگلی وکوہی، سب کو دعوت عام ہے۔ اجمعوا شرکائکم چھوٹے بڑے سب اکٹھے ہو کر ایک حدیث متواتر یقینی الافادہ چھانٹ لائیں جس سے صاف صریح طور پر یہ ثابت ہو کہ تمام نزول قرآن کے بعد کسی رسول کا حال حضور ﷺ پر مخفی رہا۔"

[انباء المصطفیٰ]

اور محدثین ومفسرین کے متفقہ طور پر کہنے کا حال یہ ہے کہ، انہیں محدثین میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں جن کی مرقات، ص:۵ کا حوالہ ہے، عبارت رئیس صاحب نے نقل نہیں کی ہم پیش کرتے ہیں:

"وعن الامام أحمد عن أبی أمامة قال ابو ذر: یا رسول الله! کم وفاء عدة الأنبیاء، قال: مأة ألف وأربعة عشرون ألفاً. الرسل من ذلک ثلاث مأة وخمسة عشر جما غفیراً. وهذا لا ینافي قوله تعالیٰ: ﴿لقد أرسلنا رسلا من

قبلک منهم من قصصنا علیک ومنهم من لم نقصص علیک﴾؛ لأن المنفي هو التفصيل والثالث هو الاجمال، أو النفي مقيد بالوحي الجلي والثبوت متحقق بالوحي الخفي." (مرقاۃ المفاتیح: حدیث جبرئیل، ۱/۵۸)

حضرت امام احمد حضرت ابو امامہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ انبیا علیہم السلام کی پوری تعداد کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار جن میں رسول تین سو پندرہ ہیں، بڑی تعداد ہے، ملا علی قاری کہتے ہیں کہ اس حدیث میں اس سورہ مومن کی آیت میں کوئی تعارض نہیں، اس حدیث میں اجمالی بیان ہے، اور آیت میں تفصیل کی نفی ہے، یا یہ تطبیق ہوسکتی ہے کہ جہاں بیان نفی ہے وہاں وحی جلی کے ذریعہ اور جہاں بیان ہے وہاں خفی کے واسطے سے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں دو توجیہیں بیان فرمائی ہیں:

(۱) وحی کو عام رکھا جائے، جو جلی اور خفی دونوں کو شامل ہو تو بیان میں تاویل کرنی ہوگی۔ کہ جہاں بیان ہے وہاں اجمالی اور جہاں نفی ہے وہاں بیان تفصیلی مراد ہے۔

(۲) بیان کو عام رکھا جائے جو اجمالی اور تفصیلی دونوں کو شامل ہو تو وحی میں تاویل کرنی ہوگی، جہاں بیان ہے وہاں وحی خفی مراد لی جائے اور جہاں نفی ہے وہاں وحی جلی مراد لی جائے۔

تو ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تو یہ فرما رہے ہیں کہ قرآن عظیم کی آیت مبارکہ کہ ﴿رسلا لم نقصصهم﴾ کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ:

(۱) کچھ رسولوں کی تفصیل آپ کو بتائی نہیں گئی۔ نہ قرآن کے ذریعہ نہ دیگر ذرائع سے، البتہ اجمال بتایا گیا اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ:

(۲) بہت رسولوں کی تفصیل قرآن کے ذریعہ نہیں بتائی گئی، لیکن دوسرے ذرائع سے ضرور بتائی گئی۔ (قرآن کو وحی جلی یا وحی متلو کہتے ہیں اور دیگر ذرائع کو وحی خفی یا وحی غیر متلو کہتے ہیں)۔

لیکن رئیس صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ ملا علی قاری نے صرف یہ فرمایا کہ آپ کو بہت سے رسولوں کے تفصیلی حالات معلوم کرائے ہی نہیں گئے۔ رئیس صاحب کی یہ حرکت دیانت داری کے کس خانہ میں آتی ہے، اس کا فیصلہ ہم ناظرین پر چھوڑتے ہیں۔

شاید اسی لیے صفحہ نمبر کے حوالہ پر اکتفا کیا گیا کہ پوری عبارت نقل کردیں گے، تو جس بات کو محولہ مفسرین اور محدثین کا متفقہ بیان کہا ہے، اس کا بھرم کھل جائے گا۔

غالب نے کہا:

بھرم کھل جائے ظالم تیری قیامت کی درازی کا — اگر اس طرہ پر پیچ وخم کا تیر خم نکلے

ہمیں افسوس ہے کہ رئیس صاحب کی دراز قیامت دیانت داری کا بھرم کھولنے کے لیے ہم کو ان کی تحریر کی زلفوں کے پیچ کھولنے پڑے۔

دوسرے دو شاہد عدل امام خازن اور امام بغوی کو قرار دیا تھا، ان دونوں بزرگوں کی عبارتیں بھی ہم نقل کرتے ہیں اور فیصلہ ناظرین پر ہی چھوڑتے ہیں:

”قوله: ﴿رسلا قد قصصنا هم عليك من قبل.﴾ لما نزلت هذه الآية المتقدمة قالت اليهود: وما لموسىٰ لم يذكر، فأنزل الله هذه الآية، ففيها ذكر موسىٰ عليه السلام، والمعنى وأوحينا إلى رسل قد قصصنا هم عليك من قبل، يعني سمينا هم في القرآن وعرفناك أخبار هم، وإلى من بعثوا وما ورد عليهم من قومهم ﴿ورسلا لم نقصصهم عليك﴾ أي: لم نسمهم لك ولم نعرفك أخبارهم، قال أهل المعاني: الذين نوه الله بذكرهم من الأنبياء يدل على تفضيلهم على من لم يذكر ولم يسم.“ (تفسیر خازن: النساء: ت۱۶۴ـ۱/۴۴۹)

بہت سے رسولوں کا ہم نے اس سے پہلے بیان کیا، جب اس سے پہلے والی آیت اتری تو یہود بولے موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیوں نہیں ہے، تو یہ آیت اتری جس میں خدا نے موسیٰ علیہ السلام کا ذکر فرمایا، آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے بہت سے رسولوں پر وحی کی اس آیت سے قبل ہم نے قرآن میں ہی ان کا نام ذکر کیا اور حالات بیان کیے، کس قوم کی طرف مبعوث ہوئے اور قوم نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا سب بیان کیا اور بہت سے رسولوں کا نہ نام لیا نہ آپ سے ان کے حالات بیان کیے۔

اہل معانی کہتے ہیں: قرآن میں کچھ پیغمبروں کے ذکر کا اہتمام ان کی فضیلت پر دلالت کرتا ہے ایسے انبیا پر جن کا ذکر نہ ہوا۔

”قوله تعالىٰ: ﴿ورسلا قد قصصنا﴾ أي: كما أوحينا إلى نوح وإلى

الرسل، ﴿رسلا﴾ نصب بنزع حرف الصفة، وقيل: معناه وقصصنا عليك رسلا، وفي قرأة أبي (ورسل قد قصصنا هم عليك من قبل) ﴿ورسلا لم نقصص هم عليك﴾ (تفسير بغوی: سورة النساء: ت ۱۶۴.۱/۳۹۹)

اللہ تعالیٰ کا فرمان اور بہت سے رسول جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، یعنی جیسے ہم نے نوح علیہ السلام اور دوسرے رسول کی طرف وحی کی، رسلاً، یہاں زبر حرف صفۃ (ک) کے حذف کر دینے سے ہے۔ اور کچھ لوگوں نے کہا کہ رسلاً قصصنا کا مفعول ہے، اور حضرت ابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرأت میں رسل کو زیر ہے. الآیۃ۔

﴿ولقد أرسلنا رسلا من قبلك منهم من قصصنا عليك ومنهم من لم نقصص عليك﴾ أي: ولم نذكر لك حال الباقين منهم وليس منهم أحداً إلا أعطاه الله تعالىٰ آيات ومعجزات۔" (تفسیر خازن: سورۂ غافر ۷۸ ۴/۸۰)

تحقیق کہ ہم نے اس سے پہلے بہت سے رسول بھیجے جن میں بعض کا ذکر آپ سے بیان کیا اور بہتوں کا تذکرہ آپ پر نہ اتارا، یعنی باقی رسولوں کا حال آپ سے ذکر نہ کیا۔ اور ان میں سبھی کو اللہ نے آیات اور معجزات دیے۔

﴿ولقد أرسلنا رسلا من قبلك منهم من قصصنا عليك﴾ خبرهم في القرآن۔" (معالم التنزیل: سورۂ غافر ۷۸ ۴/۹۳)

اور تحقیق کہ بہت سے رسولوں کو آپ سے پہلے بھیجا. ان میں سے بہتوں کا واقعہ ان پر قرآن میں بیان کیا۔

ہم نے دونوں آیتوں کی پوری تفصیل دونوں تفسیروں سے نقل کر دی تاکہ کسی کو نقل عبارت میں کسی کوتاہی کا کوئی شبہ نہ ہو، ہر چہار عبارت میں اجمال و تفصیل کا کوئی اشارہ تک نہیں، البتہ اس بات کی تصریح ہے کہ بہتوں کا نام اور ذکر قرآن میں نہیں اور بہتوں کا ہے۔ لفظ قرآن کی تخصیص اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ وحی قرآنی کے علاوہ دیگر ذرائع سے علم و اطلاع ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، تو یہ تو وہی ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی بات ہوئی جس کو اوپر ہم نے نمبر سے بیان کیا ہے اور اس کو اجمال اور تفصیل سے کیا تعلق؟۔

پس رئیس صاحب کا ان دونوں بزرگوں کو اجمال و تفصیل کے متفقہ گواہوں میں شمار کرنا

رئیس صاحب کی دیانت داری نمبر۲ ہوئی افسوس ۔

منصفی دنیا سے ساری اٹھ گئی ۔ اے بتو ایمان داری اٹھ گئی

رئیس صاحب کے متفقہ گواہوں میں ایک حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں، لیکن انہوں نے ﴿رسلاً لم نقصص﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے دس حدیثیں ذکر کیں، جس میں انبیاو رسل کی پوری تعداد اور بہت سے رسولوں کے بہت سے واقعات کا بیان ہے، اس طرح انہوں نے اس بات کی تشریح کردی ہے کہ بیان نہ کرنے کا مطلب ہے، قرآن میں بیان نہ کرنا۔ ورنہ احادیث میں تو انبیاء ورسل کے سلسلہ میں بڑا تفصیلی تذکرہ ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ قرآن کے ذریعہ تو ان رسولوں کا ذکر اللہ نے نہیں کیا مگر دیگر ذرائع (وحی خفی) کے ذریعہ تو ان کا بیان ثابت ہے تبھی تو ان کا ذکر ہم تک بھی پہونچا۔

پس رئیس صاحب کا ان کو بھی اجمالی اور تفصیلی توجیہ کرنے والوں کی صف میں شمار کرنا کتنی بڑی دیانت داری ہے؟ جس کو ہم ان کی دیانت داری نمبر۳ شمار کرتے ہیں:

ہوا ہے مدعی کا فیصلہ الٹا میرے حق میں ۔ کیا ہے چاک خود یوسف کا پیراہن زلیخا نے

یہاں تک رئیس صاحب کے دیانت داری کے بھرم کھلنے کی بات تھی، اب عربی دانی کا حال بھی ملاحظہ ہو، آپ نے آیت سورہ نساء، اور آیت سورہ مومن دونوں لکھ کر دونوں کا مطلب بتایا:

"ان دونوں آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے آپ سے پہلے بہت سے رسولوں کو بھیجا جن میں سے بعض کے تفصیلی حالات ہم نے آپ سے بیان کیے، اور بہتوں کے نہیں۔"

[ابطال ص:۵۴]

حالانکہ آیت سورہ نساء کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ "ہم نے آپ سے پہلے بہت رسولوں کو بھیجا" اس کا مطلب تو یہ ہے کہ "اس آیت کے نزول سے پہلے ہم نے بہت سے رسولوں کا حال بیان کیا" چنانچہ تفسیر ابن کثیر، ص:۵۱۵ میں ہے:

"﴿رسلا قد قصصنا عليک من قبل﴾ أي: من قبل هذه الآية، يعني في سورة المكية وغيرها، ﴿ورسلاً لم نقصص﴾ أي: خلقا أخرين لم نقصص بعد في القرآن."

[تفسیر ابن کثیر، ۱/۷۶۷]

کتنے رسولوں کا قصہ ہم نے آپ سے قبل بیان کیا یعنی اس آیت سے قبل بیان کیا، مکی اور غیر مکی سورتوں میں، اور بہت سے رسولوں کا حال قرآن میں اب تک بیان نہیں کیا۔

شاید رئیس صاحب کی ''نحو'' کچھ کمزور ہے، اس لیے یہ سمجھ نہیں پائے کہ آیت میں لفظ ''من قبل، رسلا'' کے متعلق نہیں ''قصصنا'' کے متعلق ہے۔

اس میں بھی ہمارے خیال میں رئیس صاحب کا قصور کم ہے، ان کے امام الطائفہ مولوی اسماعیل صاحب دہلوی کہہ گئے ہیں کہ ''قرآن سمجھنے کے لیے کچھ زیادہ علم کی ضرورت نہیں'' اور رئیس صاحب اسی حکم پر مضبوطی سے کاربند ہیں۔

جنت کی بہاریں:

تیسری آیت کے سلسلہ میں علمائے اہل سنت کا جواب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے کہ: کوئی جان اللہ تعالیٰ کی پوشیدہ نعمت کو جو جنت میں ملے گی جانتی نہیں، یہ تو نہیں فرمایا کہ آئندہ جانے گی نہیں، اس لیے اس آیت سے مطلقاً علم کی نفی پر استدلال صحیح نہیں۔ دوسرا جواب یہ تھا کہ جو چیز چھپا رکھی گئی ہے، اور جس کو کوئی نہیں جانتا وہ دیدار الٰہی ہے۔ دیگر انعامات بہشت کا ذکر ہوا ہے اور بقدر علم ہر شخص جانتا ہے۔

رئیس صاحب کی ذمہ داری یہ تھی کہ ثابت کرتے کہ فلاں فلاں نعمتوں کا بیان حضور ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے تک ہوا ہی نہیں، اور یہ ثابت کرتے کہ چھپی ہوئی نعمت صرف دیدار الٰہی نہیں ہے، اور فلاں فلاں نعمتیں ہیں جو مخفی ہیں تو بات بڑھتی۔

لیکن یہ بات رئیس صاحب کے بس میں کہاں تھی، اس لیے آیت مبارکہ ولا تعلم نفس لکھ کر اپنے پیش رو ہم مذہب علما کی بات دہرا دی کہ ''معلوم ہوا کہ جنت کی جو نعمتیں چھپا رکھی گئیں ان کا علم رسول اللہ کو بھی نہیں''۔

لیکن اس کی تائید میں روایتیں جو پیش کیں وہ علمائے اہل سنت کے مسلک کی حمایت کرتی ہیں، چناں چہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی دو تفسیر معالم اور خازن سے، ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول فتح الباری سے، حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ابن کثیر کے حوالے سے، اور اسی سے حضور ﷺ اور تفسیر ابوسعود سے خود ان کا قول نقل کیا اور ان کا مطلب خود بھی یہی

بتایا کہ "جنت کی پوشیدہ نعمتوں کو نہ کوئی فرشتہ جانتا ہے نہ مقرب رسول"۔

ناظرین غور فرمائیں، ان روایتوں سے اہل سنت و جماعت کے مسلک کو کیا نقصان، سارے حوالے صرف چھپی ہوئی نعمت کے سلسلہ میں ہیں، وہ تو خود ہی اقرار کرتے ہیں، بلاشبہ جنت کی وہ پوشیدہ دولت دیدار الٰہی ہے، اور اس کی کیفیت کسی کو نہیں معلوم، اور آیت مبارکہ میں "ما أخفي لهم" کہہ کر اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ علم چوں کہ ذات وصفات الٰہی سے متعلق ہے، اس لیے نہ ماکان ہے نہ مایکون، کیوں کہ وہ الآن كما كان ہے۔

بچارے رئیس صاحب اور ان کے خواجہ تاش جو بخاری اور مسلم سے نیچے اترتے ہی نہیں اپنی بات کی پچ رکھنے کے لیے کہاں کہاں مارے مارے پھرے، حد یہ ہے کہ تفسیر ابو سعود رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے بھی مدد مانگی، مگر ساری محنت رائیگاں گئی۔ اور بات وہ ثابت ہوئی جو ان کے مقابل کی تائید کرے۔

لیکن ان روایتوں کے نقل کرنے کے بعد رئیس صاحب کو کچھ نشہ سوار ہوا۔ اور آپ نے بریلوی مولویوں پر تبرا بکنا شروع کیا فرماتے ہیں:

"یعنی ان نعمتوں کو کوئی فرشتہ اور برگزیدہ رسول بھی نہیں جانتا چہ جائے کہ بریلوی ملا جو دعویٰ کرتے ہیں، رسول پر افترا کر کے کہ ہم بھی جنت کی نعمتوں کا علم رکھتے ہیں۔"

[ابطال ص:۵۷]

رئیس صاحب! بریلوی ملا بچاروں کا کیا قصور، یہ سبق تو خود قرآن و حدیث کا ہے، جس کو آپ بھی جانتے ہیں۔ مگر عداوت مصطفیٰ ﷺ میں قصداً بھلا رکھا ہے، صرف قرآن میں جنت کی جن نعمتوں کا بیان ہوا ہے، ان کا ایک شمہ ذکر آپ بھی سنیئے:

جنت کی وسعتوں کا بیان:

﴿عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ﴾ [الحدید: س۵۷۔ت۲۱]

جنت کی وسعتوں میں آسمان و زمین سما جائیں۔

اس کے مختلف درجات کی یہ تفصیل ہے:

﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ [طه: س ۲۰.ت ۷۶]

"جنات عدن" جن کے نیچے نہریں رواں دواں ہیں

﴿ وَهُم مُّكْرَمُونَ (42)فِيْ جَنَّاتِ النَّعِيْمِ ﴾[الصٰفٰت:س۳۷.ت۴۳]

''جنت نعیم'' میں ان کا اعزاز ہوگا۔

﴿لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلاً﴾[الکهف:س۱۸.ت۱۰۷]

''جنت الفردوس'' میں ان کی مہمانی ہوگی۔

﴿ أَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ﴾[الفرقان:س۲۵.ت۱۵]

''جنت الخلد'' کا وعدہ متقیوں سے ہوا ہے۔

جنت کے موسم کے سلسلہ میں ارشاد ہوا:

﴿وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيْراً (12)مُتَّكِئِيْنَ فِيْهَا عَلَى الْأَرَائِكِ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْساً وَلَا زَمْهَرِيْراً﴾[الدهر:س۷۶.ت۱۲]

جنتیوں کے صبر کا بدلہ باغ اور حریر ہیں، یہ لوگ جنت میں تخت پر ٹیک لگائے ہوں گے جس میں نہ دھوپ ہوگی نہ سردی۔

جنت کے مکانوں اور بالا خانوں کا اس طور پر ذکر ہوا:

﴿وَهُمْ فِي الْغُرُفَاتِ آمِنُوْنَ﴾[السباء:س۳۴.ت۳۷]

اور وہ لوگ بالا خانوں میں امن و امان سے رہیں گے۔

﴿أُوْلَئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَسَلَاماً﴾

[الفرقان:س۳۵.ت۷۵]

ان کو جنت کا سب سے اونچا بالا خانہ انعام میں ملے گا، ان کے صبر کا بدلہ وہاں کورنس اور سلام سے ان کی پیشوائی ہوگی۔

ایک جگہ بالا خانہ در بالا خانہ کا ذکر بھی آیا ہے:

﴿لَهُمْ غُرَفٌ مِّن فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ تَجْرِيْ مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾

[الزمر:س۳۹.ت۲۰]

رب سے ڈرنے والوں کے لیے بالا خانوں پر بالا خانے بنے ہوئے ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہیں۔

گھرے سایوں اور پھل دار درختوں کی تفصیل یوں آئی:

﴿هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلَالٍ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَّكِؤُونَ﴾

[یٰسٓ: س ۳۶۔ ت ۵۶]

اہل جنت اور ان کی بیویاں سائے میں تخت پر ٹیک لگائے محو نظارہ ہوں گے۔

﴿إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلَالٍ وَعُيُوْنٍ (41) وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ﴾

[المرسلات: س ۷۷۔ ت ۴۱]

اہل تقویٰ چشموں کے کنارے من چاہے پھلوں اور سایہ دار درخت میں ہوں گے۔

ایک جگہ عجیب دل کش منظر کشی ہے:

﴿وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلاً﴾

[الانسان: س ۷۶۔ ت ۱۴]

ڈالیاں ان پر جھکی ہوں گی، اور پھل مائل بہ سپردگی ہوں گے۔

یہ منظر بھی قابل دید ہے:

﴿وَأَصْحَابُ الْيَمِيْنِ مَا أَصْحَابُ الْيَمِيْنِ (27) فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ (28) وَطَلْحٍ مَّنضُوْدٍ (29) وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ (30) وَمَاءٍ مَّسْكُوْبٍ﴾

[الواقعة: س ۵۶۔ ت ۲۷]

اصحاب یمین کون ہوں گے جو ایسے بیروں کے ہجوم میں ہوں گے جن میں کانٹا نہیں، اور ایسے کیلے جو تہ بہ تہ ہوں گے، اور سائے دراز ہوں گے، نہریں مستقل بہتی ہوئی اور پھل بے شمار۔

جنت کے پھلوں کی طرف ملاحظہ ہو:

﴿فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ﴾ [الرحمٰن: س ۵۵۔ ت ۶۸].

﴿فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ﴾ [الرحمٰن: س ۵۵۔ ت ۵۲]

جنت میں بے شمار پھل اور چھوہارے اور انار ہوں گے۔ اور اس میں ہر نوع کے پھلوں کی دو قسمیں ہوں گی۔

﴿فَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ﴾ [المرسلات: س ۵۶۔ ت ۴۲]

جنت میں ہر ایک کے پسندیدہ پھل ہوں گے۔

﴿وَفَاكِهَةٍ مِمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ﴾[الواقعة:س ۵۶.ت ۲۰]

اور پھل جنہیں ہر کوئی پسند کرے۔

ایک جگہ یہ کہہ کر سارے ہی قابل لحاظ پھلوں کا ذکر کیا گیا:

﴿وَلَهُمْ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِم﴾

[محمد:س ۴۷.ت ۱۵]

اوران کے لیے سبھی انواع واقسام کے پھل ہوں گے،اور سب سے بڑھ کران کے رب کی مغفرت کا ساتھ ہوگا۔

﴿يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْن﴾[الدخان:س ۴۴.ت ۵۵]

اوراس میں امن وچین کے ساتھ سارے ہی پھلوں کے لیے بلائے جائیں گے۔

گوشت کے ذکر میں فرمایا گیا:

﴿وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ﴾[الواقعة:س ۵۶.ت ۲۱]

اور جیسے پرندوں کا گوشت وہ پسند کریں۔

اور نہروں کا تو اتنی بار اور اتنے دلکش انداز میں ذکر ہوا ہے کہ روح جھوم اٹھتی ہے، صرف ایک مقام سے آیات قرآنی کا ایک حصہ پیش کیا جاتا ہے:

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاء غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّارِبِيْنَ وَأَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى﴾

[محمد:س ۴۷.ت ۱۵]

ان جنتیوں کی مثال جن کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے ان میں پانی کی نہریں جو ٹھہراؤ سے خراب نہیں ہوتا،اور دودھ کی نہریں جس کا مزہ نہیں بدلتا،اور شراب کی نہریں پینے والوں کے لیے لذت وسرور کا سرمایہ،اور صاف شفاف شہد کی نہریں۔

جنت کی شراب کی مختلف تفصیلات مذکور ہوئیں:

﴿يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْساً لَّا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ﴾

[طور:س ۵۲.ت ۲۳]

ایک دوسرے سے لیتے وہ جام جس میں نہ بے ہودگی نہ گنہگاری۔

﴿ وَ كَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ (18)لَا يُصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُنزِفُونَ﴾

[الواقعة:س ۵٦.ت ۱۸]

اور جام اور آنکھوں کے سامنے بہتی شراب کہ اس سے نہ دردسر ہو نہ ہوش میں فرق آئے۔

﴿وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْساً كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا﴾

[الانسان:س ۷٦.ت ۱۷]

اور اس میں وہ جام پلائے جائیں گے جس کی آمیزش ادرک ہوگی، اور شراب کی نہریں جن کا نام سلسبیل ہے۔

﴿وَ كَأْساً دِهَاقًا لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْواً وَّلَا كِذَّاباً﴾[النباء:س ۷۸.ت ۵]

اور چھلکتے پیمانے جس میں نہ بے ہودہ گوئی ہو نہ جھٹلانا۔

﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِن كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوراً﴾

[الانسان:س ۷٦.ت ۵]

نیکوں کے لیے ایسے جاموں کا دور ہوگا جس کی تاثیر کافوری ہوگی۔

جنتیوں کے تخت ونشست گاہ، فرش، بستر، ظروف اور پیالوں، لباس اور آرائش کی نہایت مسحور کن تفصیلات مذکور ہیں:

﴿ وَيُطَافُ عَلَيْهِم بِآنِيَةٍ مِّن فِضَّةٍ وَأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا﴾

[الانسان:س ۷٦.ت ۱۵]

شیشوں کی طرح شفاف چاندی کے پیالے اور برتن جنتیوں کے لیے گردش میں لائے جائیں گے، جو نہایت انداز اور قرینے سے ہوں گے۔

﴿عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٍ وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَاباً طَهُوراً﴾ [الانسان:س ۷٦.ت ۲۱]

ان کے جسموں پر سبز کریب اور حریر کے لباس زیب دے رہے ہوں گے، اور ہاتھوں میں چاندی کی زینتیں اور پینے کو ستھری شراب ہوگی۔

﴿عَلَى سُرُرٍ مَّوْضُونَةٍ . مُتَّكِئِينَ عَلَيْهَا مُتَقَابِلِينَ . يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ

مُّخَلَّدُونَ﴾ [الواقعة:س ۵۶.ت ۱۵]

اور جنتیوں کے گروہ در گروہ جڑاؤ تختوں پر ٹیک لگا کے آمنے سامنے ہوں گے، جن کی خدمت کو ہمیشہ نوخیز رہنے والے لڑکے گھوم رہے ہوں گے۔

﴿إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغُلٍ فَاكِهُونَ . هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلَالٍ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَّكِؤُونَ﴾ [یٰسٓ:س ۳۶.ت ۵۵]

بے شک جنت والے آج دل کے بہلاوے میں چین کرتے ہیں وہ اور اُن کی بیویاں سایوں میں تکیہ لگائے ہوئے۔

حوران جنت اور غلمان بہشت جن کے بارے میں کسی آگاہی کا رئیس صاحب کو انکار ہے، قرآن عظیم سے ان کی تفصیلات سنیئے:

﴿فِيهِنَّ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌ﴾

[الرحمٰن:س ۵۵.ت ۴۷]

جنت کے باغوں میں نیچی نگاہ والی اچھوتیاں ہیں جنہیں اس سے قبل نہ آدمیوں نے چھوا نہ جنوں نے۔

﴿كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتَ وَالْمَرْجَانِ. حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ﴾

[الرحمٰن:س ۵۵.ت ۴۷]

اور یہ یاقوت مرجان کی طرح دلکش خیموں میں رہنے والی حوریں ہیں۔

﴿وَعِنْدَهُمْ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ عِينٌ. كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ﴾

[الصٰفّٰت:س ۳۷.ت ۴۸]

جنتیوں کی ہم نشیں نیچی نگاہ والی حوریں ہوں گی جو اپنے شوہروں کے سوا آنکھ نہ اٹھائیں، آہو چشم گویا سینت کر رکھے ہوئے انڈے ہیں۔

﴿إِنَّا أَنشَأْنَاهُنَّ إِنشَاءً . فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَاراً. عُرُباً أَتْرَاباً﴾

[الواقعة:س ۵۶.ت ۳۷]

ہم نے عورتوں کو اچھی اٹھان اٹھایا، تو انہیں کواری اپنے شوہروں کی پیاری پیار دلانے والی کم سن اور نوخیز بنا دیا۔

﴿وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ﴾

[الطور:س ۵۲.ت ۲۴]

اور جنتیوں کے خدمت گزار جیسے حفاظت سے رکھے ہوئے موتی (آب دار شاندار اور طرح دار)۔

جنت کی بہاروں کی یہ مختصر قرآنی تشریح ہے، تمام آیتوں کا استقصا مقصود نہیں۔ اور احادیث مقدسہ میں اس کی تفاصیل کا جو دفتر ہے وہ علاحدہ ہے۔ اگر سب کو جمع کرنا ہو تو غالب کی طرح کہنا پڑے گا:

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے　　　سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے

رئیس صاحب اب تو آپ کا بخار اتر گیا ہوگا، اور علماے بریلی کو آپ نے معاف کر دیا ہوگا۔ کہ جنت کی نعمتوں کے جاننے کا دعویٰ انہوں نے غلط نہیں کیا تھا۔

لیکن کہاں آپ تو ابھی اسی عالم میں ہیں، چناں چہ حور، قصور، غلمان اور شراب طہور سے تمام مخلوق کی بے خبری کے ثبوت کے لیے مزید دو حدیثیں پیش فرمائیں:

ایک روایت میں ہے کہ ”رسول اللہ ﷺ جنت میں تشریف لے گئے جس کے صحن میں ایک لونڈی کو دیکھا، آپ نے پوچھا یہ کس کا گھر ہے؟ کہا گیا حضرت عمر کا۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں: میں عمر کی غیرت کی وجہ سے گھر میں نہیں گیا“ رئیس صاحب فرماتے ہیں:

”معلوم ہوا جنت کی ہر نعمت کیا حضرت عمر کے گھر کے اندر بھی آپ نے نہیں دیکھا“۔

[ابطال، ص:۵۸]

دوسری حدیث غنیۃ الطالبین سے نقل کی کہ ”اگر جنت کی کوئی عورت بھی اپنا جلوہ دکھا دے تو کوئی مقرب فرشتہ اور کوئی مرسل باقی نہ بچے سب کے سب مبتلاے فتنہ ہو جائیں“ پھر بے حد جھٹک کر رئیس صاحب فرماتے ہیں:

”کیا بریلوی لوگ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی نبی حتی کہ ہمارے رسول یا جبرئیل و میکائیل جنت کی حوروں کے دیدار سے مبتلاے فتنہ ہو گئے۔“ [ابطال، ص:۵۸]

مگر میں رئیس صاحب سے نہایت ادب سے عرض کروں گا، صاحب سنبھلیے آپ بالکل بے قابو ہوئے جا رہے ہیں۔ بقول شاعر:

نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ بات ہو رہی تھی علم اور جاننے کی اور آپ حدیثیں پیش کرنے لگے نہ دیکھنے کی، کیا جاننے کے لیے دیکھنا ضروری ہے، بے دیکھے علم نہیں ہوسکتا۔ جنت کی بہاروں کی وہ ساری تفصیل جو اوپر مذکور ہوئی، آپ کو معلوم ہوئی یا نہیں، تو کیا آپ نے سب کو دیکھ لیا؟ اگر یہ تفصیلات بے دیکھے آپ کو معلوم ہوسکتی ہیں، تو حضور ﷺ کے لیے آپ کے یہاں کیا تنگی ہے؟ کہ یہ نہیں دیکھا وہ نہیں دیکھا بالفرض نہ دیکھا پھر بھی اس سے جاننے پر کیا اثر پڑتا ہے؟ آپ اپنی غیر متعلق دلیل واپس لیجیے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ آپ بریلویوں سے کیا پوچھتے ہیں، یہ سوال تو خود آپ کے سر پر سوار ہے کہ جب کسی بھی عورت کو دیکھ کر فرشتہ مقرب اور نبی مرسل فتنہ میں پڑ سکتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے جنت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھر کے صحن میں جنت کی ایک عورت کو کیسے دیکھا؟ یہ حدیث تو خود آپ نے ہی روایت کی ہے، اس لیے بریلویوں سے پہلے آپ کو ہی بولنا پڑے گا۔

ہم نہ کہتے تھے کہ اے ذوق تو زلفوں کو نہ چھیڑ
یہ جو الجھیں گی تو تو خود ہی پریشاں ہوگا

علم روح:

علم روح کے سلسلہ میں بھی علمائے اہل سنت کے اس جواب پر کہ "آیت مبارکہ میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہو، کہ حضور ﷺ کو روح کا علم نہیں تھا" رئیس صاحب کو ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی، لب ہلانے کا یارا نہ ہوا، اور قلم حرکت میں نہ آسکا۔ کیا تو یہ کہ اپنے پیش رؤں کا چبایا ہوا نوالہ دوبارہ چباتے رہے۔ کہ فلاں بزرگ یہ کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو روح کا علم نہیں تھا۔ فلاں امام کا قول ہے کہ روح کو کوئی نہیں جانتا، فلاں شیخ کا مقولہ ہے کہ روح کا علم اللہ کے ساتھ خاص ہے۔ حد یہ ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی مرفوع حدیث بھی تو نہ لکھ سکے، اور اتنا گر گئے کہ اپنے مشرب کے خلاف صوفیہ کرام کے دامن کا بھی سہارا لیا کہ فلاں مشائخ کرام کا بھی یہی مسلک ہے۔ لیکن رئیس صاحب کو اچھی طرح یہ احساس تھا کہ اثبات مدعا کے لیے یہ کافی نہیں ہے۔ اس لیے صاف صاف دروغ بافی پر بھی اتر آئے اور جن

بزرگوں سے رئیس صاحب کے دعویٰ کے خلاف اقوال مروی ہیں ان کو بھی منکرین کی صف میں شمار کرلیا۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

''حافظ ابن حجر و عینی حنفی کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ آپ حقیقت روح سے باخبر نہ تھے''

[ابطال، ص:٦٠]

گزارش یہ ہے کہ حضرت جنید بغدادی اور شہاب الدین سہروردی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اقوال کی تلاش میں آپ نے احیاء العلوم کے حواشی تک کی ورق گردانی کی زحمت اٹھائی، اور اصل کتاب میں امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا یہ قول آپ کو نظر نہیں آیا جسے ہم اس سے پہلے نقل کر آئے ہیں کہ: ''یہ گمان مت کرنا کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی روح کی حقیقت معلوم نہ تھی، بھلا جو روح کو نا جانے وہ اپنے کو کیا پہچانے گا اور اسے اللہ تعالیٰ کی معرفت کیسے ہوگی۔

بولیے کیا فتویٰ ہے آپ کا امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بارے میں، کیا وہ بھی بریلوی ہی تھے۔ اور سنیے محقق علی الاطلاق مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ کیا فرماتے ہیں:

مشہور میان مردم ہمیں قول است کہ مراد بقول وے تعالیٰ: قل الروح من أمر ربي. آنست کہ پروردگار تعالیٰ منفرد است بعلم روح و غیر وے تعالیٰ را بمعرفت حقیقت آں راہ نیست، وحق آنست کہ در آیت دلیلے نیست بر آنکہ حق تعالیٰ مطلع نہ گردانیدہ است حبیب خود را ﷺ بماہیت روح، بلکہ احتمال دارد کہ مطلع گردانیدہ باشد وامر نہ کرد اورا کہ مطلع گردانید ایں قوم را، واشارت میکند بایں معنی قل حق سبحانہ: ﴿وما أوتيتم من العلم الا قليلا﴾. کہ خطاب بہ آں قوم است کہ خطاب بہ رسول کردند یعنی شما قابل آں نیست کہ فہم آن حقیقت کنید ومیگوید بندہ مسکین حققہ اللہ بنور الیقین چگونہ جرأت کند مومن عارف کہ نفی علم بحقیقت روح از سید المرسلین وامام العارفین کند وداده است سبحانہ علم ذات خود وصفات خود واقع کرد برائے او فتح مبین از علم اولیں وآخریں روح انسانی چہ باشد در جنب حقیقت جامعہ او قطرہ ایست از دریا وذرہ ایست از بیضاء.

لوگوں کے درمیان مشہور تو یہی ہے کہ روح کی حقیقت خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ دوسرے کو اس کی آگاہی کی کوئی سبیل نہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ آیت: ﴿قل الروح من

أمر ربي﴾ میں اس بات پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حقیقت روح سے اپنے حبیب کو بھی باخبر نہیں کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿وما أوتيتم من العلم إلا قليلا.﴾ سے تو یہ اشارہ ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو حقیقت روح سے آگاہ کر کے یہ حکم دیا گیا کہ قوم کو اس سے باخبر نہ کریں، کیوں کہ آیت میں رسول اللہ ﷺ سے حقیقت روح دریافت کرنے والوں سے خطاب کیا گیا کہ تم اس حقیقت کی دریافت کے لائق نہیں ہو۔ اور بندہ مسکین (جسے اللہ تعالیٰ نور یقین سے منور کرے) تو یہ کہتا ہے کہ ایک خدا آگاہ آدمی یہ کہنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہے کہ سید المرسلین امام العارفین ﷺ حقیقت روح نہیں جانتے تھے، جب کہ خدا نے انہیں اپنی ذات وصفات کا علم دیا، اور علم اولین وآخرین کا فتح باب فرمایا تو آپ کی حقیقت جامعہ کے پہلو میں علم روح کی کیا حقیقت، جیسے دریا میں ایک قطرہ یا صحراء میں ایک ذرہ۔

[مدارج النبوۃ جلد دوم، ص: ۴۱۴]

کہیے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو کس خانہ میں رکھیے گا، جو رسول اللہ ﷺ کے حقیقت سے آگاہی پر داد تحقیق دے رہے ہیں، اور عارفوں کو للکار رہے ہیں، کوئی عارف بھلا یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو روح کی حقیقت معلوم نہ تھی، آیت مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ کے روح کا علم نہ ہونے سے متعلق ایک لفظ بھی نہیں وغیرہ۔

اور آپ کو ذرہ بھی غیرت نہ آئی کہ امام عینی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو منکرین روح میں شمار کرتے ہوئے۔ سنیے وہ آپ کی دروغ بافی کا پردہ چاک کر رہے ہیں:

”وقد كثر الاختلاف في أمر الروح بين الحكماء والعلماء المفسرين قديماً وحديثاً، وأطلقوا أعنة النظر وخاضوا في غمراته، وقاهر في التيه، فالأكثرون على أن الله تعالىٰ أبهم علم الروح عن الخلق واستاثره لنفسه حتى قالوا: إن النبي ﷺ لم يكن عالما به، قلت: جل منصب النبي ﷺ وهو حبيب الله وسيد خلقه أن يكون غير عالم به بالروح، كيف وقد من الله عليه بقوله: ﴿وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾ وقال أكثر العلماء: وليس في الآية دليل على أن الروح لا يعلم، ولا على أن النبي ﷺ لم يعلمها.“

[عینی جلد ثانی، ص: ۲۱۰]

مسئلہ روح پر حکماء وعلما مفسرین میں بڑا اختلاف ہے، پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے،لوگوں نے روح کے مسئلہ میں غور وفکر کی لگام ڈھیلی چھوڑ رکھی اور اس کی باریکیوں میں خوب غوطے لگائے ہیں۔اور مقام حیرت میں حیران وششدر ہوتے ہیں، بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس علم کو مخلوق سے پوشیدہ رکھا اور اپنی ذات کے لیے خاص فرمایا، حد یہ کہ رسول اللہ ﷺ بھی اسے نہیں جانتے۔

میں کہتا ہوں: رسول اللہ ﷺ کا رتبہ اس بات سے بہت بلند ہے کہ آپ کو روح کا علم نہ ہو۔آپ خدا کے حبیب، مخلوقات کے سردار، تو یہ کیسے ممکن کہ آپ روح کی حقیقت نہ جانیں، اللہ تعالیٰ نے تو آپ کو سب بتا دیا جو آپ نہ جانتے تھے اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا افضل ہے۔

اکثر علما یہی کہتے ہیں کہ آیت سے نہ تو یہ ثابت ہے کہ روح جاننے کی چیز نہیں، نہ یہ ہی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس کا علم نہ تھا۔

اخیر میں ہم امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب ”شفاء الصدور فی احوال الموتی والقبور“ سے ان کا ایک قول فیصل ذکر کرتے ہیں جس سے اس مسئلہ پر پوری پوری روشنی پڑتی ہے:

”اختلف الناس في أمر الروح على فريقين، فرقة أمسكت عن الكلام فيها، لأنها سر من أسرار الله لم يؤت علمها للبشر، وهذه الطريقة هي المختارة. وفرقة تكلفت فيها وبحثت عن حقيقتها. واختلف أهل الطريقة الأولىٰ هل علم النبي ﷺ ،فقال ابن أبي حاتم عن أبي هريرة وقبض النبي ﷺ ولم يعلم الروح، قالت طائفة: بل علمه واطلعه عليها ولم يأمره أن يطلع عليها أمته نظير الخلاف في أمر الساعة.“

لوگ روح کے مسئلہ میں دو گروہ ہو گئے، ایک طبقہ تو روح میں کلام نہیں کرتا کہ یہ اللہ کا بھید ہے، آدمی کو اس کی کچھ خبر نہیں، اور یہ راستہ پسندیدہ ہے۔اور دوسرا فرقہ اس کی حقیقت میں خوب بحث مباحثہ اور غور وفکر کرتا ہے۔پہلے طبقہ کے لوگ پھر دو جماعت ہو گئے (۱) حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ دنیا سے گئے مگر روح کو نہ جان سکے۔(۲) دوسری جماعت کہتی ہے اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو روح کا علم دیا اس پر آگاہ کیا۔ہاں امت کو اس پر مطلع کرنے

سے روکا۔تو یہ ایسا ہی اختلاف ہے جیسے علم قیامت کے بارے میں علما کا خیال ہے کہ بعض کے نزدیک جانتے تھے اور بعض کے نزدیک نہیں۔[ص:۱۳۳]

پس ظاہر ہوا کہ علم قیامت کی طرح علم روح کے سلسلہ میں بھی مولوی رئیس احمد صاحب حقیقت حال سے بے خبر، نادان، اور بھولے ہیں۔یا جان بوجھ کر بھولے ہیں اور اپنے پیش روں کا گایا ہوا گیت دہرا رہے ہیں۔

انوکھے دلائل:

مولوی رئیس صاحب نے اس عنوانات کے تحت کل چھ آیتیں تحریر کی ہیں:

(۱)﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولاً شَاهِداً عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَى فِرْعَوْنَ رَسُولاً﴾ [المزمل:س۷۳.ت۱۵]

ہم نے بھیجا تمہاری طرف رسول جو تم پر شاہد ہیں جیسے ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا۔

(۲)﴿وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللهِ عَلَيْکَ عَظِيماً.﴾ [النساء:س۴۔ت۱۷۹]

آپ جو کچھ نہیں جانتے تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھا دیا اور اللہ تعالیٰ کا آپ پر فضل عظیم ہے۔

(۳)﴿وَمَا كَانَ اللّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللّهَ يَجْتَبِي مِن رُّسُلِهِ مَن يَشَاء﴾ [آل عمران:س۳.ت۱۷۹]

اللہ تعالیٰ تم کو غیب پر خبر نہیں دے گا لیکن اپنے رسولوں میں سے جن کو چاہے چن لیتا ہے۔

(۴)﴿وَمَا كُنتَ تَتْلُو مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِکَ﴾ [العنکبوت:س۲۹.ت۴۸]

اس سے پہلے آپ نہ تو کوئی کتاب پڑھتے تھے نہ اپنے ہاتھ سے اس کو لکھتے تھے۔

(۵)﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى. إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى﴾ [النجم:س۵۳.ت۳]

آپ اپنی خواہش سے نہیں بولتے، وہ تو وحی ہے جو آپ کی طرف بھیجی گئی ہے۔

(۶) ﴿وَمَا كُنتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا إِلَى مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنتَ مِنَ الشَّاهِدِينَ﴾ [القصص: س ۲۸. ت ۴۴]

اے پیغمبر علیہ السلام جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے لیے امر کا فیصلہ کیا تو آپ مغربی جانب موجود نہ تھے۔

اور اس کے بعد یہ نتیجہ مرتب فرمایا:

''ان آیات کی تصریحات کے بالکل برخلاف اور عقیدہ سلف کے بالکل برعکس یہ وہم ہو جانا کہ آپ اپنے پیدا ہونے سے پہلے، بلکہ آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے حاضر و ناظر و عالم الغیب تھے ایک عجیب وہم ہے''۔ [ابطال ص: ۶۵]

اس پر ہماری گزارش یہ ہے کہ یہ دلائل تو کچھ انوکھے نہیں۔ جو کچھ طرفہ گی اور البیلا پن ہے صرف رئیس صاحب میں ہے کہ انہوں نے وہ جرأت کر ڈالی جو آج تک کسی وہابی دیوبندی سے نہیں ہوئی تھی، پہلی تین آیتیں تو رسول اللہ ﷺ کے عظیم و جلیل علم کے وہ روشن دلائل میں جن کو آج تک علماے اہل سنت اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرتے رہے، تو خصم کی دلیل کو اپنے مدعا کی تائید میں پیش کرنا انوکھے پن سے بھی آگے کی چیز ہے۔ ناظرین خود ملاحظہ کریں:

(۱) آپ جو کچھ نہیں جانتے تھے ہم نے سب آپ کو بتا دیا (سورہ نساء)

(۲) اللہ تعالیٰ اپنے خاص غیب پر اپنے رسولوں کو اطلاع بخشتا ہے۔ (آل عمران)

(۳) ہم نے رسول گرامی کو تم پر شاہد بنایا۔ (مزمل)

یہ آیات بینات اہل حق کے موقف کی ایسی واضح دلیلیں ہیں کہ آج تک علماے دیوبند اور کبراے وہابیہ کو ان کا جواب دیتے وقت کلیجہ منہ کو آتا ہے، دم پھولنے لگتا ہے، قلم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے، اور ہاتھ تھر تھرا اٹھتا ہے، اور ان کے جواب سے ماتھوں پر پسینہ آ جاتا ہے، مگر رئیس صاحب نے چٹکی بجاتے ہوئے ان سب دلیلوں پر علم غیب کی مخالفت کا لیبل چسپاں کر دیا۔ اس سے بڑی طرفہ گی اور کیا ہوگی۔

صاحب کو یہی نہیں معلوم کہ ہماری دلیل کیا ہے، اور خصم نے کن دلائل سے استدلال کیا ہے۔ اور آپ کے بڑے کیا کہتے ہیں:

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں   جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اس کے بعد دو آیتیں:

(۱) رسول اللہ نے نزول قرآن سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھی اور کچھ لکھا نہیں۔

(۲) پیغمبر خدا کی ہر بات وحی الٰہی۔

یہ دونوں آیتیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کی مدح وثنا میں اتاریں کہ اے حبیب نزول قرآن سے پہلے آپ نے کوئی کتاب پڑھی نہیں، کچھ لکھا نہیں، کسی کے سامنے زانوے ادب تہ نہیں کیا اور پڑھنے پر آئے تو خدا کی کتاب پڑھنے لگے، عالم کے اسرار بتانے لگے، قوموں کو ان کا نوشتہ تقدیر دکھانے لگے۔

لکھے نہ پڑھے جناب والا شاگردِ رشیدِ حق تعالیٰ

مطلب یہ کہ نہ لکھنا اور نہ پڑھنا ہی آپ کا اعلیٰ درجہ کا کمال ہے، اور اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے کہ ہمارے حبیب کی بات وحی الٰہی ہے، ظن وتخمین اور لوگوں کی طرح قیاس آرائی نہیں۔

لیکن یہ بندہ حرص وہوا، ان مدائح جلیلہ کو رسول اللہ ﷺ کی قدح قرار دے رہا ہے، اور پڑھنے والوں کو یہ تاثر دے رہا ہے کہ نزول قرآن سے پہلے آپ بے علم تھے۔ اور اپنی ہر بات میں آپ وحی کے محتاج تھے، ہم تو کچھ اپنے من سے بھی کہہ دیتے ہیں لیکن رسول اللہ بولنے سے پہلے جبرئیل امین کی راہ تکا کرتے تھے، کہنے والے نے ٹھیک ہی کہا ہے:

ہنر بچشم عداوت بزرگ ترعیب است گل است سعدی و در چشم دشمناں خار است

چھٹی آیت میں یہ ہے کہ طور پر آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ موجود نہ تھے، یہ آیت مولوی عبدالرؤف صاحب نے بھی ''تردید حاضر وناظر'' میں تحریر کی تھی جس کا جواب ہم الشاہد میں پیش کر چکے ہیں کہ آیت میں نفی حضور جسمی کی ہے، حضور کی نہیں، حضور جسمی کا خود ہم بھی انکار کرتے ہیں۔

لیکن ان آیتوں کی تحریر سے رئیس صاحب کا اصل مقصد یہ ضمنی فوائد نہیں، ان کی اصل غرض تو یہ ہے کہ انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ ''اہل سنت وجماعت رسول اللہ ﷺ کو خود ان کی پیدائش بلکہ حضور آدم علیہ السلام کی تخلیق سے بھی پہلے حاضر وناظر اور عالم الغیب مانتے ہیں، اور یہ علم خدا کے بتانے سے نہیں بلکہ از خود وہ عالم کے ذرہ ذرہ کا علم رکھتے ہیں''۔

اور اپنے زعم میں اسی عقیدہ باطلہ کو رد کرنے کے لیے انہوں نے وہ آیات پیش کیں کہ

قرآن تو فرماتا ہے کہ ہر بات ہمارے بتانے سے ہے، تو اے بریلویو تم از خود کا دعویٰ کیوں کرتے ہو؟ قرآن تو کہتا ہے کہ نزول قرآن سے پہلے وہ لکھتے پڑھتے ہی نہیں تھے، تو تخلیق آدم سے پہلے وہ سب کچھ جان کیسے گئے، وغیرہ وغیرہ۔

یہاں کوئی صاحب یہ کہہ سکتے ہیں کہ رئیس صاحب بھلا ایسی بے بنیاد بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟ جب کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جن پر عقیدہ حاضر وناظر کی ایجاد کا الزام ہے، ببانگ دہل اعلان کرتے ہیں، کہ ہم رسول اللہ ﷺ کو عالم ما کان وما یکون اور حاضر وناظر بایں معنی کہتے ہیں کہ ابتداے آفرینش سے دخول جنت ونار تک ہر چیز کا علم حضور ﷺ کو ہے۔ یہ ان کے علم کی ابتدائی اور آخری حدیں ہیں تو آپ کا علم محدود اور متناہی ہوا۔ اور یہ علم رسول اللہ ﷺ کو از خود نہیں، عطاے الٰہی سے ہوا، لہٰذا یہ علم حادث اور عطائی رہا، اور سارا علم آپ کو یک بارگی نہیں ملا، تدریجاً نزول قرآن کی تکمیل تک مکمل ہوا، پس آپ کی پیدائش یا تخلیق آدم علیہ السلام سے پہلے ان سب علوم کے حاصل ہونے کا کوئی سوال نہیں اٹھتا۔

مولانا مولوی عتیق الرحمن صاحب مرحوم ومغفور جو اس سلسلہ میں بحث کی ابتدا کرنے والے ہیں خود انہوں نے اپنی کتاب میں حاضر وناظر کے جو معنی بیان کیے ہیں، اس میں دور دور تک کہیں بھی اس بات کا شائبہ تک نہیں تھا کہ تخلیق آدم علیہ السلام سے پہلے آپ کو سب معلوم ہو چکا تھا۔

خود الشاہد میں جگہ جگہ انہیں مسائل کی تشریح وتوضیح اور تکرار واعادہ ہے، اور ان سب کو چھوڑیے، خود رئیس صاحب، اسی ابطال ص: ۵۰، پر اقرار کرتے ہیں کہ:

"اگر محض بریلویوں کا یہ دعویٰ صحیح بھی ہو کہ آپ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں عالم الغیب بن گئے تھے"۔

پس ان ساری شہادتوں کے باوجود رئیس صاحب اتنا غلط اتنا بڑا الزام علماے اہل سنت کے خلاف کس طرح قائم کر سکتے ہیں؟۔

میں کہوں گا، آپ کا فرمانا سب سچ ہے، لیکن اگر سوچ کر ہی بولنا ہوتا تو اس کے لیے رئیس صاحب کا انتخاب کیوں ہوتا۔ نیز اگر یہ دیکھ کر ہی بولنا ہوتا کہ حریف کیا کہہ رہا ہے یا میں خود کیا کہہ آیا ہوں تو انوکھا پن کیا ہوا۔ انوکھا پن تو یہی ہے کہ رئیس صاحب کو نہ مخالف کی ہی خبر نہ

اپنے ہی آگے پیچھے کا ہوش ہے، عالم بے خودی میں اپنے حریف کے افکار وتصورات کا ایک فرضی ڈھانچہ گڑھ لیتے ہیں، اور اسی کے خلاف دل کے پھپھولے پھوڑنے لگتے ہیں۔ طعن وتشنیع کے تیر برسانے لگتے ہیں۔

ایک حوالہ ص:۶۵ سے ہم نقل کر آئے ہیں جس میں رئیس صاحب نے تخلیق آدم علیہ السلام سے قبل ہی عالم ماکان وما یکون ہونے کا الزام لگایا ہے۔ مزید ص:۶۱ کی عبارت حاضر ہے جو زیادہ واضح اور مفصل ہے:

''اب وہ آیات پیش کی جاتی ہیں جو رسالت پانے سے پہلے بلکہ تخلیق آدم علیہ السلام سے پہلے ہی آپ کے حاضر وناظر ہونے کے امکان کو باطل قرار دیں، کیوں کہ ہم نقل کر آئے ہیں کہ بریلوی لوگ رسول (ﷺ) کو تخلیق آدم کے پہلے کے زمانہ سے ہی حاضر وناظر اور عالم الغیب سمجھتے ہیں''۔ [ابطال:ص ۶۱]

الغرض رئیس صاحب کا یہ انوکھا پن نمبر ۲ ہوا۔ پہلا بھی لاجواب تھا اور یہ دوسرا بھی لاجواب ہی ہے۔

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی

مطلب یہ کہ اس پوری بحث میں رئیس صاحب نے صرف ہوا میں مکہ مارا ہے، ہم اس بات کے قائل ہی نہیں جو ہمارے سر تھوپ رہے ہیں۔

احادیث کے چند دلائل:

مولوی رئیس احمد صاحب نے اس عنوان کے تحت کل سولہ حدیثیں ذکر کی ہیں، اور اس کے لیے انہیں کافی محنت کرنی پڑی ہے۔ تمام کونوں کھدروں کی تلاش کی ہے، اور غیر مقلدیت کے معیار ''بخاری ومسلم'' سے بہت نیچے اترنا پڑا ہے، حد یہ ہے کہ شروح اور تفسیری روایتوں کا سہارا بھی لینا پڑا ہے، مگر حاصل پریشاں دماغی کے علاوہ کچھ نہیں، تفصیل ملاحظہ ہو:

(۱) حدیث کا مضمون یہ ہے ''حضور ﷺ نے شب معراج سدرۃ المنتہیٰ کو ڈھانک لینے والے رنگوں کے بارے میں فرمایا: ان کی حقیقت نہ جان سکا'' اور حدیث نمبر ۱۵ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسما کو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

رئیس صاحب نے ان حدیثوں کے ذکر کرنے کی محنت بے فائدہ اٹھائی، کیوں کہ ان کا

خصم خود اس بات کا قائل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بے شمار علوم ہیں جن کو مخلوقات میں کوئی نہیں جانتا، کیوں کہ وہ نہ ما کان ہیں نہ ما یکون بلکہ وہ الآن کما کان ہیں، اس لیے سدرۃ المنتہی کو ڈھانک لینے والی تجلیوں کی حقیقت اور بعض اسمائے الٰہی کی حقیقت کے علم سے اگر حضور نے لاعلمی ظاہر کی تو اس سے اہل سنت و جماعت کے موقف کو کیا نقصان؟۔

رئیس صاحب کیا آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ مناظرہ میں اپنے خصم کے موقف سے آگاہی ضروری ہے۔

گر ہمیں بے خبری حضرت والا ہوگی　　　　تار و پود پدری سب تہ بالا ہوگی

(۲) حدیث نمبر ۲۵۱ میں علی الترتیب یہ ہے کہ:

''رسول اللہ ﷺ نے سب سے اچھی زمین کے علم سے برأت کی، اور فرمایا: کہ تبع کے ملعون ہونے نہ ہونے، ذوالقرنین کے نبی ہونے نہ ہونے اور حدود کے کفارہ ہونے نہ ہونے کا مجھے علم نہیں''۔

اس پر ہماری گزارش یہ ہے کہ پہلی حدیث شریف میں رئیس صاحب نے صرف یہ ہاتھ کی صفائی دکھائی ہے کہ حدیث مبارک کا وہی ٹکڑا نقل کیا ہے جس میں علم کی نفی ہے۔ اور وہ ٹکڑا جس میں صاف صاف علم کا بیان ہے اس کو الحدیث کے لفظ سے گول کر گئے، تاکہ اردو داں طبقہ یہ سمجھے کہ بھلا جب آپ کو زمین کا علم نہیں تو ما کان و ما یکون کا علم کیا ہوگا؟

تو بر رواج فلک چہ دانی چیست　　چوں نہ دانی دردن خانہ کیست

اور حال یہ ہے کہ پوری حدیث یہ ہے کہ حضور نے پہلے لاعلمی ظاہر کی، پھر آپ پر وحی ہوئی تو آپ نے بتایا: سب سے اچھی جگہ مسجد اور سب سے خراب بازار ہے۔ لیکن پوری حدیث لکھ دیتے تو یہ غلط فہمی کیسے پیدا ہوتی۔

ہاں دوسری حدیث کے بارے میں دبی زبان سے ضرور رئیس صاحب نے اقرار کیا ہے کہ بعد میں آپ کو حدود کے کفارہ ہونے اور تبع کے ملعون کی اطلاع ملی۔ لیکن ذوالقرنین کے بارے میں آپ کی لاعلمی زائل ہوئی نہیں۔ اس بارے میں رئیس صاحب پھر مہر بلب ہیں، شاید اس لیے کہ یہ خاموشی ہی ان کے حق میں فائدہ مند ہے، تو اس سلسلہ میں ہم خود کچھ کہنے کے بجائے صاحب روح المعانی علامہ آلوسی کا بیان نقل کرتے ہیں:

”أخرج ابن عبد الحكم في الفتوح، وابن منذر وابن أبي حاتم وابن الأنباری في المصاحف، وابن أبي حاتم في السنة ،وابن مردوية من طريق أبي الفضل أن ابن الكواه سأل علياً ضى الله تعالىٰ عنه عن ذي القرنين أنبيا كان أم ملكا؟ قال لم يكن نبياً ولا ملكا، ولا كن كان عبداً صالحاً. وإلىٰ أنه ليس بنبي ذهب الجمهور.“ (تفسیر روح المعانی: سورۃ الکھف۔ت ۸۵ ۹/۴۴)

ابن حکیم نے فتوح میں اور ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابن انباری نے مصاحف میں، اور ابن ابی حاتم نے سنت میں، اور ابن مردویہ نے ابوالفضل کے واسطہ سے روایت کی کہ ابن کواہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا۔ذوالقرنین نبی تھے یا فرشتہ؟ آپ نے فرمایا: نہ نبی تھے نہ فرشتہ، وہ تو خدا کے ایک نیک بندے تھے، اور یہی جمہور علماے اسلام کا قول ہے۔

”قال رسول الله ﷺ: ما أدري أتبع؟ الحديث، وأنت تعلم ان هذا النفي لم يكن ليستمر للنبي ﷺ فيمكن أن يكون درى عليه الصلاة والسلام فيما بعد أنه لم يكن نبياً كما يدل عليه ما روى عن علي كرم الله وجهه، فإنه لم يكن يقول ذلك إلا عن سماع ،ويشهد لذلک ما أخرجه ابن مردويه عن سالم ابن أبي الجعد، قال سئل علي رضي الله تعالىٰ عنه عن ذی القرنين، أ نبي هو؟ فقال: سمعت نبيكم ﷺ هو عبد ناصح الله فنصحه.“

(تفسیر روح المعانی: سورۃ الکھف، ت ۸۵ ۹/۴۴)

حضور ﷺ نے تبع اور ذوالقرنین وغیرہ کے بارے میں جو علم کی نفی فرمائی تو یہ نفی دائمی نہیں ہے، تو یہ ممکن ہے کہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دے دی ہو کہ ذوالقرنین نبی نہیں ہیں، اور اس بات پر حضرت علی رسول اللہ سے سنے بغیر اپنے قیاس سے کہہ ہی نہیں سکتے، اور ہماری بات کی تائید حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث سے بھی ہورہی ہے جس کو ابن مردویہ نے ابوالجعد سے روایت کیا، میں نے تمہارے نبی سے سنا ہے فرماتے ہیں: کہ ذوالقرنین ایک بندے تھے، جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی نصیحت چاہی تو خدا نے انہیں نصیحت کی۔

الغرض ان دونوں حدیثوں سے رسول اللہ ﷺ کی ان امور کے متعلق لاعلمی کا ثبوت

فراہم نہیں ہوا بلکہ ان امور کی معرفت اور تعلیم کا پتہ چلا۔ اس طرح ان نو حدیثوں کا حال ہے جن کو رئیس صاحب نے ۴، ۵، ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۶، نمبروں کے ضمن میں تحریر کیا ہے، کہ ان سب حدیثوں سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ان سب امور کا علم ہوا جو ان حدیثوں میں مذکور ہیں۔

پس مولوی رئیس صاحب کی نقل کو ان سولہ حدیثوں میں سے گیارہ تو خود ان کے دعویٰ کی تکذیب کر رہی ہیں اور صاف صاف اعلان کر رہی ہیں کہ متعلقہ امور کا علم رسول اللہ ﷺ کو ہو کر رہا۔ چاہے بعد میں ہی ہوا ہو، چاہے کسی کے بتانے سے ہی ہوا ہو، اور دو حدیثیں مبحث سے ہی الگ ہیں۔ صرف تین حدیثیں ہیں جو اس وضاحت سے خالی ہیں مگر ان کا بھی مطلب ہرگز یہ نہیں، کہ اخیر تک رسول اللہ ﷺ ان سے بے خبر رہے۔ ایسی تمام حدیثوں کے بارے میں علمائے اہل سنت کا یہی موقف ہے کہ ان امور کے علم کی نفی دائمی نہیں۔ جیسا کہ علامہ آلوسی نے ذو القرنین کے سلسلہ میں فرمایا: ''هـذا النفي لم يكن يستمر لرسول الله ﷺ'' یہ نفی دائمی نہیں تھی، یا مولانا احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بعض علم کے بارے میں فرمایا: ''وقوله تعالىٰ: ﴿ومنهم من لم نقصص﴾[غافر: س ۴۰. ت ۷۸] فهل لا نقص أبداً.'' قرآن میں ہے کہ بعض رسولوں کا بیان نہیں کیا، یہ تو نہیں ہے کہ کبھی بیان نہیں کریں گے۔

پس اس قسم کی حدیثوں سے علم غیب رسول کی نفی نہ ہوگی۔ ہاں اگر کوئی حدیث متواتر قطعی الدلالۃ، یقینی الافادہ، جس میں اس کی وضاحت بھی ہو کہ یہ حدیث نزول قرآن کی تکمیل کے بعد کی ہے'' لاؤ تو البتہ آپ کا مدعا ثابت ہوگا۔ یہ سوال آج نصف صدی کے لگ بھگ ہو گئے کہ فضا میں لہرا رہا ہے اور منکرین کی پوری برادری پر سکوت مرگ طاری ہے۔

آج کی نئی پیداوار بے چارے مولوی رئیس صاحب کے حالات سے بے خبر انہیں بزرگوں نے جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا ہے۔ اور یہ مخالف کے موقف سے بے خبر ہوا میں فائرنگ کر رہے ہیں۔ ''اس سے ثابت ہوا کہ آپ کو تخلیق آدم سے پہلے علم غیب نہ تھا'' یہ حدیث بتا رہی ہے کہ آپ ابتدا سے سب کے عالم نہ تھے، بھولے سپاہی کس نے آپ سے کہہ دیا کہ مخالف یہ کہہ رہا ہے کہ آپ ازل میں ہی سب جان گئے تھے، وہ تو شروع سے ہی چیخ رہا ہے حضور

کا علم عطائی ہے، حضور کا علم یوماً فیوماً بڑھا ہے، اور نزول قرآن پر مکمل ہوا ہے۔ رئیس صاحب:

کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

حاضر و ناظر کے دلائل اور رئیس الاحرار صاحب:

اخیر کے کچھ صفحات میں رئیس صاحب نے مثبتین کے دلائل اور تائیدات کے بعض حصول پر لب کشائی کر کے خود ہی دیانت اور علم کی رسوائی کا سامان فراہم کیا ہے تفصیل ملاحظہ ہو:

مہر برلب:

ہم نے اپنی کتاب میں رسول اللہ ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے یا آپ کی وسعت علمی کے ثبوت میں کل دس آیتیں پیش کی تھیں، رئیس صاحب کی پوری کتاب پڑھ جایئے، تین آیتوں کا تو نام ہی نہیں لیا، اور دو آیتوں پر اپنی دلیل ہونے کا لیبل لگا دیا جس کو ہم انوکھی دلیل کے عنوان میں ذکر کر چکے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وہ تین آیتیں جن پر رئیس صاحب "مہر برلب" ہیں اور جو اپنے موضوع پر بالکل واضح ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَاناً لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾

[النحل: س ۱۶. ت ۸۹]

ہم نے آپ پر کتاب اتاری جس میں ہر چیز کا واضح بیان ہے۔

﴿عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَداً . إِلَّا مَنِ ارْتَضَى مِن رَّسُولٍ﴾

[الجن: س ۷۲. ت ۲۶]

اللہ تعالیٰ جملہ غیوب کا جاننے والا ہے۔ تو اپنے غیب پر خاص رسولوں کو ہی مطلع کرتا ہے۔

﴿ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ﴾

[البقرة: س ۲. ت ۲۵۵]

کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا مگر جتنا خدا چاہے۔

ان صاف صریح روشن بیانوں پر رئیس صاحب کی خاموشی بول رہی ہے کہ حق کے آفتاب نے باطل کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے اور کیوں نہ ہو، کہ " جاء الحق وزهق الباطل

ان الباطل کان زھوقا" حق آیا اور باطل مٹ گیا باطل تو مٹنے کے لیے ہی ہے۔

اسی طرح وہ دو آیتیں جن کو رئیس صاحب نے انوکھے دلائل کے عنوان سے اپنی دلیل بنا کر پیش کیا ہے۔ وہ آیتیں بھی پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر غیوب ظاہر فرمائے، کیا صرف اتنا کہہ دینے سے کہ یہ بھی تردید حاضر و ناظر کے "انوکھے دلائل ہیں جواب ہو گیا۔ رئیس صاحب اتنا تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ بعض مواقع پر خاموشی بھی انسان کو اقراری مجرم بنا دیتی ہے۔ آپ کی اس خاموش نے سب پر عیاں کر دیا کہ آپ کے حالات کتنے ناگفتہ بہ ہیں۔

ع خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

سخن گفتن چہ ضرور:

اس لیے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ رئیس صاحب "الشاہد" کے بہت سے دلائل کے جواب سے عاجز و درماندہ ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو کچھ کہا وہ نہ کہنے سے بھی بدتر ہے۔ جیسا کہ تشریحات ذیل سے ظاہر ہے۔

ہماری جانب سے پیش کردہ آیتوں میں قرآن عظیم کے مختلف مقامات کی وہ تین آیتیں بھی تھیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو "شاہد" اور "شہید" کہا گیا ہے، طریقہ استدلال یہ تھا کہ شاہد کے حقیقی معنی حاضر ہیں۔ اگر آیت میں یہی مراد ہوں تو یہی آیت ہمارا عین دعویٰ ہے۔ اور اگر لفظ کے معنی مجازی گواہ لیے جائیں تو گواہی کے لیے مشاہدہ ضروری ہے، اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ساری مخلوق کے گواہ ہیں اس لیے سب کا مشاہدہ ضروری، تو اس معنی پر بھی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حاضر و ناظر ہوئے۔

ہماری اس دلیل کی پہلی شق پر مولوی عبدالرؤف صاحب نے یہ اقرار کیا کہ یہ لفظ متکثر المعنی ہے۔ مولوی رئیس احمد صاحب نے جھنڈے نگری صاحب کی بات پر اتنا اضافہ کیا کہ بیضاوی شریف سے اس لفظ کے پانچوں معانی شمار کرا دیئے (۱) حاضر (۲) مددگار (۳) بادشاہ (۴) گواہ (۵) شہید فی سبیل اللہ۔ اور ہم پر دو الزام قائم کیے (۱) ہم نے بیضاوی کی عبارت میں کتر بیونت کی (۲) اور ہم شاہد کے صرف ایک معنی حاضر و ناظر مانتے ہیں۔ چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:

"اب ناظرین ہی فیصلہ کریں۔ کہ بیضاوی کی عبارت میں بریلویوں نے تحریف کر

کے یہ معنی بتلائے کہ شہید کا معنی صرف حاضر ناظر ہے" (ابطال ص ۹۱)

تجربہ کار اور اناڑی کھلاڑی میں یہی فرق ہوتا ہے، مولوی عبدالرؤف صاحب کہنہ مشق تھے، اس لیے گول مول بول کر رہ گئے، صاف اقرار نہیں کیا کہ اس لفظ کا حاضر و ناظر بھی ایک معنی ہیں، گو مطلب اس گول بات کا بھی ہے، لیکن رئیس صاحب زور تحقیق میں اقرار کر بیٹھے کہ حاضر اس لفظ کے معنی ہیں، اور صرف یہی نہیں یہ بھی اقرار کیا کہ یہ معنی نمبر ایک پر ہے، اور دوسرے معانی کا درجہ دوسرا ہے۔

حرکت مذبوحی:

جس بات کو یہ دونوں ربیب و مربی سراً و عیاناً تسلیم کر رہے ہیں یہی بات ہم نے بھی لکھ دی تھی، کہ اس آیت کے یہی معنی علمائے اسلام نے مراد بھی لیے ہیں، جن میں ایک مانے ہوئے مترجم قرآن امام راغب اصفہانی ہیں، اور دوسرے فاضل بریلوی امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما ہیں، نہ جانے کیوں ہماری یہ بات رئیس صاحب کو اس درجہ لگ گئی، کہ چہرہ بگڑ گیا، زبان ٹیڑھی ہو گئی، اور آپ جامے سے باہر ہو گئے، اور ہم کو بڑی موٹی تازی مذبوحی حرکت کا مرتکب قرار دیا، اور نہ جانے کیا کیا کہہ گئے۔

آخر رئیس صاحب امام احمد رضا کے نام پر کیوں اتنے برہم ہو گئے۔ اور انہیں کے ساتھ ذکر کیے ہوئے امام راغب اصفہانی کو کیوں پی گئے۔ یہ ترجیح بلا مرجح تو غالب کی زبان میں ستم ظریفی کہی جاتی ہے۔

میں نے کہا کہ بزم ناز غیر سے چاہیے تھی ہنس کر ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

دو کے معنی صرف ایک:

اب ہم رئیس صاحب کے ان دونوں الزاموں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ان میں سے موخر الذکر (شاہد کے صرف ایک معنی بتانے کا الزام) کے کذب صریح ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ہماری کتاب "الشاہد" موجود ہے، اس کا صفحہ ۵۳ دیکھ لیا جائے، ہم نے صاف صاف لکھ دیا، کہ "شاہد" اور "شہید" کے وہ معنی جو یہاں مراد لیے جا سکتے ہیں "دو ہیں" ہم کو یہ نہیں معلوم تھا کہ رئیس صاحب کے یہاں دو کا مطلب صرف ایک ہوتا ہے، ہم نہیں جانتے تھے کہ رئیس صاحب اہل زبان کی بولی بھی نہیں سمجھتے ورنہ کوئی اور زبان استعمال کرتے۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
گران کو نہ دے عقل تو دے مجھ کو زبان اور

یہ دو کو ایک بنا دینا رئیس صاحب کے حوصلہ کی ہی بات ہے۔

تنبیہ:

نیز اہل علم وزبان پر یہ امر بھی پوشیدہ نہ ہوگا کہ ہم نے یہ بھی نہیں لکھا ہے کہ شہد وشاہد کے صرف دو معنی ہیں، بلکہ یہ لکھا ہے کہ وہ معنی جو یہاں مراد لیے جا سکتے ہیں دو ہیں۔ اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ معانی اور بھی ہو سکتے ہیں لیکن وہ اس مقام کے مناسب نہیں، مناسب یہ دو معانی ہیں۔ اس لیے ہمارا دعویٰ نہ تو ایک میں حصر کا ہے نہ دو میں، ہمیں کیا پتہ تھا کہ لکھنؤ رہ کر بھی رئیس صاحب کی زبان کا ذائقہ اس قدر خراب ہے۔ حضرت سعدی نے ٹھیک ہی فرمایا ہے:

سگ بدریائے ہفت گانہ بشو　　　چونکہ تر شد پلید تر باشد

تصور الٹا نکل آیا:

رہ گیا دوسرا الزام کہ ہم نے بیضاوی کی عبارت میں کتر بیونت کی ہے، اس کی حقیقت ملاحظہ ہو: جس عبارت کے بارے میں الزام ہے وہ پوری یہ ہے:

”الشهداء جمع شهيد بمعنى الحاضر، أو القائم بالشهادة أو الناصر أو الامام“ وكأنه سمي به؛ لأنه يحضر النوادي، ويلزم بمحضر الأمور“ إذ التركيب للحضور، إما بالذات أو بالتصور، ومنه قيل للمقتول في سبيل الله شهيداً؛ لأنه حضر ما كان يرجوه، أو الملائكة حضروه.“ [بیضاوی، ص:۴۵]

شہدا، شہید کی جمع ہے، اس کے معنی حاضر، گواہ، اور مددگار اور امام کے ہیں۔ ”امام کو شاہد اس لیے کہا گیا کہ وہ دربار میں حاضر ہوتا ہے یا اس کے حضور معاملات طے کیے جاتے ہیں“۔ یہ اس لیے کہ لفظ شاہد کی ترکیب ہی حضور کے لیے ہے، چاہے خود حاضر ہو چاہے تصور کا حضور ہو، شہید فی سبیل اللہ کو بھی اسی لیے شہید کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی مراد پر حاضر ہوا، یا اس لیے کہ خدا کے فرشتے شہادت کے بعد اس کے پاس حاضر ہوتے ہیں۔

ہم کو صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ شاہد کے معنی حقیقی حاضر ہیں۔ اس لیے پوری عبارت میں سے ہم نے صرف وہی حصہ نقل کیا جس پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے، اور جس کی اثبات مدعیٰ کے

لیے ضرورت تھی۔ زائد معانی کے لیے ہم نے نفیاً یا اثباتاً کوئی دعویٰ ہی نہیں کیا تھا تو زائد عبارت کو ہم کیوں نقل کرتے۔ غیر متعلق عبارت کو نقل نہ کرنا ہرگز ''کتر بیونت'' نہیں ہے، اور یہی ''کتر بیونت'' ہے تو رئیس صاحب کی اس حرکت کا کیا نام ہوگا، کہ یہ دعویٰ کرنے کے بعد بھی کہ ہم پوری عبارت نقل کرتے ہیں بیچ میں سے یہ پورے دو جملے اڑا دیے۔ ''کأنه سمي به لأنه يحضر النوادي، أو يلزم بمحضره الأمور.''

داغ داغ:

رئیس صاحب آپ نے ادھوری عبارت کو پوری کہا، یہ جھوٹ ہوا، بیچ میں سے عبارت کے دو جملے چھپالیے یہ چوری ہوئی، خود ''کتر بیونت'' کی اور ہم پر الزام لگایا یہ افترا پردازی ہوئی، ذرا بھی ڈر نہ ہوا کہ کوئی شخص بیضاوی سے آپ کی نقل کردہ عبارت کا تقابل بھی کرسکتا ہے، یہ وقاحت ہوئی، خود ہی ظلم و تعدی کی اور ہمارے خلاف ناظرین کو دہائی دی یہ ظلم ہوا۔ آپ اپنے دعویٰ کو کہاں چھپائیں گے؟

بتاؤ یار و بروز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

شہادت کے حقیقی معنی حاضر ہیں:

اور ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ نے یہ حرکت کیوں کی، اگر وہ ہضم کی ہوئی عبارت بھی ظاہر کردیتے تو لوگ جان جاتے کہ شاہد کے حقیقی معنی حاضر ہی ہیں، کیوں کہ امام بیضاوی اس عبارت میں امام کے معنی مجازی ہونے کی دلیل دے رہے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ چوں کہ لفظ شاہد کی وضع ہی حضور کے لیے ہے۔ اسی وجہ سے امام کو شاہد کہتے ہیں، کہ وہ قوم کی مجالس میں حاضر رہتا ہے، یا اس لیے کہ اسی کے سامنے معاملات طے کیے جاتے ہیں، اور اسی لیے شہید فی سبیل اللہ کو بھی شہید کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی مراد پر حاضر ہوا۔ یا اس لیے کہ شہید کے بعد فرشتے اس کے پاس حاضر ہوے، قاضی زادہ اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

کہ مددگار کو بھی اسی لیے شاہد کہا جاتا ہے کہ تمام امور اسی کی موجودگی میں اسی کی مدد سے حاصل ہوتے ہیں۔ عبارت ان کی یہ ہے:

”والظاهر أن الناظر أيضاً يسمى شهيداً لذلك ؛فإن تمام الأمور تحصل بحضوره.“ [حاشیہ،ص:۱۹۵]

پس ان دونوں عبارتوں سے ثابت ہوا کہ شہود کے حقیقی معنی حضور کے ہیں۔اور دوسرے مجازی معانی پر جو اس کا اطلاق ہوتا ہے تو اسی لیے کہ ان سب معانی میں بھی کسی نہ کسی طرح کا حضور پایا جاتا ہے۔

معنی حقیقی کی نفی کے لیے رئیس صاحب کی جدو جہد:

یہاں تک پہونچ کر رئیس صاحب کو یہ احساس ہوا کہ اب بحث کا وہ موڑ آ گیا ہے کہ مخالفین سے حاضر و ناظر کا ثبوت مانگنے کے بجائے خود مجھے ہی صفائی دینے کی ضرورت ہے، کہ جب شاہد کے حقیقی معنی حاضر و ناظر ہیں تو کیوں نہ وہی معنی مراد لیے جائیں،اس سے پھیر کر مجازی معنی مراد لینے کا کیا جواز ہے؟ تو اس مضمون پر خامہ فرسائی کی،وہ لکھتے ہیں:

”ہم کہتے ہیں کہ بریلویوں کا اگر دعویٰ صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ”شہید وشاہد“ کہا گیا ہے اس لیے حاضر و ناظر ہو گئے،تو یہ ماننا بھی لازم ہوگا کہ جس دن بھی قرآن نے آپ کو شاہد وشہید کہا اسی دن سے آپ ”حاضر و ناظر“ ہو گئے۔اور تمام علوم،احکام،اور تخلیق آدم سے وقوع قیامت تک تمام امور سے باخبر ہو گئے۔کوئی چیز آپ پر مخفی نہ رہ گئی،لیکن بہت سی آیات میں اور احادیث میں بار بار علم غیب کی نفی ہے اور احکام شریعت لے کر بار بار جبرئیل کا آنا،منافقین مدینہ کے بارے میں آپ کو علم نہ ہونا،اور علوم خمسہ وغیرہ سے آپ کی بے خبری ظاہر و باہر ہے،تو آپ سب سے باخبر کیسے تھے؟ جن آیتوں کے معنی بریلوی لوگ حاضر و ناظر بتاتے ہیں ان کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ کوئی ستم ظریف کہے، کہ سرخ رو کے معنی غصہ ور ہے،کیوں کہ اس لفظ کے معنی لال چہرے والا،اور غصہ میں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے،حالاں کہ اردو داں طبقہ کے نزدیک سرخ رو کے معنی کامیاب اور معزز ہیں۔ہندوستان کے غیر عربی داں عوام میں بہت سے لوگ بریلویوں کے اس دام تزویز میں پھنس گئے ملخصاً“ [ابطال،ص:۷۔ص:۷۶۔۷۷]

غالب نے کہا ہے:

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

سوہم دیکھ رہے ہیں کہ رئیس صاحب کی ہر تعمیری کوشش بھی ان کی تخریب کا سامان بنتی جارہی ہے جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے، مولوی عبدالرؤف صاحب اپنی کہنہ مشقی کے سبب اس موضوع پر اپنے موقف کی کمزوری سے آگاہ تھے، اس لیے ایک گول لفظ متکثر المعنی کہہ کر خاموش ہو گئے۔ اور بقول کسے ایک چپ میں سو بلا ٹالی'' لیکن رئیس صاحب نے تہور سے کام لے کر متکثر المعنی ہونے کی سند بھی پیش کر دی، جس کے نتیجہ میں مختلف جرائم کے ارتکاب کے ساتھ ساتھ انہیں بھی تسلیم کرنا پڑا کہ اس لفظ کے معنی حقیقی حاضر و ناظر ہیں، اس لیے اب یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس معنی کو رد کیسے کیا جائے، ادھر اپنے میگزین کو دیکھا تو ان خام خیالیوں کے سوا کچھ تھا ہی نہیں، جن کا وہ بار بار اعادہ کر چکے ہیں۔ اور دنداں شکن جواب پا چکے ہیں۔ ناچار پھر انہیں کو دہرایا۔ آیت سے ثابت ہے کہ خدا کے سوا کسی کو غیب کا علم نہیں۔ امور خمسہ کا علم کسی کو نہیں۔ منافقین کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے ثابت ہے کہ انہیں یہ علم نہیں، انہیں وہ علم نہیں۔ اس لیے شاہد کے معنی حاضر و ناظر نہیں ہو سکتے۔

بالک ہٹ:

پھر شاید خیال آیا کہ ان سب باتوں کا جواب تو ہمارا خصم دے آیا ہے اور اس نے یہ کہہ کر تو ہمارے منہ پر مہر بھی لگا دی ہے کہ ''ہمارا دعویٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تکمیل علم کے سلسلہ میں یہ ہے کہ نزول قرآن کے اختتام پر آپ کا علم مکمل ہوا، اس لیے منکرین کے پاس اس کے بعد کسی چیز کے عدم علم کا ثبوت ہو تو لا دیں، اور ہمارے پاس کوئی آیت یا حدیث ایسی نہیں جس میں ان کی نفی ہو، سب اختتام نزول سے پہلے کے ہی ہیں، اس لیے آپ نے ایک آخری جست لگائی، جست کیا ہے اک لغزش مستانہ ہے، اک جرأت رندانہ ہے، کہ گو ہمارا خصم لاکھ کہہ رہا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدا ہی سے جمیع امور کا علم نہیں مانتے۔ لیکن زبردستی اس کو ماننا ہی پڑے گا، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابتدا ہی سے ہر چیز کے عالم تھے۔ کسی نے کہا ارے صاحب یہ کیا زبردستی ہے، آپ نے فرمایا: میاں زبردستی وغیرہ کچھ نہیں۔ بریلویوں کو تو یہ ماننا ہی ہے، بغیر مانے ہماری دلیل مکمل ہو ہی نہیں سکتی، اس لیے ان پر لازم ہے کہ اپنے دعویٰ میں ترمیم کر کے ہماری دلیل کی زد کے لائق بنائیں، کوئی کھیل تھوڑا ہی ہے۔ ماننا ہے، ماننا ہے، ماننا ہے۔

دنیا میں تین ہٹیں مشہور ہیں: راج ہٹ۔ تریا ہٹ۔ بالک ہٹ۔ ہم حیران ہیں کہ اس

کو کس میں شمار کریں؟ رئیس صاحب کی اس ضد کے سلسلہ میں بھی ''پھڑ بازی'' کے عنوان سے بہت کچھ کہہ چکے ہیں وہیں ملاحظہ کیا جائے۔

حقیقت مہجورہ اور مستعملہ:

رہ گیا ان کا یہ کہنا کہ شاہد کے معنی حاضر وناظر مراد لینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی ''ستم ظریف'' یہ کہے کہ سرخ رو کے معنی لال چہرہ والا، حالاں کہ ان کے معنی باغیرت کے ہیں۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ معنی حقیقی کی دو قسمیں ہیں۔(۱) حقیقت مہجورہ۔(۲) اور حقیقت مستعملہ۔

جس لفظ کے معنی حقیقی اور مجازی دونوں استعمال میں ہوں وہ حقیقت مستعملہ ہے جیسے لفظ شیر کہ اس کے حقیقی معنی ایک مخصوص درندہ ہیں اور آج بھی یہ لفظ اپنے اس معنی پر بے شمار مواقع میں استعمال ہوتا ہے۔ اور مجازی معنی بہادر کے ہیں کہ قرینہ ہو تو لفظ شیر بول کر بہادر آدمی بھی مراد لیے جاتے ہیں۔ اور اگر اہل زبان ومحاورہ نے اس لفظ کو اس حقیقی معنی میں بولنا چھوڑ دیا ہو، اور صرف مجازی معنی ہی مراد لیے جاتے ہوں جیسے یہی لفظ سرخ رو کہ اب اس کے صرف مجازی معنی باعزت ہی مراد لیے جاتے ہیں تو یہ حقیقت مہجورہ ہوئی۔

قاعدہ یہ ہے کہ حقیقت مستعملہ بول کر اس کے حقیقی معنی ہی مراد لیے جائیں گے، ہاں کوئی قرینہ ہو کہ حقیقی معنی مراد نہیں۔ تب البتہ حقیقی معنی مراد لینا بہر حال غلط ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ لفظ شاہد وشہید کے حقیقی معنی حاضر وناظر بھی مجہور ومتروک ہیں یا نہیں۔ اگر معنی حقیقی متروک ہوں اور ہم کو ان کے مراد لینے پر اصرار ہو تو یہ ضرور ہماری ستم ظریفی ہوگی۔ اور اگر متروک نہ ہوں اور جان بوجھ کر رئیس صاحب اس کو متروک قرار دے رہے ہوں تو یہ ان کی ستم ظریفی ہوگی۔ اور لاعلمی میں یہ گل کھلا رہے ہوں تو جہالت قرار دی جائے گی۔ تو حقیقت امر یہ ہے کہ پورے قرآن عظیم میں لگ بھگ ۱۶۰ جگہ شہادت کے مشتقات کا ذکر آیا ہے جس میں ۳۰ جگہ اس کے حقیقی معنی مراد ہیں۔

پس یہ ایک حقیقت مستعملہ ہوئی، رئیس صاحب اس کو سرخ رو پر قیاس کر کے حقیقت مہجورہ قرار دے کر ستم ظریف ہوئے یا جاہل، فیصلہ ہم خود انہیں کی صواب دید پر چھوڑتے ہیں۔

شہادت اور گواہی:

آیات شہادت سے استدلال کے دوسرے پہلو پر مولوی عبدالرؤف صاحب نے ذرا کھل کر کلام کیا تھا، جس کا خلاصہ یہ تھا:

(۱) حضور قیامت میں شہادت نہیں ادا کریں گے، صرف امت کے مزکی ہوں گے۔

(۲) شہادت ادا کریں تب بھی حاضر و ناظر نہ ہوں گے کہ شہادت کے لیے مشاہدہ ضروری نہیں۔

(۳) اگر رسول اللہ ﷺ کو شاہد کہہ دینے پر وہ حاضر و ناظر ہو گئے تو امت کو بھی شاہد کہا گیا ہے، لہٰذا وہ بھی حاضر و ناظر ہوئی۔

پہلی بات کا جواب ہم نے الشاہد میں دیا تھا کہ پہلی آیت کے لیے جھنڈے نگری صاحب کی بات کسی حد تک درست ہے، لیکن دوسری آیت کی تفسیر میں مدارک وخازن میں پوری امت دعوت پر آپ کی گواہی کی تصریح ہے، اور تیسری آیت کی تفسیر میں تفسیر کبیر، مدارک وخازن میں شاھداً علی الخلق کلھم ساری مخلوق پر گواہ آیا ہے، اس لیے صرف یہ کہہ دینے سے کام نہ چلے گا، کہ آپ مزکی ہوں گے، بلکہ دوسری اور تیسری آیت کی مندرجہ بالا تفسیروں کا بھی جواب دینا ہوگا۔

مولوی رئیس احمد صاحب نے ہماری اس تشریح سے صاف آنکھیں بند کر لیں اور فرماتے ہیں:

یہ بات بریلویوں اور اہل حق کے درمیان متفق علیہ ہے کہ جن آیات میں رسول ﷺ کو شاہد اور شہید کہا گیا ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ آپ قیامت کے روز بطور شاہد وشہید اللہ کے سامنے فریضہ شہادت انجام دیں۔ [ابطال، ص:۷۷]

اور لگ بھگ پانچ صفحوں میں یہ تفصیل پیش کی ہے کہ کس طرح گذشتہ امت اپنے رسولوں کی تکذیب کرے گی، اور کس طرح گذشتہ انبیا امت محمدیہ کو اپنی تصدیق کے لیے پیش کریں گے۔ اور کس طرح امت محمدیہ پر اعتراض ہوگا کہ یہ کیسے گواہی دیتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ تشریف لا کر اپنی امت کا تزکیہ کریں گے۔ اور صفائی کریں گے کہ میری امت ٹھیک کہہ رہی ہے، لیکن بقیہ دونوں آیتوں کی تفسیروں کا جواب ... کا مطالبہ تھا، صاف طرح دے

گئے، جس کا مطلب یہی تو ہوا:

وہ بات سارے فسانہ میں جس کا ذکر نہیں   وہ ایک بات انہیں ناگوار گذری ہے

اس لیے شہادت والی یہ دونوں آیتیں ہی اپنی مذکورہ تفسیروں کے ساتھ رئیس صاحب کے سر پر سوار ہیں، اور مطالبہ کے باوجود لا جواب ہیں، پس حاضر و ناظر کے ثبوت کی گذشتہ پانچ آیتوں کے ساتھ یہ دو مل کر سات ہوئیں جن کے جواب سے یہ منکرین علم غیب رسول عاجز رہے۔

سن کر گواہی:

دوسری بات کے ثبوت میں مولوی عبد الرؤف صاحب نے مدارک شریف کی یہ عبارت پیش کی تھی کہ "بعض معاملات کی گواہی سن کر بھی دی جاسکتی ہے"۔

ہم نے اپنی کتاب الشاہد میں اس کا جواب یہ دیا تھا کہ وہ چند استثنائی واقعات ہیں جہاں مجبوراً سمعی شہادت گوارا کر لی گئی ہے۔ ان کو شہادت کے حقیقی معنی کے معارضہ کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا ثبوت بھی ہم نے کتب فقہ سے پیش کیا تھا، اور اپنی اس بات کے ثبوت میں کہ شہادت کے لیے حضور کو مشاہدہ ضروری ہے، ہم نے عنایہ شرح ہدایہ، بیضاوی، اور مفردات راغب کا حوالہ دیا تھا۔

پھر وہی کتر بیونت:

مولوی رئیس صاحب نے ہماری اس بات کا کوئی جواب نہ دیا کہ مدارک کی عبارت سے معارضہ غلط ہے، البتہ عنایہ کی عبارت کے سلسلہ میں انہوں نے ہم پر دو الزام رکھے۔

(۱) عنایہ کی عبارت کتر بیونت کر کے پیش کی ہے۔

(۲) علما کی عبارت کا غلط مطلب سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

[ابطال، ص:۹۱]

اور عنایہ کے رد میں ہدایہ کی عبارت پیش کی ہے، ہم پہلے عنایہ کی پوری عبارت درج کرتے ہیں:

عنایہ کی عبارت:

"(۱) الشهادة في اللغة عبارة عن الاخبار بصحة الشيء عن

مشاهدة وعيان، ولهذا قالوا: إنها مشتقة من المشاهدة التي تبنى عن المعاينة، وفي اصطلاح أهل الفقة عبارة عن إخبار صادق في مجلس الحكم بلفظ الشهادة، فالإخبار كالجنس يشملها والأخبار الكاذبة، وقوله: صادق يخرج الكاذبة، وقوله في مجلس وبلفظ الشهادة يخرج الأخبار الصادقة غير الشهادة وسببها معانيه ما تحملها (۲) مشاهدته بما تختص مشاهدة من السماع في المسموعات والأخبار والأبصار في المبصرات ونحو ذلك.''
[عنایہ جلد۲،ص:٦]

لغت میں شہادت کہتے ہیں کسی چیز کی صحت کی خبر کو مشاہدہ اور معائنہ کر کے، اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ وہ لفظ مشاہدہ سے بنا ہے جس کے معنی معائنہ کے ہیں۔ اصطلاح فقہا میں فیصلہ کی مجلس میں کسی بات کی لفظ ''شہادت دیتا ہوں' کے ساتھ سچی خبر دینا ہے۔ شہادت کی تعریف میں خبر کا لفظ بمنزلہ جنس ہے، جس میں جھوٹی سچی سبھی خبریں شامل ہیں، اور لفظ صادق کہا تو جھوٹی خبر اس سے الگ ہو گئی، اور فیصلہ کی مجلس اور شہادت کے لفظ سے شہادت کے علاوہ سچی خبریں بھی علاحدہ ہو گئیں، اور گواہی کا سبب یہ کہ جس امر کی گواہی دے رہا ہے، اس کا معائنہ کر رہا ہے جس کا شاہد سن کر ہوتا ہے، اگر وہ سننے سے تعلق رکھتی ہو، اور دیکھنے والی چیز کا دیکھ کر اسی طرح اور بھی ہے۔

ہمارا دعویٰ یہ تھا کہ شہادت کے لیے معائنہ اور حضور ضروری ہے، اس دعویٰ کے ثبوت میں ہم نے خط کشیدہ عبارت (۱) پیش کی، جتنی عبارت ہم نے پیش کی وہ تو ہمارے دعویٰ پر عبارت النص ہے۔ بعد والی عبارت میں اگر کوئی لفظ اس کے خلاف ہوتب تو ہم پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ ہم نے عبارت کے معنی غلط سمجھانے کی کوشش کی۔ الحمد للہ کہ رئیس صاحب ایسا کوئی لفظ نہیں دکھا سکتے، اس کے برخلاف رئیس صاحب نے خط کشیدہ عبارت (۲) پیش کر کے جو تاثر دینا چاہا ہے، وہ البتہ غلط معنی سمجھانے کی بھر پور کوشش کہا جائے گا۔

کیوں کہ عبارت کا مطلب تو یہ ہے کہ گواہی اس لیے دیتا ہے کہ وہ اپنی گواہی کا معائنہ اور مشاہدہ کیے ہوئے ہوتا ہے، سنی سنائی باتوں کی گواہی نہیں دیتا، بلکہ موقع پر موجود رہ کر جو چیز دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اس کو خود وہ دیکھتا ہے، اور جو چیز سننے سے تعلق رکھتی ہے اس کو خود سنتا

ہے۔اسی طرح جو چھونے سے تعلق رکھتی ہے اس کو خود چھوتا ہے، وغیرہ ذلک۔اور یہی وہ چیز ہے جس کو ہم نے خود الشاہد ص:۵۶ میں "تنبیہ" کے عنوان سے ذکر کر کیا ہے۔اس کا ہرگز وہ مطلب نہیں جو رئیس صاحب باور کراتے ہیں، کہ خود چاہے موقع پر موجود نہ ہو کسی دوسرے سے حالات سن کر گواہی دے سکتا ہو۔رئیس صاحب کی یہ بات تو بداہت کے خلاف ہے، بھلا دنیا میں کون ایسی کچہری ہوگی جس میں گواہ کا موقع پر موجود رہنا ضروری نہ قرار دیا جاتا ہو۔تو رئیس صاحب نے اپنی اس حرکت سے نہ صرف یہ کہ عنایہ کی عبارت کا غلط مطلب سمجھایا بلکہ حقیقت کی آنکھ میں دھول جھونکنے کی کوشش کی اور غلط فہمی کا الزام رکھا، ہم پر یہ تو اسی قسم کی بات ہوئی: ع

خود فراموشی کند تہمت نہد استاذ را

اور عبارت کی کتر بیونت کا حال تو یہ ہے، کہ پوری عبارت دیکھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ کس نے تراش خراش کی ہے، ہم نے تو جو حصہ بھی نقل کیا ہے مکمل۔لیکن رئیس صاحب کا حال یہ ہے کہ ایک ہی جملہ کے اول و آخر کو حذف کر کے عبارت کو اپنے مفید مطلب بنانے کی کوشش کی ہے، ان کا نقل کردہ حصہ (جس پر ہم نے (۲) کا خط کھینچا ہے) شروع ہوتا ہے وسببھا سے اور ختم ہوتا ہے ونحو ذلک پر لیکن آپ نے ابتدا کے تین لفظ معطوف علیہ سمیت حذف کر دیے۔اور صرف مشاھدۃ سے نقل کرنا شروع کیا۔اور آخر سے نحو ذلک معطوف کو حذف کر دیا، اتنی تراش خراش خود کی اور ہم پر الزام لگایا کتر بیونت کا۔ع

چہ دلا ورست دزدے کہ بکف چراغ دارد

ہدایہ کی عبارت:

اسی طرح ہدایہ کی عبارت تو خود انہیں کا رد بلیغ ہے، اپنی تائید سمجھنا بدحواسی کے ذیل میں آتا ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے:

وحشت میں ہر اک نقشہ الٹا نظر آتا ہے مجنوں نظر آتی ہے لیلا نظر آتا ہے

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ صاحب ہدایہ علیہ الرحمہ نے اصلی اور ذیلی گواہی کا فرق ظاہر کرتے ہوئے فرمایا: "اصلی گواہ (موقع) جس نے واقعہ میں جو چیز دیکھنے کے لائق ہو اس کو خود دیکھا ہو، اور جو سننے کے لائق ہو اس کو خود سنا ہو، جو چھونے سے تعلق رکھتا ہو اس کو خود چھو کر معلوم کیا ہو، یہ شخص حاکم کے وہاں گواہی دے سکتا ہے۔دوسرا ذیلی گواہ جس کی گواہی کو شہادت علی

الشہادت کہا جاتا ہے، ایسے گواہ کو جب تک اصل گواہ یہ کہہ کر کہ میری گواہی کا تو گواہ ہو جا، گواہ نہ بنائے، شرعاً یہ گواہی نہیں دے سکتا۔''

اسی کو رئیس صاحب یہ کہتے ہیں کہ گواہ کے لیے دیکھنا ضروری نہیں ہے، ہدایہ کی عبارت سامنے ہے ناظرین خود فیصلہ کرلیں:

''وما تحمله الشاهد على ضربين: ما يثبت حكمه بنفسه مثل البيع والغصب والقتل وحكم القاضي، فإذا سمع ذلك الشاهد أو رآه وسعه أن يشهد عليه، ويقول أشهد أنه باع. ولو سمعه من وراء الحجاب لا يجوز له أن يشهد. ومنه مالا يثبت حكمه بنفسه مثل الشهادة على الشهادة، فإذا شهد شاهداً يشهده بشيء لم يجز له أن يشهد على الشهادة إلا أن يشهد عليها. (ملخصاً)'' [ہدایہ اخیرین ص:۴۲۰]

اور گواہی دو قسم کی ہوتی ہے، ایک وہ جسکا حکم خود اسی سے ثابت ہو جیسے بیع، غصب، قتل، اور قاضی کا فیصلہ، اور کسی نے ان واقعات کو خود دیکھا اور ان میں سننے کی بات کو خود سنا تو وہ گواہ ہو گیا۔ قاضی کے وہاں کہہ سکتا ہے کہ میں فلاں کے بیچنے کی گواہی دیتا ہوں خواہ گواہ بنایا گیا ہو یا نہ بنایا گیا ہو۔ اور اگر وہ ایجاب وقبول کو پردے کے پیچھے سے سنے تو گواہی نہ دے سکے گا۔ اور وہ گواہی جس کا حکم خود اسی سے ثابت نہ ہو جیسے شہادت علی الشہادت، اس میں کسی گواہ کو گواہی دیتے دیکھ کر گواہی دینا چاہے تو نہیں دے سکے گا جب تک کہ اصل گواہ اس کو اپنی گواہی کا گواہ نہ بنائے۔

کس درجہ حیرت ناک بات ہے کہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ اصل گواہ کو خود سننا اور دیکھنا ضروری ہے یہاں تک کہ موجود رہ کر خود سنا لیکن بولنے والے اور گواہ میں حجاب تھا تو گواہی صحیح نہیں۔ اور مولوی رئیس صاحب کہتے ہیں کہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ گواہی کے لیے دیکھنا ضروری نہیں۔ اور ہدایہ صفحہ ۱۴۲ کی مذکورہ بالا عبارت کا ایک ٹکڑا نقل کیا اور ص:۱۴۳ کی یہ تشریح انہیں نہیں سوجھی جو ان کے صفرا کا پورا پورا علاج ہے۔

''ولا يجوز الشاهد أن يشهد بشيء لم يعانيه إلا النسب والموت والنكاح والدخول وولاية القاضي، فانه له أن يشهد بهذه الأشياء إذا أخبره من

يثق به، والقياس أن لا يجوز؛ لأن الشهادة مشتق من المشاهدة. والاستحسان أن هذه الأمور تختص معاينة أسبابها خواص من الناس، فلو لم يقبل الشهادة بالسامع أدى إلى الحرج (ملخصاً)'' [ہدایہ، ص:۱۴۳]

نسب، موت، نکاح، ولایۃ قاضی کے سوا ان دیکھی چیزوں کی گواہی جائز نہیں، مذکورہ بالا مستثنیات میں البتہ قابل بھروسہ آدمی سے سن کر گواہی دی جاسکتی ہے۔ قیاس کا تقاضا تو یہی تھا کہ ان مستثنیات میں بھی بے دیکھے گواہی معتبر نہ ہو مگر قیاس خفی کا تقاضا یہ ہے کہ ان چیزوں کے اسباب کا مشاہدہ بہت تھوڑے لوگ کرتے ہیں۔ تو ان میں بھی بے دیکھے گواہی قبول نہ کی جائے تو لوگوں پر بڑی تنگی ہوگی۔

کس وضاحت سے صاحب ہدایہ فرمارہے ہیں کہ پانچ معاملات کے علاوہ سن کر گواہی جائز نہیں، اور ان کے جائز ہونے، بنیاد معذوری اور مجبوری اور دفع حرج ہے۔ معلوم ہوا کہ اس سے اصل شہادت کے خلاف سند نہیں پکڑی جاسکتی، اور معلوم ہوا کہ رئیس صاحب کی ساری اچھل کود کے باوجود بات وہیں رہی جہاں تک ''الشاہد'' میں پہونچائی گئی تھی، کہ شہادت کے لیے معائنہ ضروری ہے۔

امت بھی حاضر وناظر ہے:

مولوی عبدالرؤف کی تیسری بات کا جواب ہم نے ''الشاہد'' میں یہ دیا تھا کہ امتی اس لیے حاضر وناظر نہ ہوں گے کہ ان کی شہادت اصلی نہیں ہوگی، شہادت علی الشہادۃ ہوگی۔ چناں چہ جب امت محمدیہ سے پوچھا جائے گا کہ تم تو موقع پر موجود ہی نہ تھے، شہادت کیسے دے رہے ہو، تو کہیں گے: ''بأخبار القرآن على لسان نبيك الصادق.'' آپ کے سچے نبی کی زبان سے قرآن سن کر، امت محمدی ﷺ کا یہ اقرار اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی گواہی شہادۃ علی الشہادۃ ہے۔

رئیس صاحب نے ہماری ان باتوں کی تردید نہیں کی بلکہ یہ لکھ کر تصدیق ہی کردی کہ:

''تو رسول اللہ ﷺ کی شہادت حضرت جبرئیل کی خبر کے مطابق ہوگی، اس لیے جس طرح امت حاضر وناظر نہیں، رسول بھی حاضر وناظر نہ ہوں گے۔''

[ابطال ص:۸۷]

ہمارا کہنا یہ ہے کہ:

اولاً:۔کیا جبرئیل کے بارے میں مولوی رئیس صاحب کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ حاضر وناظر ہیں، اس لیے کہ بقول ان کے جبرئیل کی شہادت اصلی ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی ان سے سن کر۔

ثانیاً:۔امت کی گواہی کے شہادت علی الشہادۃ ہونے کے تو حدیث میں دو قرینے موجود ہیں۔ پہلا قرینہ یہ ہے کہ ان سے سوال ہوگا کہ تم موقع پر موجود نہ تھے تو گواہی کیسی؟ اور دوسرا قرینہ یہ ہے کہ انہوں نے اقرار کیا کہ ہماری گواہی رسول اللہ ﷺ سے سن کر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی گواہی بھی جبرئیل امین سے سن کر ہے، اس کا کیا ثبوت ہے؟ بلکہ یہاں تو آپ کی گواہی کے اصلی ہونے کا ہی قرینہ موجود ہے، کہ حضور ﷺ بھی گذشتہ انبیا کے زمانہ میں جسماً موجود نہ تھے، پھر بھی آپ سے یہ سوال نہیں ہوا کہ آپ کس طرح گواہی دے رہے ہیں؟ اس لیے ثابت ہوا کہ آپ کی گواہی اصل اور آپ حاضر وناظر ہیں۔ رئیس صاحب ہم کو آپ سے ہمدردی ہے۔ آپ نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اس فضیلت عظمیٰ کی رسول اللہ ﷺ سے نفی ہوجائے۔ اگر چہ جبرئیل امین کے لیے اس کا ثبوت ماننا پڑے۔ مگر آپ کی محنت ضائع گئی۔ کیا کیجیے گا وحشت میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں میرے آیا ۔۔۔ جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

مدت شہادت اور ضعیف حدیثوں سے قرآن کے خلاف استدلال:

شہادت سے متعلق دو باتیں رئیس صاحب نے اور بھی کہی ہیں:

(۱) شہید وبصیر کے معنی حاضر وناظر مان لیے جائیں تب بھی اس کو بنیاد بنا کر رسول اللہ ﷺ کو ہمیشہ کے لیے حاضر وناظر اور عالم ماننا صحیح نہیں، کیوں کہ سورۂ مائدہ میں شہادت کی مدت کو انبیا کی حیات تک محدود بتایا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيداً مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ﴾ [المائدۃ:س ۵۔ت ۱۱۷]

یعنی اے اللہ میں اپنی امت کے انہیں حالات کی بابت گواہی دے سکتا ہوں جو میری موجودگی میں ہوئے، اور جب تو نے مجھے ان کے درمیان سے اٹھالیا تو تو ان پر رقیب رہ گیا، تو

جب آپ کی گواہی آپ کی دنیاوی زندگی تک محدود ہے تو بعد کے حالات سے آپ کیسے باخبر ہو سکتے ہیں؟۔

(۲) جب آیت مذکورہ بالا سے آپ کا علم محدود ثابت ہو گیا تو بعد وفات ثبوت علم آیات قرآنیہ یا حدیث متواتر ومشہور سے ہی ہو سکے گا، قرآن کی آیات بالا کے خلاف ضعیف روایتوں سے اس کا ثبوت نہیں ہو سکتا جیسا کہ ''الشاہد'' میں حضور کے لیے قبر میں اعمال امت کی پیشی کو ضعیف روایتوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جواباً ہماری گذارش یہ ہے کہ مذکورہ بالا مدعا پر سورہ مائدہ کی آیت مذکورہ سے استدلال غلط ہے، کیوں کہ استدلال کی بنیاد اس پر ہے کہ آیت میں ذکر کیے ہوئے لفظ شہید کے معنی گواہ کے ہیں۔ اور آدمی گواہ نہ رہے تو عالم بھی نہ رہے گا۔ حالاں کہ آیت میں لفظ شہید گواہ کے معنی میں نہیں (رقیب) نگراں اور مسئول الیہ کے معنی میں ہے، اور گواہی ہو یا نگرانی ان دونوں کے عدم سے علم کا معدوم ہونا لازم نہیں۔

پہلی بات کا ثبوت یہ ہے کہ جلالین شریف میں اس بات کی تصریح ہے کہ آیت میں شہید کے معنی رقیب کے ہیں:

﴿وكنت عليهم شهيدًا﴾ رقيباً أمنعهم مما يقولون: ﴿ما دمت فيهم فلما توفيتني﴾ قبضتني بالرفع إلى السماء ﴿كنت أنت الرقيب عليهم﴾ الحفيظ لأعمالهم. [تفسير المائدة: ت ۱۱۷، ص ۱۲۷]

میں ان کا نگراں تھا، انہیں ان کی باتوں سے روکتا تھا اور جب تو نے مجھے آسمان کی طرف اٹھا لیا تو تو ہی ان کے اعمال کا نگراں رہ گیا۔

دیکھیے اس عبارت میں صاف صاف شہید کے معنی رقیب تحریر ہیں جس کی روشنی میں آیت کا مطلب ہوا کہ میں اپنی دنیاوی زندگی میں ان کے اعمال کا نگراں رہا، اور بعد وفات نگراں نہ رہا۔

اور نگراں نہ رہنے کے لیے نہ گواہ ہونا لازم نہ لاعلم ہونا لازم ہے، کہ نگراں نہ رہے تو گواہ بھی نہ رہیں، یا نگراں نہ رہے تو عالم بھی نہ رہیں، کیوں کہ یہ عین ممکن ہے کہ آدمی کسی کا نگراں نہ ہو اس کا گواہ بھی نہ ہو، لیکن اس کے حالات سے باخبر ہو اور ان کا عالم ہو۔

تو شہید کے معنی بالفرض آیت میں گواہ بھی ہوں تب بھی زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوگا کہ بعد وفات آپ گواہ نہ رہے۔ نہ یہ کہ آپ عالم بھی نہ رہے۔

اور یہیں سے رئیس صاحب کی دوسری بات کا جواب بھی ہوگیا، کیوں کہ اس دوسری بات کی بنیاد بھی آیت کی اس غلط تعبیر پر تھی، اور فاسد پر جس کی بنیاد ہو وہ بھی فاسد ہی ہے۔

تو جب آیت مذکورہ نے بعد وفات کے علم پر نفیاً واثباتاً کوئی روشنی ہی نہیں ڈالی تو بعد وفات کا علم احادیث سے ثابت کرنا قرآن کے خلاف استدلال کیسے ہوا؟ رئیس صاحب نے خواہ مخواہ دماغ پر زور دیا اور علمی اصطلاحات کا بے محل استعمال کیا۔

فریب اور ابلہ فریبی:

یہ عنوان رئیس صاحب کا قائم کردہ ہے، اور ہمیں بھی تسلیم ہے۔ کہ فریب کہیے اور ابلہ فریبی کہیے، یا فریب کہیے اور خود فریبی گردانیے، کچھ نہ کچھ ہے تو ضرور لیکن بریلویوں کا نہیں جیسا کہ رئیس صاحب کا خیال ہے خود رئیس الاحرار صاحب ان میں سے کسی بیماری میں ضرور مبتلا ہیں۔ ثبوت ملاحظہ ہو:

مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے اپنے دعویٰ کی تائید میں قرآن عظیم کی مزید آیتیں پیش کی تھیں: مثلاً:

(۱)﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾

[الأنبياء: س ۲۱. ت ۱۰۷]﴾

ہم نے آپ کو سارے عالم کے لیے رحمت بنایا۔

(۲)﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾

[الأعراف: س ۷. ت ۱۵۶]

میری رحمت ہر شی کو گھیرے ہوئے ہے۔

(۳)﴿النَّبِيُّ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ﴾

[الأحزاب: س ۳۳. ت ۶]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی جان سے بھی زیادہ ان کے قریب ہیں۔

(۴)﴿خَلَقَ الْإِنسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ [الرحمٰن: س ۵۵. ت ۳. ۴]

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو بیان سکھایا۔

پہلی اور دوسری آیت:

مولوی عبدالرؤف صاحب نے رسول اللہ ﷺ کے رحمت ہونے سے انکار کیا تھا، اور ہم نے عقل و نقل سے یہ ثابت کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ رحمت ہیں اور سب کے لیے رحمت و مہربان ہیں۔

مولوی رئیس احمد صاحب نے ہمارے موقف سے اختلاف نہیں کیا بلکہ جزوی تائید ہی کی۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

جنت ہی تو متقیوں کے لیے مخصوص ہے، ورنہ ذات رسول تو سراپا ہر کس و ناکس کے لیے رحمت ہے۔ [ابطال، ص:۱۰۹]

بات تو صاف ہوگئی کہ ذات رسول جب ہر کس و ناکس کے لیے رحمت ہے اور مہربانی کرنے کے لیے علم بھی ضروری ہے کہ اس کس و ناکس کو آپ جانیں تب تو مہربان ہوں گے، لیکن پھر بھی بیماریوں میں سے کسی نے زور باندھا جن کا عنوان میں ذکر ہے تو فرماتے ہیں کہ: رحمت سے مراد رسول اللہ ﷺ نہیں بلکہ جنت ہے۔ اور اس کی تائید میں مسند احمد اور تفسیر ابن کثیر اور در منثور کے حوالہ سے ایک حدیث نقل کی ہے اور قرآن عظیم کی آیت: ﴿رحمتي وسعت كل شيء﴾ کا دوسرا ٹکڑا ﴿سأكتبها للذين يتقون.﴾ نقل کیا ہے کہ اس کی رحمت کو اللہ تعالیٰ نے متقیوں کے لیے خاص فرمایا ہے، تو اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کیسے ہو سکتے ہیں۔ وہ تو ہر کس و ناکس کے لیے عام ہیں۔

لیکن مولوی رئیس صاحب یہاں ایک ایسی بات کہہ گئے جس سے خود انہیں کے دماغ میں مروڑا اٹھنے لگا کہ میں ﴿سأكتبها للذين يتقون﴾ سے رحمت کو خاص کر رہا ہوں۔ اور اسی آیت کا ابتدائی حصہ رحمت کو سب کے لیے عام کر رہا ہے۔ یہ تو صاف صاف تعارض ہوا۔ تو میں نے آیت کی خوب تفسیر کی کہ اول کو آخر سے متعارض کر دیا، تب طفل تسلی کے لیے فرمایا:

”واضح رہے کہ جنت کے وسیع ہونے کے باوجود متقیوں کے لیے مخصوص ہونے میں، اور رسول اللہ ﷺ کے رحمۃ للعالمین ہونے میں کوئی تضاد نہیں ہے۔“

[ابطال، ص:۱۰۹]

آپ کی اس تقریر سے واضح تو کچھ خاک نہیں ہوا، البتہ یہ کھلا کہ آپ تعارض کو عدم تعارض کہنے کے آزار میں مبتلا ہیں۔ اب یہ فریب نظر ہے، یا خود فریبی؟ کون فیصلہ کرے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ ۔۔۔ دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

اللہ کے بندے ایسی رحمت جو آج سب کے لیے عام ہو اور کل متقیوں کے لیے مخصوص ہو، رسول اللہ ﷺ ہیں، کہ آج تو سب ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اٹھا رہے ہیں۔ سب کو فائدہ پہونچ رہا ہے، لیکن کل قیامت میں صرف اہل اسلام مستفید ہوں گے، اور یہی مطلب ہے قرآن کی آیت مبارکہ کا کہ آج کی عام رحمت کل مسلمانوں کے لیے خاص ہوگی۔

تیسری آیت:

تیسری آیت کے سلسلہ میں مولوی عبد الرؤف نے کہا تھا:

(۱) اولیٰ کے معنی قریب نہیں بلکہ احق بالتصرف ہیں، مطلب یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو مسلمانوں پر خود ان سے زیادہ تصرف کا حق حاصل ہے۔

(۲) اولیٰ کے معنی قریب ہوں تب بھی اہل سنت و جماعت کا موقف ثابت نہ ہوگا، کیوں کہ آیت کا مطلب تو ہوگا صرف مسلمانوں کے قریب، اور اہل سنت کا دعویٰ سارے عالم میں حضور کا ہے۔

ہم نے جواباً عرض کیا تھا کہ قرب جسمی پر اصرار نہیں کرتے، قرب علمی مانا جائے تب بھی ہمارا مدعا ثابت ہے۔ الحمد للہ کہ آپ نے سارے مسلمانوں میں تصرف کا حق مانا جس کے لیے علم کا مقدم ہونا ضروری ہے۔ اور مسلمان سارے عالم میں ہیں تو سب کا علم ثابت ہوا۔

رئیس صاحب کو اتفاق سے دو آیتیں ایسی مل گئیں جن میں لفظ اولیٰ کا ذکر ہے، بس کیا تھا آپ پر وہ کیفیت طاری ہوگئی: ہر چہ پیدا می شود از دور پندارم توئی۔ اسی کو اپنی دلیل بنالیا۔ اور یہ بھی خیال نہ کیا کہ ہمارے مربی مولوی عبد الرؤف صاحب اپنی تحریر میں کیا اقرار کر کے آئے ہیں۔ چناں چہ آپ لکھتے ہیں:

اسی آیت میں: ﴿أولو الأرحام بعضهم أولىٰ ببعض﴾

[الأنفال: س ۸۔ ت ۷۵]

بھی ہے تو قانون بریلویہ کے مطابق رشتہ دار چاہے دس مختلف ممالک میں ہی کیوں نہ

ہوں، ایک دوسرے کے حالات پر حاضر وناظر اور عالم الغیب ہو جائیں۔

[ابطال،ص:۱۰۷]

اسی طرح:

﴿ان أولی الناس بابراھیم للذین اتبعوہ.﴾ ہے، لہذا ہر زمانہ کے سارے مسلمان حضرت ابراہیم کے ساتھ رفیق اعلیٰ میں موجود رہ کر جنت کے مزے لوٹ رہے ہوں گے۔

[ابطال،ص:۱۰۸]

ہماری گزارش ہے بندہ پرور آپ کو زیادہ اڑنے کی ضرورت نہیں، آپ کے پر تو آپ کے مربی نے پہلے ہی کتر دیے ہیں، اور رسول اللہ ﷺ کے لیے تصرف کا اقرار کر چکے ہیں، انہیں اختلاف صرف اس بات سے تھا کہ مسلمان ہر جگہ نہیں، اس غلط فہمی کو ''الشاہد'' میں دور کر دیا گیا، تو آپ کو مولوی عبدالرؤف صاحب کے اقرار سے آگے بڑھ کر بولنے کا کیا حق ہے؟۔

اور آیت مبارکہ: ﴿أولوا الأرحام بعضھم أولیٰ ببعض.﴾ میں باتفاق مفسرین اولیٰ کے معنی احق بالوراثت لکھے ہیں، کہ رشتہ دار ایک دوسرے کے وراثت میں زیادہ حق دار ہیں، یہاں اولیٰ کے معنی نہ اقرب بالمکان ہے نہ احق بالتصرف، پھر رشتہ داروں میں ہر ایک کے حالات کا عالم الغیب ہونے کا حکم کس طرح سے نکلے گا۔

اور دوسری آیت میں تو آپ نے غضب ہی کر دیا ہے، کیوں کہ اسی بحث میں ہم نے یہ بات صاف کر دی تھی کہ آیت میں قرب سے مراد قرب جسمی نہیں ہے، اور آپ نے آیت میں قرب جسمی ہی مراد لے کر اہل سنت و جماعت کے خلاف چاند ماری شروع کر دی، اس آیت مبارکہ میں اولیٰ کے معنی اقرب فی العقیدہ ہے کہ مسلمان حضرت ابراہیم علیہ السلام سے عقیدہ میں زیادہ قریب ہیں، اور آپ اس کو قرب جسمی قرار دے کر الجھ رہے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے:

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دل گیر کو کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

چوتھی آیت:

چوتھی آیت اور آیت شریفہ سورہ ''علق'' ﴿علم الانسان مالم یعلم﴾ دونوں ہی آیتوں کی تفسیر میں مختلف مفسرین نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق تین قول تحریر کیے ہیں:

(۱) انسان سے مراد مطلق انسان (۲) آدم علیہ السلام (۳) حضور سید عالم ﷺ۔ اور

علم بیان سے مراد (۱) گویائی (۲) بیان اسماء اشیا (۳) بیان ما کان وما یکون۔

مولوی عتیق الرحمٰن صاحب نے تیسری تفسیر کی بنیاد پر آیت کو اثبات مدعا کے لیے نقل کیا تھا۔

مولوی عبد الرؤف صاحب نے جواب میں بقیہ دو تفسیریں بھی نقل کیں اور اپنی عادت کے موافق کہا کہ آیت سے استدلال ختم ہو گیا، مزید یہ کہ مولوی عتیق الرحمٰن صاحب نے جو تفسیر نقل کی ہے مرجوح ہے۔

ہم نے ''الشاہد'' میں دونوں ہی باتوں کا تفصیلی جواب دیا، جس کو اصل کتاب میں دیکھا جائے۔

مولوی رئیس احمد صاحب اپنی کتاب میں ان مسائل کے بارے میں تو کوئی لب کشائی نہ کر سکے، البتہ فریب نظر میں مبتلا ہو گیے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''الشاہد'' ص: ۷ پر لکھا ہے کہ مولوی عتیق الرحمٰن صاحب نے آیت ﴿علم الانسان مالم یعلم﴾ سے رسول اللہ کے علم پر استدلال کیا ہے حالانکہ مولوی عتیق الرحمٰن صاحب نے اپنی پوری کتاب میں اس آیت کا تذکرہ ہی نہیں کیا ہے۔[ابطال، ص: ۱۰۵۔۱۰۶]

اس طرح ہم نے گویا بہت بڑا فریب دیا اور کذب بیانی سے کام لیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں ہمارا کچھ قصور نہیں ہے جو کچھ ہے خود رئیس صاحب کا فریب نظر ہے۔ ہماری کتاب ''الشاہد'' موجود ہے، اس کا صفحہ ۷ کھلا ہوا ہے، پورے صفحہ میں کوئی بھی مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کا نام دکھا دے، ہم منہ مانگا انعام دیں گے۔ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب تو نہیں البتہ پورے صفحے میں دو بار فاضل رحمانی یعنی عبد الرؤف صاحب کے خطاب کا ذکر ہے۔ اور علم الانسان کی کئی تفسیروں کو بھی انہیں کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن مولوی رئیس احمد صاحب، مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کے کابوس میں کچھ ایسا مبتلا ہیں کہ اپنے مربی کی صورت میں بھی انہیں مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کا ہی ہیولیٰ نظر آیا۔ اور مولوی عبد الرؤف صاحب کو مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سمجھ کر ہم پر کذب بیانی کا الزام وارد کر بیٹھے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جیوں جیوں کتاب کے اختتام کی منزل قریب آتی جا رہی ہے، رئیس صاحب کی وحشت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟

یہاں ہر گام گام اولیں ہے — جنوں کی کوئی منزل ہی نہیں ہے

یک نہ شد دو شد:

یونہی رئیس صاحب نے آیت مبارکہ ﴿وعلم الانسان مالم یعلم.﴾ کی تفسیر کے سلسلہ میں یہ بھی فرمایا:

''اس آیت میں انسان کو بذریعہ قلم تعلیم دینے کی تصریح ہے اور ہمارے نبی امی تھے، بذریعہ قلم آپ کو تعلیم نہ دی گئی''۔ [ابطال، ص:۱۰۶]

گویا اس آیت میں انسان سے مراد رسول اللہ ﷺ نہیں ہو سکتے۔

مولوی رئیس صاحب نے مذکورہ بالا بات کہہ کر علم کا کیسا ستیاناس کیا ہے، ہم سے نہیں علامہ آلوسی سے سنیے:

﴿الذي علم بالقلم﴾ أي: علم ما علم بواسطة القلم، ﴿علم الانسان مالم يعلم﴾ بدل اشتمال من ﴿علم بالقلم﴾ يعني علمه به وبدونه من الأمور الكلية والجزئية والجلية والخفية مالم يخطر بباله. والإشعار بأنه تعالىٰ يعلمه عليه الصلاة والسلام من العلوم مالا يحيط به العقول مالا يخفى. (ملخصاً)

[روح المعانی جلد ۱۶، ص:۳۲۴]

اللہ تعالیٰ نے انسان کو قلم سے سکھایا، یعنی وہ سکھایا جو سکھایا۔ انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ یہ علم پہلے والے علم سے بدل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو قلم کے ذریعہ بھی تعلیم دی اور بغیر قلم کے بھی تعلیم دی، امور کلیہ و جزئیہ روشن ومخفی، ایسے بتائے جس کی اسے خبر بھی نہ تھی۔ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ایسے ایسے علوم سکھائے جنہیں عقل جان نہیں سکتی، اور یہ بات پوشیدہ نہیں ہے۔

کس درجہ حیرت ناک بات ہے کہ ﴿الذي علم بالقلم.﴾ علاحدہ آیت ہے اور ﴿علم الانسان مالم یعلم.﴾ الگ آیت ہے، پہلی آیت میں قلم کے ذریعہ پڑھانے کا ذکر ہے۔ اور دوسری میں بغیر قلم کے تعلیم کا ذکر ہے۔ مگر رئیس صاحب کے علم واجتہاد کا یہ زور ہے کہ پہلے جملہ کا متعلق دوسرے جملہ کے ساتھ متعلق کر رہے ہیں۔ اس نحوی مہارت پر فراء اور سیبویہ کی روح بھی پھڑک اٹھی ہوگی۔ یہ ہے آپ کا مبلغ علم اور یہ ہے قرآن فہمی۔

اسی لیے میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔ اور اب تو میں یہ کہتا ہوں کہ یہ حرکت تو فریب نظر، ابلہ فریبی، اور خود فریبی سے بھی آگے کی چیز ہے۔

صدائے برنہ خواست:

مثبتین کے دلائل اور قرآنی تائیدات کے سلسلہ میں رئیس صاحب کی خامہ فرسائی کا حال گذشتہ صفحات میں گزرا، مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے اثبات مدعی کے سلسلہ میں حدیثیں بھی ذکر کی تھیں۔ جن میں سے چند پر ہم نے ''الشاہد'' میں کلام بھی کیا تھا، اور ایک دو حدیث کا خود بھی اضافہ کیا تھا، جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)((فتجلىٰ لی کل شيء وعرفت))

تو مجھ پر ہر چیز روشن ہوگئی اور میں نے پہچان لیا۔

(۲)((إن الله رفع لي الدنيا فأنا أنظر إليها وإلى ماهو كائن فيها إلى يوم القيامة ،كأنما أنظر إلى كفي هذه)) (حلیۃ الأولیاء:۶/۱۰۱)

دنیا میرے سامنے لائی گئی تو میں اس میں جو ہے اور قیامت تک ہوگا اپنے کف دست کی طرح دیکھتا ہوں۔

(۳)((ولا تسئلوني عن شيء إلا أخبرتكم))

(مسند امام احمد:۳/۲۰۴)

تم مجھ سے جو پوچھو گے میں اس کی اطلاع دوں گا۔

(۴)((يخبركم بما مضىٰ وما هو كائن بعدكم))

(مسند امام احمد:۳/۲۰۴)

یہ رسول تم کو گذشتہ اور آیندہ کی خبر دیتے ہیں۔

(۵)((قام فينا رسول الله ﷺ مقاماً فأخبرنا عن بدأ الخلق حتىٰ دخل أهل الجنة منازلهم وأهل النار منازلهم، حفظ ذلک من حفظ ، ونسي من نسيه)) (صحیح مسلم: کتاب الفتن ۲/۳۹۰)

ایک روز رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر ابتدائے خلق سے دخول جنت و نار تک کی خبریں دیں، تو جو یاد رکھ سکا اس کو اس نے یاد رکھا، جو بھول گیا بھول گیا۔

ان سب حدیثوں پر مولوی عبدالرؤف صاحب نے جو کہا، اور ہمارے معروضات دونوں ہی ''الشاہد'' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن رئیس التحریر صاحب کا قلم اس موضوع پر بالکل دم بخود ہے۔ صرف یہ ایک جملہ سرزد ہوا ہے کہ ان کا جواب فاضل رحمانی اور علمائے حق تحقیق سے دے چکے ہیں۔ اس لیے ہم بھی کچھ مزید چھیڑنے کے بجائے اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہم بھی آپ کے علمائے حق کی تحقیق کی پوری پوری داد دے چکے ہیں اور آپ کی خاموشی کے لیے بھی ایک شعر نذر ہے:

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے　　پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

متفرقات:

مولوی رئیس احمد صاحب نے اپنی کتاب ''ابطال شواہد الشاہد'' میں کچھ ضمنی مسائل سے بھی تعرض کیا ہے، ہم نے مناسب سمجھا کہ اس سلسلہ میں بھی کچھ عرض کر دیا جائے تا کہ بعد کو کچھ گلہ شکوہ نہ رہ جائے۔

کتاب التوحید، اور تقویۃ الایمان:

۱۲۳۴ھ تک محمد ابن عبد الوہاب (۱۱۱۱ھ ۱۲۰۶ھ) نجدی کی تحریک ایک مسلمہ گمراہی تھی، اور دنیائے اسلام ان کی بد مذہبی اور بد دینی کے بارے میں متفق اللسان تھی۔ مولوی اسماعیل دہلوی ۱۱۹۳ھ ۱۲۴۶ھ کی تحریک ودعوت بھی لگ بھگ انہیں خطوط پر اٹھی اور آگے بڑھی، اس لیے ہندوستان میں عام طور پر علمائے اہل سنت نے ان کی تحریک کا تعارف کراتے ہوئے یہ ذکر کیا کہ مولوی اسماعیل دہلوی کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' تو ابن عبد الوہاب نجدی کی ''کتاب التوحید'' کا ترجمہ ہے، خود مولوی اسماعیل صاحب کے چچیرے بھائی مولانا مخصوص اللہ فرماتے ہیں: ''چوتھی بات کا جواب یہ ہے کہ وہابی کا رسالہ متن تھا، یہ شخص گویا اسی کی شرح کرنے والا ہو گیا''۔

(اسماعیل اور تقویۃ الایمان، ص:۱۰۲)

ظاہر ہے کہ علمائے اہل سنت کی اس بات کا مطلب یہ نہیں تھا، کہ یہ کتاب ابن عبد الوہاب کی تحریر کا لفظی ترجمہ ہے، کیوں کہ ان کا مقصد تقویۃ الایمان کی تاریخی حیثیت کا تعین نہیں تھا۔ بلکہ مقصد یہ تھا کہ اس کتاب کی گمراہی کتاب التوحید کی ضلالتوں کا پس خوردہ ہے اور مقصد کے اظہار کے لیے لفظی ترجمہ یا ترجمانی دونوں ہی طرح سے ان دونوں کتابوں کے اصلاً ایک

ہونے کی بات صحیح ہے۔

مولوی اسماعیل دہلوی کے متبعین اور ہواخواہوں نے صرف اتنی سی بات پر آسمان سر پر اٹھالیا۔ یہ سنی مولوی غلط کہتے ہیں "تقویۃ الایمان" کتاب التوحید کا ترجمہ نہیں ہے۔ یہ جاہل ہیں کاذب ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔ دیوبندی صاحبان کا بھی یہی وظیفہ ہے۔ اور غیر مقلد حضرات کا بھی، مولوی رئیس احمد صاحب نے بھی اپنے بڑوں کے راگ میں اپنا سر ملایا ہے۔ اور مولوی عتیق الرحمٰن صاحب کو کاذب اور جاہل قرار دیا۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

"ایک لغوطرازی یہ بھی ہے کہ اس بیسویں صدی میں یہ لوگ کہتے رہتے ہیں کہ حضرت اسماعیل شہید کی بدعت شکن کتاب تقویۃ الایمان شیخ الاسلام محمد ابن عبد الوہاب نجدی کی کتاب التوحید کا ترجمہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں عام طور سے ملتی ہیں۔ ہر صاحب علم دونوں کتابوں کا مطالعہ کر کے بآسانی معلوم کرسکتا ہے، کہ بریلوی جماعت نے تقویۃ الایمان کو کتاب التوحید کا ترجمہ قرار دے کر یا تو نادانی یا جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ یا کذب بیانی میں اپنی فن کاری دکھلائی ہے"۔ [ابطال، ص:۱۲]

یہ عجیب اتفاق ہے کہ رئیس صاحب کی دعوت پر لبیک کہا جا چکا ہے اور خانقاہ شاہ ابوالخیر دہلی کے موجودہ دینی سربراہ ابوالحسن زید فاروقی ازہری صاحب جو اپنے کو غیر جانب دار کہتے ہیں، اور جن کے اہل علم ہونے سے بھی رئیس صاحب کو انکار نہ ہوگا۔ ان دونوں کتابوں کا تحقیقی مطالعہ کر کے جو فیصلہ دے دیا ہے اس کا خلاصہ ہم بیان کرتے ہیں۔ اصل متن ان کی کتاب مولانا اسماعیل اور تقویۃ الایمان میں دیکھا جائے۔ خدا نے چاہا تو رئیس صاحب اور ان کے طائفہ کے لیے بھی سرمہ بصیرت ثابت ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

"محمد ابن عبد الوہاب نے ایک مفصل کتاب "کتاب التوحید" کے نام سے تحریر کی۔ ۷ رمحرم ۱۲۲۱ھ میں طائف پر قبضہ کرنے کے بعد اہل مکہ کے پاس اسی مطول کتاب کا خلاصہ اس وضاحت کے ساتھ کہ یہ اسی کا خلاصہ ہے، بھیجا۔ یہ مختصر رسالہ سارے عالم میں پھیلا اور دلی میں بھی شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں ہی پہونچا۔ مولوی اسماعیل دہلوی نے اس کو تھوڑی ردوبدل کے بعد اردو میں "تقویۃ الایمان" کے نام سے مشہور کیا، اور ہر طرح تقویۃ الایمان شیخ نجدی کے اسی رسالہ کا چربہ ہے، جس کا ثبوت مندرجہ ذیل ہے:

(۱) نجدی نے یہ لکھا ہے کہ میرا یہ رسالہ دو باب پر مشتمل ہے، تو صاحب تقویۃ الایمان نے بھی اپنی کتاب کے دو ہی باب قرار دیے، لیکن مکمل صرف ایک ہی باب کر سکے، کیوں کہ نجدی نے بھی اپنے رسالہ مرسلہ ۷ محرم ۱۲۲۱ھ میں کتاب صرف ایک باب پر ہی ختم کر دی تھی۔

(۲) نجدی نے اپنی کتاب میں فصول کے جو نام رکھے، مولوی اسماعیل دہلوی نے بھی وہی نام رکھے بلکہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوگی کہ کتاب اردو میں اور فصل کے نام عربی۔ شاید جلدی میں ناموں کا ترجمہ نہ کر سکے۔

(۳) نجدی نے اپنی کتاب میں کل ۲۶ آیات قرآنی تحریر کی تھیں، ان سے ۲۲ اسماعیل صاحب نے بھی اختیار کیں۔

(۴) جن آیات اور جن بیانوں سے نجدی نے ابتدا کی تھی، بالکل وہی طریقہ اسماعیل صاحب نے تقویۃ الایمان میں برقرار رکھا۔

(۵) اور انداز بیان میں بھی کہیں نجدی پر سبقت کہیں برابری اور کہیں کچھ کمی ہے۔

(۶) بعض بعض مقامات پر حیرت ناک حد تک لفظی یکسانیت بھی پائی جاتی ہے۔

ناظرین انصاف فرمائیں کہ اتنی مشابہتوں کے بعد بھی یہ کہنا کہ غلط ہے کہ تقویۃ الایمان کی اصل کتاب التوحید ہے؟ اور چوں کہ یہی مطلب لفظ ترجمہ بول کر ادا کیا گیا ہے، اس لیے جہالت اور دروغ گوئی سے کام لیا گیا؟۔

ناظرین سے ہماری گذارش ہے کہ حضرت زید صاحب کی کتاب مذکور میں ان کا اصل بیان ضرور پڑھا جاے، تاکہ یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاے کہ بیسویں صدی کے اجالے میں علماے اہل سنت لوگوں کی آنکھ میں دھول جھونک رہے ہیں یا رئیس صاحب جیتی مکھی نگل رہے ہیں۔

نجد و عراق:

محمد ابن عبد الوہاب نجدی کے جارحانہ عقائد، مفسدانہ تحریک، اور ظالمانہ اعمال نے پورے عالم اسلام میں ایک آگ لگا رکھی تھی۔ دنیاے اسلام کے اطراف و اکناف سے ۲۶ علماے اسلام نے ان کا رد تحریر کیا، خود ان کے بھائی علامہ سلیمان ابن عبد الوہاب نجدی نے بے حد مکمل و مدلل رد فرمایا۔ [کتاب مذکور، ص: ۳۲ تا ۳۴]

مکہ مکرمہ کے تمام علمائے کرام ہر چہار مذہب کے قاضی اور مفتی اور تمام دنیا سے آئے ہوئے حجاج علما نے ۷ محرم ۱۲۲۱ھ کو بوقت نماز عصر بالاتفاق نجدیوں کے کفر کا فتویٰ دیا اور ان کے ساتھ جہاد لازم گردانا۔ [کتاب مذکور ص: ۲۰، وفتنۂ وہابیہ]

اور ان پر آخری مہر مفتی دیار شام حضرت علامہ ابن عابدین نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب حاشیہ ردالمحتار میں لگائی۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

”كما وقع في زماننا في أتباع عبد الوهاب الذين خرجوا من نجد، وتغلبوا على الحرمين، واستباحوا بذلك قتل أهل السنة وقتل علمائهم، حتى كسر الله شوكتهم، وخرب بلادهم، وظفر عليهم عساكر المسلمين. عام ثلثة وثلثين ومأتين وألف.“

ہمارے زمانہ میں محمد ابن عبدالوہاب کے متبعین سے ایسا واقع ہوا کہ انہوں نے نجد سے خروج کیا، اور حرمین شریفین پر غالب آگئے، تمام اہل سنت اور انکے علما کے قتل کو حلال گردانا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی شوکت توڑی اور ان کے شہروں کو برباد کیا، اور ان پر اسلامی لشکر کو ۱۲۳۳ھ میں فتح دی۔

خود ہندوستان میں غیر مقلدین کے پشت پناہ نواب صدیق حسن خاں نے (ترجمان وہابیہ) دارالعلوم دیوبند کے دو سابق صدروں مولوی انور شاہ کشمیری (فیض الباری) اور مولوی حسین احمد (شہاب ثاقب) نے اور شیخ الہند خلیل احمد دیوبندی نے (تصدیقات) میں اس ظالم اور مفسد گروہ کی دل کھول کر مذمت کی۔ مختصر یہ کہ اس ظالم گروہ کی چیرہ دستیوں سے دنیا کی پوری کلمہ گو برادری تلملا اٹھی اور بقول سودا یہ حال ہو گیا کہ:

ناوک نے تیرا صید نہ چھوڑا زمانہ میں   تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

پورے عالم اسلام کے دلوں میں اس نوزائد فرقہ کے خلاف اس درجہ نفرت اور تحقیر بھر گئی کہ اہل اسلام سے ممتاز کرنے کے لیے ان کا ایک علاحدہ نام وہابی رکھا گیا۔

غور کیا جائے تو اس لفظ کے ظاہر و باطن میں کوئی خرابی نہیں، اور جس مقدس نسبت کا اس سے اظہار ہوتا ہے، وہ تو ایمان کی جان ہے، مگر اس نومولود فرقہ کی عملی اور اعتقادی آلودگیوں نے اس مبارک لفظ کو اس درجہ آلودہ کیا کہ پورے عالم اسلام میں اب یہ ایک گالی بن کر رہ گیا ہے، حد

یہ ہے کہ کسی بھی متبع ابن عبدالوہاب کو آپ اس لقب سے مخاطب کر کے دیکھ لیجیے تلملا اٹھے گا، اور ان لوگوں کے خلاف اول فول بکنے لگے گا، جنہوں نے اسے یہ خطاب دیا۔ حالاں کہ انہیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ خود لفظ میں کوئی غلاظت نہیں ہوتی۔ الفاظ کو غلیظ روپ دینے والا تو متعلق افراد کا کردار ہوتا ہے۔ دیکھیے لوط کا لفظ کس درجہ پیارا ہے لیکن متعلق قوم کے غلیظ کردار نے اس کو اس درجہ متاثر کیا کہ اس سے بنے ہوئے ایک لفظ کو شرفا زبان پر لانا بھی ناپسند کرتے ہیں، اسی طرح یہ لفظ وہابی بھی ایک سیدھا سادھا کلمہ ہے جس کو ابن عبدالوہاب اور ان کے متبعین کے ظالمانہ کردار نے آلودہ کر کے رکھ دیا ہے۔

الغرض جس قوم کے خلاف جمیع اہل اسلام کے دلوں میں اس درجہ نفرت بھری ہوئی تھی، ان کی گمراہیوں کو طشت از بام کرنے کے لیے علماے عرب و عجم نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، اور غالباً سب سے پہلے محمد ابن عبدالوہاب کے بھائی سلیمان ابن عبدالوہاب نے احادیث مبارکہ سے اس فرقہ کی ایک مکمل تصویر کھوج نکالی۔ چنانچہ وہ ان لوگوں کا مخاطب کر کے کہتے ہیں:

''اور جو چیز آپ کے مذہب کے باطل ہونے پر دلالت کرتی ہے صحیحین کی حدیث جو ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ کفر کا سر مشرق کی طرف ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ایمان یمنی ہے، اور فتنہ مشرق کی طرف ہے، جہاں سے شیطان کا سینگ نکلے گا۔ اور اسی میں ابن عمر سے کہ سرکار نے مشرق کی طرف رخ کر کے فرمایا: کہ فتنہ ادھر ہے۔ اور بخاری شریف میں یہ حدیث مرفوع کہ آپ نے دعا فرمائی، یا اللہ ہمارے شام اور یمن میں برکت دے۔ آپ نے دو دفعہ ایسا فرمایا تو کسی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمارے نجد کے لے بھی برکت ہو، تو تیسری بار بھی آپ نے شام و یمن کے لیے دعا کر کے فرمایا: وہاں زلزلے اور فتنے ہیں اور وہیں شیطان کا سینگ نکلے گا۔ اور امام احمد نے بھی ابن عمر سے مرفوعاً روایت کی: یا اللہ ہمارے مدینہ میں برکت دے۔ ہمارے ''صاع'' میں برکت دے، ہمارے ''مد'' میں برکت دے، ہمارے شام و یمن میں برکت دے، پھر مشرق کی طرف رخ کر کے فرمایا: وہاں شیطان کا سینگ نکلے گا، وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے۔ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ سچے ہیں۔ آپ نے امانت ادا کردی۔ رسالت پہونچادی۔ تقی الدین سبکی نے فرمایا: مدینہ سے پورب علاقہ مشرق ہی ہے جہاں قبیلہ بنو تمیم کا جھوٹا مدعی نبوت مسیلمہ کذاب نکلا۔ یہ سب سے پہلا فتنہ تھا جو رسول اللہ ﷺ

کے بعد مشرق سے ظہور پذیر ہوا۔ اور خلیفہ اول نے ان لوگوں سے جہاد کیا''۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ فتنہ حاضرہ شیخ محمد ابن عبدالوہاب کا دست راست امیر محمد بن سعود بھی مسیلمہ کذاب کے خاندان بنو حنیفہ کا تھا اور خود شیخ نجد بھی بنو تمیم ہی سے تھے۔

ان احادیث میں آپ کے مذہب کے بطلان کے بہت سے اشارے ہیں:

(۱) آپ ﷺ نے بار بار ایمان کو یمنی بتایا۔ اور مشرق کو فتنہ گاہ بتایا اور آپ لوگ فتنہ بھی ہیں اور مشرقی بھی ہیں۔

(۲) حضور ﷺ نے حجاز اور اہل حجاز کے لیے بار بار دعا فرمائی اور ''مامن فتنہ'' ہونے کی وجہ سے مشرق خصوصاً نجد کے لیے دعا سے انکار کیا۔ (تو حضور ﷺ کی دعا سے اہل نجد کی محرومی معمولی محرومی نہیں ہے۔ اور مختلف اسلامی علاقہ میں سے خاص اس علاقہ کو کفر وفتنہ کی آماجگاہ کی حیثیت سے منتخب کرنا۔ اور اس نشان دہی کے بعد آپ لوگوں کا اہل حجاز، اہل یمن کو کافر کہنا۔ ضرور رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی کی تصدیق ہے۔)

[الصواعق الالہیہ، ص: ۴۳۔۴۴]

احادیث کریمہ کے اس تعارف کے بعد نجدی تحریک اور اس کے شیخ کی جو بھیانک تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے، اہل نظر پر مخفی نہیں، اور اس صورت حال سے نجدی صف میں اضطراب بھی ایک امر واضح ہے، اس لیے اپنے شیخ سے شیطان کا سینگ ہونے کا الزام دور کرنے کے لیے پوری جماعت نے ان حدیثوں میں طرح طرح کی تاویلیں کیں۔ چنانچہ بعض وہابیوں کا خیال ہے:

(۱) رسول اللہ ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر مشرق کی طرف ہاتھ اٹھایا، منبر سے ٹھیک مشرق کی طرف حجرۂ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہے۔ اس لیے اشارہ اسی طرف ہوا، اور زلزلوں اور فتنوں سے مراد ام المؤمنین کا وہ اقدام ہے، جو جنگ جمل میں ہوا۔

معاذ اللہ اس دریدہ دہن نے اپنے شیخ کی حمایت میں آرام گاہ رسول کو بھی نہیں چھوڑا، اہل بیت طاہر اور السیدۃ والنقیۃ الزاہدہ ام المؤمنین صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بھی نہیں بخشا۔

اس آلودۂ فطرت کو یہ بھی نظر نہیں آیا کہ حدیث شریف میں فرمایا: کفر کا سر مشرق کی طرف ہے۔ تو کیا اس گندہ ذہن کے نزدیک ام المؤمنین کا یہ اقدام کفر ہے۔

اس نے یہ بھی تو نہیں دیکھا کہ حضورﷺ نے صرف مشرق کا ہی ذکر نہیں کیا ہے، شام اور یمن اور مدینہ کے لیے برکت کی دعا بھی کی ہے، تو کیا رسول اللہﷺ کے نزدیک سارا مدینہ تو قابل برکت تھا اور خود آپ کا گھر اس سے خالی تھا، جب کہ اہل بیت کے لیے خود ہمیشہ اور امت کو بھی قیامت تک دعاے برکت کے لیے حکم فرما گئے: **اللھم بارک علی محمد وعلی آله محمد۔**

اور اس کو یہ بھی تو نظر نہیں آیا کہ حضورﷺ کا یہ اشارہ ایک سوال کے جواب میں تھا جس میں اہل نجد کے لیے دعا برکت کی درخواست کی گئی تھی، اور آپ نے اسی سوال کے جواب میں فرمایا: وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے، وہاں شیطان کا سینگ ہوگا۔ تو جب سوال نجد سے تھا تو جواب حجرے کے لیے کیسے ہوگیا؟ یہ ایک عام اصول ہے۔ **السوال معاد في السوال. وسيعلم الذين ظلموا أى منقلب ينقلبون.**

(۲) بعض نے کہا حضورﷺ نے مشرق کی طرف اشارہ کیا، نجد مدینہ کے مشرق میں نہیں ہے، ٹھیک مشرق میں تو عراق ہے۔ اور بلاشبہ عراق سے قتل اہل بیت کا فتنہ عظیم برپا ہوا، مجھے خوب یاد ہے کہ میرے زمانہ طالب علمی میں الفقیہ امرتسر میں مدتوں یہ بحثیں چلیں۔

اس تاویل کے موجد نے بھی اپنی عقیدت کے جوش میں احادیث کریمہ کی روایت سے قطع نظر کرلیا، ورنہ عام مسلمانوں کی طرح وہ بھی دیکھتے کہ رسول اللہﷺ نے ایک طرف تو دست گرامی کے اشارہ سے اس فتنے کی سمت متعین کی اور دوسری طرف زبان مبارک سے نام لے کر مخصوص جگہ کی تعین بھی کردی۔

پھر یہ امر بھی خلاف واقعہ ہے کہ نجد مدینہ شریف سے مشرق کی طرف نہیں ہے، اس کی تکذیب جزیرۃ العرب کا جغرافیہ کررہا ہے۔

(۳) ان دونوں تاویلوں کی سخافت سے شرمندہ ہوکر بعض نے یہ تاویل کی:

"صحیح حدیث میں نجد کا لفظ آیا ہے مگر اس سے مراد نجد کے اصطلاحی معنی (عرب کا ایک خاص صوبہ) نہیں، بلکہ لغوی معنی سطح مرتفع مراد ہے، عرب میں نجد کے لفظ سے حجاز کے مقابل وہ بالائی حصہ مراد لیا جاتا ہے جو عراق تک چلا جاتا ہے۔ اس لیے حدیث شریف میں لفظ نجد سے بلند زمین مراد ہے۔ اور وہ عراق ہے، اور وہیں زلزلے اور فتنے پیدا ہوے اور بعض نے تو یہ زیادتی

کی کہ کوفہ کے علم واجتہاد کو فتنہ قرار دے دیا۔ لعنة الله على الكاذبين۔

لیکن یہ تاویل بھی سابقہ تاویلوں کی طرح مردود نامقبول ہے۔ اولاً حدیث میں شام ویمن کے الفاظ ہیں، اور ایک روایت میں مدینہ کا ذکر بھی ہے۔ تو کیا ان الفاظ کا بھی ترجمہ ہی مراد لیا جائے گا اور اصطلاحی معنی مراد نہ ہوں گے، اگر حدیث میں ان الفاظ سے وہ خاص مقامات مراد ہیں جن کے ساتھ وہ مشہور ہیں تو لفظ نجد سے وہ خاص علاقہ کیوں مراد نہ ہوگا جو اسی نام کے ساتھ معروف ومشہور ہے۔ یہ کیا زیادتی ہے، ابن سعود خود اپنے کو امیر نجد کہے۔ تو اس سے مراد صوبہ نجد ہوا، ساری دنیا ابن عبدالوہاب کو شیخ نجدی کہے تو اس سے مراد صوبہ نجد ہوگا، اور حدیث شریف میں یہی نجد کا لفظ آ گیا تو وہاں صوبہ نجد نہیں بلکہ اونچی زمین مراد ہے؟۔

ثانیاً:۔ لغوی معنی مراد لے کر زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ نجد کی وسعت میں عراق بھی شامل ہو گیا۔ خود نجد لغوی معنی سے نکل گیا، اس پر کیا دلیل؟ کیا نجد اس بالائی حصہ میں شامل نہیں جس میں عراق کو زبردستی لغوی معنی کا سہارا لے کر داخل کیا گیا ہے۔ عرب کے جغرافیہ طبعی میں تو یہ تین قسمیں بتائی گئی ہیں: ''تہامہ'' ترائی کا علاقہ ''نجد'' بالائی حصہ ''حجاز'' ان دونوں کے درمیان کا حصہ۔ تو گویا نجد کی وجہ تسمیہ یہی ہے کہ یہ تہامہ کے مقابلہ میں جزیرہ کا بالائی حصہ ہے، پھر یہ عراق کے نجد میں شامل ہونے کے بعد خود کیسے نکل جائے گا؟ اس تاویل سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوئی وہ یہ ہے کہ نجد کی طرح عراق بھی فتنوں اور زلزلوں کی زمین ہے۔ اور اس سے کسی کو انکار نہیں۔

الغرض تاویل کے سلسلہ میں ہوا خواہان نجد کی ساری درازلسانیاں رائگاں ہی گئیں، اور بات کچھ بگڑی ہے ایسی کہ بنائے نہ بننے والا معاملہ ہے۔ اور دنیا نے دیکھ لیا کہ فتنہ دجال اور فتنہ خوارج کی طرح فتنہ نجد بھی ایک نامزد گمراہی ہے۔ کہ خود زبان نبوت نے ہی جس کا حال بیان کر دیا ہے۔

مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے بھی کہیں وہی حدیث نجد لکھ دی تھی۔ اس پر مولوی رئیس احمد صاحب کو ایسا طرارہ آیا کہ آپ نے ایک عنوان قائم کر دیا ''عراق ونجد کی بحث'' اور ایک حدیث فتح الباری سے نقل کی، صحابہ نے عراق کے لیے دعا کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا: نہیں وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے۔ اور اخیر میں ٹیپ کا بند لگایا کہ اہل علم حدیث میں

آے ہوے لفظ نجد سے عراق مراد لیتے ہیں اور یہی صحیح ہے''۔

سبحان اللہ یہی کیوں صحیح ہے۔ صحیح ہونے کے دلائل کیا ہیں؟ یا صرف اس لیے صحیح ہے کہ آپ نے کہہ دیا، کہ ع: مستند ہے میرا فرمایا ہوا، یا اس لیے صحیح ہے کہ آپکے شیخ کے چہرے کی سیاہی اس سے ڈھل رہی ہے۔ وہ کون اہل علم ہیں جو خلاف قرینہ لفظ نجد سے عراق مراد لے رہے ہیں، علماے اسلام نے تو ان احادیث سے بھی جس میں نجد کا لفظ نہیں آیا ہے صرف مشرق کا ہی لفظ ہے، اسی لفظ سے نجد اور شیخ نجد ہی مراد لیا ہے۔

حضرت سلیمان ابن عبدالوہاب نجدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تقریر اوپر گزری، حضرت علامہ احمد بن زینی دحلان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا بیان سنیے:

''رسول اللہ ﷺ نے ان خوارج کی خبر متعدد حدیثوں میں دی ہے، اور یہ حدیثیں اخبار بالغیب ہونے کی وجہ سے دلائل نبوت میں شمار ہوں گی۔ حدیثیں سب صحیح ہیں کچھ تو صحیح بخاری و مسلم میں ہیں اور کچھ دوسری کتابوں میں ہیں''۔

(۱) رسول اللہ ﷺ نے مشرق کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: فتنہ یہاں سے ہوگا۔

(۲) حضور ﷺ نے فرمایا: کچھ لوگ مشرق سے خروج کریں گے، وہ قرآن پڑھیں گے جو ان کے حلق کے نیچے نہیں اترے گا، وہ دین سے ایسے ہی نکل جائیں گے، جیسے تیر نشانہ سے، وہ دین میں لوٹیں گے بھی نہیں تا آں کہ تیر اپنے فوق کی طرف لوٹے، ان کی علامت یہ ہوگی کہ وہ سر گھٹائیں گے۔

(۳) میری امت میں اختلاف وجدائی ہوگی، کچھ لوگ ہوں گے کہ باتیں اچھی کریں گے عمل ان کا خراب ہوگا، ان کا ایمان حلق کے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ دین میں واپس نہ ہوں گے چاہے تیر اپنے فوق کی طرف لوٹے، وہ ساری مخلوق سے برے ہوں گے، جس کو وہ قتل کریں گے اس کے لیے خوش خبری اور جو انہیں قتل کرے اس کے لیے بھی خوش خبری، وہ کتاب اللہ کی طرف بلائیں گے مگر اس پر خود عمل نہیں کریں گے، جو انہیں قتل کرے وہ خدا کا قریبی ہوگا۔ ان کی نشانی سر گھٹانا ہوگی۔

اس کے بعد تین حدیثیں اس مضمون کی نقل کی ہیں:

(۴) حضور ﷺ نے فرمایا: کفر کی جڑ مشرق کی طرف ہے، اور فخر اور تکبر گھوڑا پالنے

والوں میں ہے۔

(۵) حضور ﷺ نے فرمایا: مشرق کی طرف سے فتنے آئیں گے۔

اس کے بعد نجد والی حدیث روایت کی:

(۶) حضور ﷺ نے فرمایا: سخت دلی اور ظلم مشرق میں ہے اور ایمان اہل حجاز میں ہے۔

(۷) حضور ﷺ نے فرمایا: کچھ لوگ مشرق کی طرف سے نکلیں گے قرآن ان کے حلق کے نیچے نہیں اترے گا۔ حالاں کہ ہر دم پڑھیں گے، ان کی جب ایک نسل ختم ہوگی تو دوسری ان کی جگہ لے گی۔ ان کی آخری جماعت دجال کی ساتھی ہوگی۔

حضور ﷺ نے ان کی یہ علامت جو بیان کی ہے کہ وہ سر گھٹائیں گے۔ یہ وہابیوں کے علاوہ کسی گمراہ فرقہ میں نہیں پائی جاتی کہ انہیں کو اس پر اصرار تھا، اور ان کی جماعت میں داخل ہونے والے فوراً سر گھٹانے پر مجبور کرتے، یہ حدیث ان کے بارے میں صریح پیش گوئی ہے۔ اس لیے سید عبد الرحمٰن اہدل مفتی زبیدہ فرماتے ہیں کہ ان کے رد میں کتاب لکھنے کی ضرورت ہی نہیں، کیوں کہ یہ حدیث ہی ان کے رد کے لیے کافی ہے۔

[الدرر السنیہ، ص:۴۹۔۵۰]

دیکھیے ان گیارہ حدیثوں میں صرف ایک میں نجد کا لفظ ہے، بقیہ بیشتر حدیثوں میں صرف مشرق کا لفظ ہے، اور ان سب حدیثوں کو حضرت علامہ زینی دحلان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ابن عبد الوہاب اور ان کے کارناموں کے بارے میں پیش گوئی قرار دے رہے ہیں۔ پس رئیس صاحب کا خاص لفظ نجد کے بارے میں عقل و نقل کے خلاف حیلہ حوالہ کرنا ان کے شیخ کے لیے کیا مفید ہوگا؟۔

قصہ اصل یہ ہے کہ صوبہ نجد کی ایک وادی حنیفہ اور وہاں کے قبائل بنو تمیم اور حُنیفہ عہد رسالت سے ہی اسلام کے لیے فتنوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے، ذوالخویصرہ مشہور منافق نجد کے قبیلہ بنو تمیم ہی سے تھا۔ مدعی نبوت مسیلمہ کذاب اور منکرین زکاۃ کا فتنہ وادی حُنیفہ کے خاص مقام عیینہ سے بپا ہوا۔ اب گیارہ سو سال کے بعد ابن عبد الوہاب بھی اسی صوبہ نجد اسی مخصوص وادی بلکہ مسیلمہ کذاب کی جائے پیدائش مقام عیینہ سے اٹھا۔ تو لامحالہ علمائے اسلام کا ذہن ان احادیث اور پیشین گوئیوں کی طرف جانا ایک فطری امر تھا، جو زبان نبوت سے اس علاقہ اور اس

قوم کے بارے میں بیان ہو چکی تھیں۔

اب رئیس صاحب اور ان کے ہم مذہبوں کا اس کے خلاف واویلا بے کار و عبث ہے۔ وہ بے چارے کس کس چیز کی تاویل کریں گے۔ ان کے لیے رسول اللہ ﷺ نے بنو تمیم اور ذوالخویصرہ کی قوم سے ہونے کا ذکر کیا، ابن عبدالوہاب بنو تمیم سے ہیں، ان کے لیے رسول اللہ ﷺ نے مشرقی ہونے کی علامت قرار دی، یہ مشرقی بھی ہیں، حضور ﷺ نے ان کے لیے نجدی ہونے کی بات کہی، یہ خود اپنے منہ سے اپنے کو نجدی کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے سر گھٹانا ان کا شعار بتایا۔ یہ وہابی عورتوں کے بھی سر گھٹانے پر اصرار کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فسادی قرار دیا۔ بلاشبہ صرف اور صرف اسلام کے خون سے ان کے دامن رنگین ہیں۔

پس رئیس صاحب سے ہماری گزارش ہے کہ صبر فرمائیں، خود زبان نبوت نے ہی شیخ نجدی کی قسمت پر مہر لگا دی۔

زآب کوثر زمزم سفید نتواں کرد گلیم بخت کسے را کہ بافتند سیاہ

رئیس صاحب نے ایک بات اور بھی کہی ہے:

"کیا بریلویوں کے نزدیک جس طرح نجدی ہونے کی بنا پر شیخ الاسلام محمد ابن عبد الوہاب مستحق طعن و تشنیع ہیں اسی طرح عراقی ہونے کے سبب امام اعظم ابو حنیفہ اور شیخ عبد القادر جیلانی بھی مستحق طعن و تشنیع ہوں گے۔" [ابطال، ص:۱۲]

ہماری گزارش ہے کہ ہم سارے نجدیوں کو کہاں مورد لعن و طعن قرار دیتے ہیں، اور احادیث نبوی کا مورد گردانتے ہیں، آخر شیخ نجدی کے والد عبدالوہاب نجدی کو رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ان کے بھائی سلیمان بن عبدالوہاب کو ایک راسخ العقیدہ عالم دین کہہ کر ہم لوگ ہی یاد کرتے ہیں۔ ابن عبدالوہاب کا انتخاب تو ان کی ذاتی خصوصیات کی وجہ سے ہوا ہے۔، جس طرح عراق کی پیش گوئیوں کے مورد ابن سعد، شمر ذی الجوشن اور مختار ابن عبید بھی اپنے غلط کارناموں کی وجہ سے قرار دیے گئے۔

پس آپ کا الزام تو جب صحیح ہوتا کہ نجدی ہونے کے ناطے یک لخت تمام باشندگان نجد کو ہم مورد طعن گردانتے، رئیس صاحب! جس طرح لفظ وہابی بے حد مبارک لفظ ہے، لیکن ابن

عبدالوہاب نے اس کی مٹی پلید کی، اسی طرح نجد کی مٹی کا کوئی قصور نہیں یہ درگت تو آپ کے شیخ کی بدولت ہوئی ہے۔

ابلیس کی طرف سے ایک غلط توجیہ:

ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو کیوں سجدہ نہیں کیا، قرآن نے اس بارے میں ایک جگہ فرمایا: ﴿أبیٰ واستکبر﴾ [البقرة: س ۲. ت ۳۴]

شیطان نے سجدہ سے انکار کیا اور تکبر کیا۔

دوسری جگہ قرآن عظیم میں آیا:

﴿قَالَ لَمْ أَكُن لِّأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ﴾ [الحجر: س ۱۵. ت ۳۳]

میں آدمی کو سجدہ نہیں کروں گا جو کھنکھناتی مٹی سے بنایا گیا۔

مولوی عتیق الرحمٰن صاحب نے ''خیر الانبیا'' میں تحریر کیا کہ شیطان نے اس دلیل سے کہ غیر خدا کو سجدہ جائز نہیں سجدہ صرف اللہ کے لیے ہے، آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔

مولوی رئیس صاحب نے خیر الانبیاء کے اس بیان کو رد کرنے کے لیے مذکورہ بالا عنوان قائم کیا، عنوان میں تو اس توجیہ کو غلط کہا۔ اور تفصیل میں ایک زینہ نیچے اترے کہ یہ قرآنی تصریح کے خلاف ہے، حالاں کہ نہ تو یہ غلط ہے نہ قرآنی تصریح کے خلاف ہے، غلط تو اس لیے نہیں کہ یہی توجیہ شیطان کی طرف حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی منسوب کی ہے۔ تذکرۃ الاولیاء للعطاری میں ہے:

''آپ (حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ) کی ملاقات مسجد کے دروازہ پر ایک معمر شخص کی صورت میں ابلیس سے ہوگئی، تو آپ نے سوال کیا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کی کیا وجہ تھی، اس نے جواب دیا غیر اللہ کو سجدہ کب روا ہے، اس جواب سے آپ حیرت زدہ ہو گئے غیبی آواز آئی اس سے کہہ دو تو کاذب ہے، کیوں کہ بندے کو مالک کے حکم سے انحراف کی اجازت نہیں۔ [تذکرۃ الاولیاء ص: ۱۹۵۔ تذکرۃ جنید بغدادی]

ہماری گزارش یہ ہے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے پورے عالم اسلام کے ایک مسلمہ بزرگ نے یہی توجیہ بیان فرمائی، آج مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے اسی کو تحریر فرمادیا تو یہ بات

غلط کس طرح ہوئی؟ ہاں رئیس صاحب سے یہ بھی بعید نہیں ہے کہ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ کو جھٹ سے بریلوی کہہ دیں۔

اور خلاف قرآن اس لیے نہیں کہ قرآن میں کہیں نہیں ہے کہ تکبر کے علاوہ اور کوئی وجہ نہ تھی۔ بالفرض اگر کوئی اور وجہ قرآن میں مذکور نہ ہوتی تب بھی عدم ذکر ذکر عدم کو مستلزم نہیں اور یہاں تو دوسری آیت میں جو وجہ مذکور ہے اس سے صاف یہی مفہوم ہو رہا ہے کہ انکار سجدہ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے آدم علیہ السلام کو اس لیے سجدہ نہیں کیا کہ وہ خدا نہیں تھے۔ چناں چہ ارشاد باری ہے:

﴿لَمْ أَكُن لِّأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِن صَلْصَالٍ﴾

[الحجر: س ۱۵۔ ت ۳۳]

میں کھنکتی مٹی سے پیدا کیے ہوئے بشر کو سجدہ نہیں کروں گا۔

اس آیت نے انکار سجدہ کو دو وصفوں پر محمول کیا ہے، پس بطور مفہوم مخالف اس کا یہ مطلب ضرور ہوگا کہ میں بشر کو نہیں خدا کو سجدہ کروں گا، اور یہ وہی شیطانی توحید ہے جس کا ذکر حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا اور جس کو مولوی عتیق الرحمٰن صاحب نے بیان کیا، لیکن ہمارے رئیس صاحب کی بیماری یہ ہے کہ انہیں پڑھنے لکھنے سے کم مطلب ہے بریلویوں پر لعن طعن اور سب وشتم سے زیادہ غرض ہے۔ اسی سلسلہ میں دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ:

یہ بات کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ جس طرح ابلیس نے مٹی کے بنے ہوئے بشر کو ذلیل سمجھا اسی طرح بریلویوں کا بھی عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام بالخصوص خاتم المرسلین کو بشر کہنے سے ان کی تحقیر اور تذلیل ہوتی ہے۔ [ابطال، ص: ۱۴]

اس مسئلہ میں بھی رئیس صاحب سے گذارش ہے کہ: ع

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

اتنا تو سب جانتے ہیں کہ وعظ و نصیحت کے وقت اگر کوئی بات کسی صحابی کے سمجھ میں نہ آتی تو عرض کرتا: راعنا یا رسول اللہ اے اللہ کے رسول ہماری رعایت کیجیے، یہودیوں نے یہی کلمہ سرکار کی توہین کی نیت سے کہنا شروع کیا تو حکم قرآنی ہوا:

﴿لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾

[البقرۃ: س ۲. ت ۱۰۴]

اے مسلمانوں تم راعنا مت کہو انظرنا کہواور سنو کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

مقام غور ہے کہ راعنا کا لفظ تو فی الحقیقت درست ہی تھا لیکن ایک ملعون قوم نے اس لفظ سے توہین مراد لی، تو رسول اللہ ﷺ کے لیے اس لفظ کے بولنے کی ممانعت آسمان سے اتری۔

پس اسی طرح بشر کا لفظ فی الحقیقت گولا کھ توہین کا کلمہ نہ ہو، لیکن ایک شقی ازلی نے جب اس کو بول کر پیغمبر کی تحقیر کی تو پھر اس لفظ کا استعمال پیغمبروں کے لیے اگر بریلوی منع کرتے ہیں تو کیا برا کرتے ہیں۔ یہ تو سنت الٰہیہ ہے کہ صحیح لفظ سے بھی اگر کوئی توہین کا ایہام کرے تو اس لفظ کا استعمال مطلقاً منع ہو جاتا ہے۔

نیز رئیس صاحب کی یہ بھی عجیب دھاندلی ہے کہ جو چیز طبیعت کے خلاف ہو اس کو بریلویوں کے سر تھوپ دیا جاے، کیوں کہ رئیس صاحب کے نزدیک شاید مولانا روم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی بریلوی ہی تھے جو اپنی مثنوی میں فرماتے ہیں:

گفت ما اینک بشر ایشاں بشر — کہنے لگے ہم بھی بشر اور رسول بھی بشر ہیں

ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور — ہم دونوں ہی خوراک اور خواب کے پابند ہیں

ایں نہ دانستند کوراں از عمیٰ — اور اندھوں کو یہ نہ معلوم ہو سکا،

ہست فرقے درمیاں بے منتہا — کہ نبی اور امتی میں بے شمار فرق ہے

جس سے معلوم ہوا کہ مولانا روم کے نزدیک بھی رسولوں کو اپنے جیسا بشر کہنا اندھوں کا کام ہے۔ آنکھ کے اندھے نہ ہوں لیکن بقول مولانا روم دل کے اندھے ضرور ہیں۔ واضح ہو کہ مولانا روم اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمہما اللہ تعالیٰ میں صدیوں کا فاصلہ ہے، پھر بھی رئیس صاحب کو یہی نظر آتا ہے کہ پیغمبروں پر بشر کے اطلاق کو برا سمجھنا بریلویوں کا عقیدہ ہے۔

علم الکتابتہ:

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب ''الافاضات الملکیہ'' میں فرماتے ہیں:

ہندوستانی وہابیہ کے شبہات میں سے ایک شبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن عظیم میں فرمایا: جولوگ نبی امی کی اتباع کرتے ہیں اور امی اس کو کہتے ہیں جو کتابت، اور نقوش اور خطوط وحساب کو نہ جانے۔

چناں چہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ تمہارے نبی امی ہیں جو نہ لکھتے تھے نہ پڑھتے تھے، اور کتابت بے شک علم شہادۃ سے ہے۔ اور اس کی انواع واقسام بھی بے شمار ہیں، تو رسول اللہ ﷺ شہادت کے تمام افراد کے عالم نہ ہوے۔

''میں جواب دوں گا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے لیے فن کتابت کے ملکہ کا دعویٰ نہیں کیا، ہم نے تو عدم علم کتابت کا دعویٰ کیا ہے۔ یعنی حضور ﷺ کو لکھنے کی مشق نہیں تھی، لیکن یہ جانتے تھے کہ کس طرح لکھا جاتا ہے''۔ جیسا کہ قاضی عیاض نے شفا میں تحریر کیا، حضور لکھتے نہیں تھے مگر علم ہر چیز کا آپ کو دیا گیا تھا، جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ حروف پہچانتے تھے اور تحریر کے کمال کا علم رکھتے تھے۔

اور اس مضمون پر دس حدیثیں نقل فرمائی ہیں:

(۱)((ابن شعبان عن طريق ابن عباس أنه قال لا تمدوا بسم الله الرحمن الرحيم)) (الشفاء: ۱/۲۰۷)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو لمبا کھینچ کر نہ لکھو۔

(۲)((عن معاوية رضي الله عنه أنه كان يكتب بين يديه ﷺ فقال له: ألق الدوات، وحرف القلم، وأتم الباء، وفرق السين، وتعور الميم، وحسن الله، وحد الرحمن، وجود الرحيم. أخرج الديلمي في مسند الفردوس))

(الشفاء: ۱/۲۰۷)

(۳)((عن أنس رضي الله عنه عن النبي ﷺ: إذا كتب أحدكم بسم الله الرحمن الرحيم فليمد الرحمن)) (كنز العمال: ۲۹۲۸۵)

(۴)((عن زيد بن ثابت عن النبي ﷺ إذا كتبت فبين السين في بسم الله الرحمن الرحيم)). الديلمي في مسند الفردوس (كنز العمال: ۲۹۲۸۶)

یہ چاروں حدیثیں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے متعلق ہیں۔

(۵)((عن سهل ابن الحنظلة رضى الله عنهما أن النبي ﷺ أمر معاوية أن يكتب للأقرع وعيينه، فقال عيينة: أتراني أذهب بصحيفة المتلمس فأخذ رسول الله ﷺ الصحيفة فنظر فيها فقال: قد كتب لک بما أمر)).

(ابن ابی شیبه) (فتح الباری:۷/۵۰۴)

حضور ﷺ نے اقرع اور عیینہ کے لیے حضرت امیر معاویہ کو ایک تحریر لکھنے کا حکم دیا، تحریر تیار ہو گئی تو عیینہ نے کہا میں ذرا اس کو رسول اللہ ﷺ کو دکھالوں، آپ نے وہ تحریر ملاحظہ فرما کر ارشاد فرمایا: جس جس امر کے بارے میں ان سے کہا گیا تھا لکھ دیا۔

(٦)((عن أنس ابن مالک رضى الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: رأيت ليلة أسرى بي على باب الجنة مكتوباً الصدقة بعشر أمثالها، والقرض بثمانية عشر)) (ترمذی، ابن ماجه، ابن ابی حاتم وابن مردويه)

(کنزالعمال:۷ ۱۵۳)

حضرت انس کہتے ہیں کہ میں نے معراج کی رات جنت کے دروازے پر یہ لکھا دیکھا کہ صدقہ کا ثواب دس گنا اور قرض کا اٹھارہ۔

(۷)"عن أبي الحمراء رضى الله عنها قال: قال رسول الله ﷺ: لما أسرى بي إلى السماء السابعة فإذا على ساق العرش الأيمن لا إله إلا الله محمد رسول الله.[طبرانی، ابن قانع، ابن مردویه]

(کنزالعمال: ۱۱/۳۲۰۳۸)

عرش کے دائیں ساق پر لا اله الا الله محمد رسول الله لکھا دیکھا۔

بقیہ تین حدیثیں بھی ساق عرش پر کلمہ اور اصحاب اربعہ کے اسماء کی تحریر سے متعلق ہیں، اور قاضی ابوالولید باجی کا قول بھی نقل کیا کہ آپ کو بطور معجزہ کتابت آتی تھی، جیسا کہ بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر اپنا اسم گرامی اپنے دست گرامی سے تحریر کر دیا۔

اس اقتباس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں:

(۱) حدیث صلح حدیبیہ مدعیان حاضر وناظر نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں بطور دلیل نہیں پیش کی ہے، بلکہ یہ ان لوگوں کے جواب میں بطور معارضہ پیش کی گئی ہے جو یہ کہتے تھے کہ

آپ امی ہیں، لہذا لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔

(۲) حضور ﷺ کتابت سے آگاہ ہونے (ملکہ نہیں) پر صرف یہی ایک حدیث نہیں خود مولانا احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دس حدیثیں نقل کیں۔

اس تفصیل کے بعد اب رئیس صاحب کی چابک دستیاں ملاحظہ ہوں: آیت مبارکہ: ﴿وما کنت تتلوا من الکتاب ولا تخطه بیمینه.﴾ (نزول قرآن سے قبل آپ نہ تو کوئی کتاب پڑھتے تھے نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے) نقل کر کے لکھتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ نبوت سے پہلے جو شخص آپ کو فن قرأت وکتابت کا عالم بتاتے ہیں وہ قرآن کا منکر ہے۔

[ابطال، ص:۶۲]

''انوکھے دلائل'' کے عنوان کے تحت ہم بتا آئے ہیں کہ نہ کوئی اس کا مدعی ہے نہ کسی نے دعویٰ کیا، رئیس صاحب نے خود ہی بریلویوں کا یہ موقف تیار کیا اور خود ہی اس پر چاند ماری شروع کی اور بقول شاعر:

خود کوزہ خود کوزہ گر و خود گل کوزہ   خود بر سر آں کوزہ خریدار بر آمد

آگے ازالہ وہم کا عنوان قائم کر کے فرماتے ہیں:

''بعض بریلوی کہہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر ایک لفظ لکھ دیا تھا، اس لیے ثابت ہوا کہ آپ نبوت پانے سے پہلے بھی کاتب اور قاری تھے، یہ عجیب طرز استدلال ہے کہ نبوت کے اٹھارہویں انیسویں سال ایک حرف لکھنے کا ثبوت ہے، اور اس سے استدلال ہے کہ آدم وحوا کے وجود سے پہلے آپ حاضر وناظر تھے''۔

[ابطال، ص:۶۲]

کس نے استدلال کیا؟ کب استدلال کیا؟ یا آپ کے کان آپ ہی بجنے لگے، بندۂ خدا حدیث استدلال میں پیش ہی نہیں کی گئی ہے، یہ تو ایک شبہ کا جواب ہے جو آپ کے بزرگوں کو لاحق ہوا تھا۔ شبہ یہ تھا کہ آپ امی تھے، لہذا لکھنے کا آپ کو علم نہ تھا، جواب ہے کہ لکھتے تو آپ بے شک نہ تھے لیکن علم آپ کو ضرور تھا، بلکہ باجی کہتے ہیں کہ بطور معجزہ آپ لکھتے بھی تھے، مگر آپ پر بریلویت کے تصور سے ہی ایسی وحشت سوار ہوتی ہے کہ آپ از خود رفتہ ہو جاتے ہیں، ہمیں نہایت افسوس ہے کہ رئیس صاحب نے مصنف بن کر قرطاس قلم کی مٹی پلید کی ہے۔ آپ فرماتے

ہیں:

پھر زمانہ رسالت میں ایک لفظ لکھ دینے کے قائل صرف باجی نامی ایک صاحب علم ہیں، جو اسے ایک معجزہ قرار دیتے ہیں۔ [ابطال، ص:۶۳]

اب ہم سے آپ رئیس صاحب کی اس بانگ بے ہنگام کی حقیقت سنیئے:

ابوالولید باجی ساتھ ان کے دو استاذ ابو ذر ہروی مالکی اور فقیہ ابو جعفر سمنانی حنفی بھی ہیں، محدث ابو فتح نیشاپوری اور پانچویں صدی ہجری کے افریقہ اور ثقلیہ کے دوسرے علماء بھی ہیں۔ یہی ابن جوزی حنبلی اور امام قرطبی مالکی کا مسلک ہے۔ اور ملا علی قاری مکی، امام طیبی شیخ محقق کا رجحان اسی طرف ہے۔ امام نووی نے اسی کو ثابت رکھا۔ اور قاضی عیاض نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ اور امام بخاری کے ہم عصر ابن شیبہ کا یہی قول ہے۔ دو تابعی امام یونس، ابن میسرہ اور عون ابن عبداللہ اور عامر شعبی کا یہی قول ہے۔ مگر ہمارے رئیس صاحب کی بینائی کی داد دیجیے کہ انہیں صرف ابوالولید باجی نظر آرہے ہیں (لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم) آپ کو حیرت ہوگی کہ رئیس صاحب کو اپنا کہا بھی یاد نہیں رہتا۔ یہاں تو یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ صرف باجی کا قول ہے اور پانچ سطر بعد کہتے ہیں کہ فقہا نے باجی اور ان کے ہم خیالوں پر شدید نکیر کی'' یہ پانچ سطر بعد قاضی باجی کے ہم خیال کہاں سے نکل آئے۔ سچ ہے دروغ گو را حافظہ نہ باشد۔

پھر آپ نے باجی کا جو قول بتایا وہ بھی تحقیق کے خلاف ہے، اعلیٰ حضرت تحریر فرماتے ہیں:

''ان القائلين بصدور الكتابة عنه ﷺ اذ ذاک تفرقوا فيها بينهم على أربعة أقوال: أحدها قول الباجي أنه ﷺ صار يحسن الكتابة كلها بإقدار ربه من دون أن تعلم من أحد. ثانيها كان يحسن وضع الاسم ككثير من الملوك، ثالثها إنما أحسن رسم الاسم في هذا الوقت خاصة. رابعها بل أجرى الله تعالىٰ أدامها الشريفة حتى صورت الاسم من دون قصد منه ﷺ.''

[الدولۃ المکیہ، ص:۲۳۸]

صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور ﷺ کی بنفس نفیس تحریر اسم کے قائل علما کے چار قول ہیں:

(۱) حضور ﷺ ہر طرح کی کتابت پر بطور معجزہ قدرت رکھتے، یہ باجی کا قول ہے۔

(۲) بہت سے بادشاہوں کی طرح صرف اپنا دستخط کر پاتے تھے، اس قائل کا پتہ نہیں چلا۔

(۳) صرف اسی موقع پر آپ کو اس کی قدرت ہوئی، یہ عمران ابن شیبہ کا قول ہے۔

(۴) بے قصد و ارادہ اللہ پاک نے حضور سے اسم پاک لکھوا دیا۔ یہ سمنانی اور جوزی کا قول ہے۔

غالب نے کسی ایسے ہی جنگ جو کے بارے میں کہا تھا:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے اسد لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

کنت نبیاً و آدم بین الماء و الطین:

اگر غور سے دیکھا جائے تو کتاب ابطال کا بیشتر حصہ رئیس صاحب کی اس بدخوابی کی صدائے بازگشت ہے، کہ بریلوی رسول اللہ ﷺ کو حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہی ''حاضر وناظر'' مانتے ہیں، اور جہاں کہیں کچھ اور بدخیالیاں بھی شامل ہوگئی ہیں، منظر اور ہیبت ناک ہوگیا ہے۔ اس قسم کا ایک مقام ابطال ص: ۲۵ پر بھی ہے:

(۱) بریلویوں نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ پیدائش آدم علیہ السلام سے پہلے سے ہی حاضر وناظر ہیں۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ یہ آپ کا خواب وخیال ہے کہ ہم حضور ﷺ کے پیدائش آدم سے بھی قبل بالفصل ''حاضر وناظر'' ہونے کے قائل ہیں، ہم بار بار اس خیال سے برأت ظاہر کر آئے ہیں، نہ ہمارا یہ دعویٰ ہے، نہ ہمارے کسی عالم کا یہ قول ہے، اس لیے آپ اپنے خواب پریشاں سے جتنی جلد ممکن ہو نجات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

اور یہ بھی آپ کا خیال ہے کہ ہم نے اس حدیث کو حاضر وناظر ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، قصہ اصل یہ ہے کہ مولوی عبدالرؤف صاحب جھنڈے نگری نے حضور ﷺ کے حاضر وناظر ہونے کو خلاف عقل قرار دیتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ اگر رسول اللہ ﷺ ہر مردے کی قبر میں حاضر ہوں تو لازم آئے گا، کہ آپ ہر دم دورے میں رہیں کہ ساری دنیا میں مردے ہر دم دفن ہوتے رہتے ہیں، اور یہ دنیا کے کسی حاکم کے لیے عملاً ناممکن ہے، اور لازم آئے گا کہ آپ اپنی

حیات مبارکہ میں قبر کے باہر بھی رہیں اور ہر قبر میں حاضر ہونے کی وجہ سے زندہ در گور بھی ہوں۔

ہم نے اس کے جواب میں یہ لکھا تھا کہ یہ استحالہ آپ کو اس لیے نظر آیا کہ آپ نے پیغمبر خدا ﷺ کو بھی عام انسانوں پر قیاس کیا، حالاں کہ واقعہ ایسا نہیں ہے وہ اپنے ہر وصف میں بے مثال ہیں۔ دنیا میں آنے سے قبل ہی وہ درجہ نبوت پر فائز تھے، اور دنیا میں آ کر بھی بے مثال کہ جسم بے سایہ اور پسینہ مشک سے بہتر، اور عام برزخ میں بھی بے مثال کہ حقیقی زندگی کے ساتھ قبر انور میں موجود ہیں، تو دراصل حدیث ((کنت نبیًا)) مولوی عبدالرؤف صاحب کے ایک شبہ کا جواب تھی، نہ کہ مسئلہ حاضر و ناظر کے اثبات کی دلیل۔ اور اس سے آپ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس حدیث کو ہم نے ''حاضر و ناظر'' کی دلیل بنا کر پیش کیا ہے، آپ کی خام خیالی ہی ہے، ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بدخوابی اور بدخیالی دونوں ہی آزار سے صحت کلی عطا فرمائے۔

(۲) دوسرا الزام یہ ہے کہ حدیث مبارک ''کنت نبیاً'' کے معنی تو یہ ہیں کہ میں علم الٰہی میں نبی تھا، یعنی خدا کو حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت بھی یہ معلوم تھا کہ دنیا میں چالیس سال کا ہونے کے بعد مجھے نبوت ملے گی۔ لیکن بریلویوں نے حدیث میں یہ تحریف کی کہ اسی وقت سے درجہ نبوت پر فائز تھے اور آپ کو اسی وقت یہ منصب عطا کر دیا گیا تھا۔

دوسرے الزام کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کا دوسرا مطلب جس کو آپ بقلم خود تحریف قرار دے رہے ہیں اور بریلویوں کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ یہ بریلویوں کا بیان کردہ نہیں، بریلی اور وہابی اختلاف سے کئی صدی قبل تمام مسلمانوں کے ایک مسلم امام تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب ''شفاء السقام'' میں تحریر کیا ہے، یہ آپ کا کابوس ہے کہ ہر مخالف آپ کو بریلوی دکھتا ہے، اور اپنے خلاف ہر بات آپ کو تحریف نظر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بیماری سے بھی آپ کو نجات دے۔

رئیس صاحب نے اس دوسرے مطلب کو غلط ثابت کرنے کے لیے بھی کچھ ہاتھ پاؤں چلائے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بڑے طنطنے سے کہا ہے:

(۱) اس حدیث میں ''متی وجبت لک النبوۃ یارسول اللہ!'' ''یارسول اللہ آپ کے لیے نبوت کب ثابت ہوئی، کا مطلب ثابت ہوئی نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ کی نبوت کے بارے میں لوح محفوظ میں تحریر ہوئی۔ جیسا کہ دوسری حدیث تحریر ہے:

((إني عند الله مكتوب خاتم النبيين و آدم لمنجدل في طينه))
میں خدا کے نزدیک خاتم النبیین لکھا ہوا تھا اور آدم علیہ السلام کا خمیر گوندھا جا رہا تھا،
پس اسی طرح حدیث ''وجبت لک النبوۃ'' میں بھی وجبت کے معنی کتبت کے ہیں اور بات صرف تحریر کی ہے۔ درجہ نبوت ملنے کا کوئی سوال نہیں۔

(۲) خود لفظ ((وجبــــــت)) کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اسی وقت درجہ رسالت پر فائز ہو جائیں، جیسا کہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بشارت دی: ((وجبت لكم الجنة)) تو جس طرح اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ اسی وقت جنت میں جا کر رہنے لگے، اسی طرح ((وجبت النبوة)) کا مطلب نبی ہو جانا نہیں ہے۔

ان دونوں باتوں کے جواب میں ہماری گزارش ہے کہ آپ کی پہلی تاویل کے خلاف خود ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری حدیث کے لفظ کتبت کو پہلی حدیث کے لفظ وجبت کے معنی میں مانا ہے، اور ان کی تشریح سے امام تقی الدین رحمۃ اللہ علیہ کی تائید ہوتی ہے۔ حوالہ ملاحظہ ہو:

((عن أبي هريرة: متى وجبت أي: ثبت لك النبوة! قال: آدم بين الروح والجسد، أي: وجبت لي النبوة والحال أن آدم بين الروح والجسد، أنه مطروح على الأرض في صورة بلا روح.

وعن عرباض ابن سارية عن رسول الله ﷺ أنه قال: إني عبد الله مكتوب خاتم النبيين، أي مكتوب من هذه الحيثيته وأن آدم لمنجدل ،أي: ساقط في طينه، أي: كنت خاتم النبيين في حالة التي آدم مطروح على الأرض)) (مرقاة المفاتيح: ۳۶۷/۵)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اے اللہ کے نبی آپ کے لیے نبوت کب واجب ہوئی (یعنی ثابت ہوئی) آپ نے فرمایا: جب آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے، یعنی اس حالت میں میرے لیے نبوت ثابت ہوئی جب آدم علیہ السلام زمین پر پتلے کی صورت میں بے روح کے پڑے تھے۔ اور عرباض ابن ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کے وہاں اس وقت خاتم النبیین لکھا ہوا تھا (یعنی میرا

نام بحیثیت خاتم النبیین تحریر تھا) جب کہ حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اپنی مٹی میں پڑے ہوئے تھے (یعنی اسی حالت میں خاتم النبیین تھا)۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اس عبارت میں اس امر کی تصریح ہے کہ لفظ وجبت کا ترجمہ ثابت ہے، اسی میں ہے: آپ کا نام بحیثیت خاتم النبیین تحریر تھا۔ آخر میں نص فرمادی کنت نبیاً میں اسی وقت نبی تھا، پھر رئیس صاحب کا اس مطلب کو غلط قرار دینا خام خیالی کے علاوہ اور کیا ہے؟۔

اسی طرح لفظ "وجبت لکم الجنۃ" کا مطلب بے شک یہ نہیں ہے کہ اسی وقت جنت میں سکونت اختیار کریں، لیکن یہ معنی تو ضرور ہیں کہ اسی وقت سے اس آدمی پر جنتی ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔ اس کا رتبہ ان لوگوں سے بڑا ہوگا جن کے بارے میں جنتی ہونے کی تصریح نہیں۔ پس اسی طرح وجبت النبوۃ کے بھی یہ معنی نہیں۔ کہ آپ اسی وقت سے تبلیغ کرنے لگیں اور روحوں کو کلمہ پڑھانے لگیں، بلکہ یہ معنی ہے کہ آپ کو ﷺ یہ رتبہ مل گیا، آپ کی ذات پر نبوت کا اطلاق ہونے لگا، اور ان کو اس عالم میں بھی وہ اعزاز عطا ہوئے جو انبیا کے شایان شان ہیں۔

اس کو یوں سمجھیے کہ جس شخص نے آئی سی ایس کا امتحان پاس کرلیا ہو کلکٹر ہوگیا، یہ درجہ اور رتبہ اسے مل گیا، رہ گئی اس کی پوسٹنگ اور تقرری اس میں تاخیر ہوسکتی ہے۔ پس اسی طرح اس حدیث مبارک کا مطلب بھی ہے، کہ فائز درجہ نبوت پر تو آپ اسی وقت ہوگئے، لیکن اس کا ظہور اس عالم میں چالیس سال کی عمر میں ہوا۔

مسئلہ رویت باری تعالیٰ:

مخلوق کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ممکن ہے یا نہیں، اور ممکن ہے تو اس عالم میں یا عالم آخرت میں، معتزلہ (کلمہ گویوں میں ایک گمراہ فرقہ) اس بات کا قائل ہے کہ رویت باری تعالیٰ مطلقاً ناممکن ہے، نہ اس جہاں میں کوئی خدا کو دیکھ سکتا ہے نہ عالم آخرت میں کوئی اس کو دیکھے گا۔ ان کی دلیل یہ آیت مبارکہ ہے:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَار وَهُوَ يُدْرِكُ الأَبْصَار وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾

[الأنعام: س ٦. ت ١٣٠].

آنکھیں اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں کرسکتیں اور وہ آنکھوں کا ادراک رکھتا ہے، وہ لطیف ہے

اور خبر رکھنے والا ہے۔

اس کے برخلاف جمہور اہل اسلام کا کہنا یہ ہے کہ دیدار الٰہی اس عالم میں ممکن اور عالم آخرت میں واقع ہے۔خود قرآن عظیم میں ہے:

﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ . إِلَى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾

[القيامة:س ٧٥.ت ٢٢].﴾

کچھ چہرے قیامت میں تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کو دیکھیں گے۔

اور آیت اولی میں رویت کی نفی نہیں ہے ادراک اور احاطہ کی نفی ہے۔

ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ ایک جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں عرض کی:﴿رب أرني أنظر اليك.﴾ یا اللہ تو مجھے اپنا جمال دکھا میں تجھے دیکھوں گا،اگر رویت کا امکان ہی نہ ہو جیسا کہ معتزلہ کا خیال ہے تو یہ سوال عبث ہوگا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی اس صفت کی معرفت نہ ہوگی۔جو شان رسالت کے خلاف ہے۔

ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ آخرت میں دیدار الٰہی کا ثبوت یہ حدیث مشہور ہے:

((إنكم سترون ربكم كما ترون القمر ليلة البدر.))

(مسند احمد:٣٦٠/٤)

تم آخرت میں اپنے رب کو اسی آسانی سے دیکھو گے جیسے چودھویں رات کے چاند کو آسانی سے دیکھتے ہو۔

المختصر جمہور اہل اسلام کے اس بات پر اجماع کے بعد کہ رویت باری فی نفسہ ممکن ہے اور عالم آخرت میں جملہ مومنین کے لیے واقع ہے،اس بات پر اختلاف ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عالم دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا یا نہیں؟اکثر اہل علم تو وقوع رویت کے قائل ہیں لیکن ایک گروہ منکر بھی ہے،جس کی سرخیل ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں،اور اپنی عادت کریمہ کے موافق انہوں نے اس امر کو بڑے زوردار الفاظ میں بیان بھی کیا ہے۔جیسا کہ رئیس احمد صاحب نے ابطال ص:٨٨ پر نقل فرمایا ہے۔

لیکن ہم کو رئیس صاحب کی اس خیانت علمی پر سخت افسوس ہے کہ انہوں نے مسئلہ کے صرف ایک پہلو کے دلائل اس اطمینان سے نقل کیے کہ گویا اس مسئلہ میں کوئی اور رخ ہے ہی

نہیں۔

حالاں کہ جہاں انہوں نے ام المؤمنین کی حدیث ذکر کی وہیں ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، انس ابن مالک اور امام حسن کا یہ اثر بھی مذکور تھا: ''رأی محمد ﷺ ربه. ''حضور ﷺ نے شب معراج اپنے رب کو دیکھا۔

جہاں انہوں نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا: نورا فی السماء. وہیں انہیں آپ کا دوسرا قول بھی نقل کرنا چاہیے ''رأیت نورا'' میں نے نور دیکھا، یہ روایت بھی مسلم میں پہلی روایت کے متصل ہی ہے۔

مولوی صاحب مذکور نہایت خموشی سے امام نووی کا یہ الحاصل بھی ہضم کر گئے حالاں کہ یہ بیان کے قابل تھا، امام نووی بحث کا خلاصہ ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''فالحاصل أن الراجح عند أكثر العلماء أن رسول الله ﷺ رأى ربه بعيني رأسه لحديث ابن عباس وغيرهما مما تقدم، وإثبات هذا لا يأخذونه إلا بسماع عن رسول الله ﷺ.'' [مسلم جلد اول ص:۹۷]

خلاصہ یہ ہے کہ اکثر علما کے نزدیک راجح قول یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کو سر کی آنکھوں سے دیکھا، کیوں کہ ابن عباس وغیرہ اجلہ صحابہ اس بات کو رسول اللہ ﷺ سے سنے بغیر نہیں کہہ سکتے۔

اب اس امر کا فیصلہ ہم ناظرین پر چھوڑتے ہیں، کہ رئیس صاحب نے اکثر اہل علم کے قول پر پردہ ڈال کر کتنی حقیقتوں کا خون کیا ہے؟ اور اس حقیقت کے سامنے آجانے کے بعد رئیس صاحب کے وہم بالفرض کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

بوقت صبح شود ہمچو روز معلومت
کہ بہ کے باختنہ عشق در شب دیجور

عالم برزخ، اور حیات برزخی:

مولوی عتیق الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب ''خیر الانبیا'' میں حاضر و ناظر کے معنی بیان کرتے ہوئے اس امکان کا بھی ذکر کیا تھا، کہ رسول اللہ ﷺ اپنے جسم اقدس کے ساتھ عالم میں سیر کر سکتے ہیں۔

اس بات کو رد کرنے کے لیے رئیس احمد صاحب نے ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا ''عالم

برزخ سے کوئی دنیا میں واپس نہیں آئے گا"۔ [ابطال، ص:۱۰۲]

اور دلیل میں قرآن عظیم کی وہ آیتیں اور حدیثیں پیش کیں جن مین تشریح ہے کہ اہل جہنم خدائے تعالیٰ سے درخواست کریں گے، کہ تو ہم کو دنیا میں دوبارہ بھیج دے، تا کہ ہم اعمال صالحہ کریں۔ حکم ہوگا اب دوبارہ لوٹنا نہیں۔ یا شہدا تمنا کریں گے یا الٰہی ہم کو دنیا میں پھر بھیج دے کہ تیری راہ میں دوبارہ شہید ہوں، حکم ہوگا اب تمہاری واپسی دنیا میں نہ ہوگی۔

رئیس صاحب کی اس تقریر کا اگر صرف یہ مطلب ہو کہ عادت الٰہیہ یہی ہے کہ عام مردے عالم برزخ سے دار دنیا میں واپس نہیں ہوتے اور اسلام ہندومت کے آواگون کا قائل نہیں ہے تو صحیح ہے، لیکن اگر اس کا یہ مطلب ہو کہ اس عام عادت الٰہیہ کے برعکس بطور خرق عادت بھی کسی جانے والے کی دار دنیا میں واپسی ناممکن ہے، اور ایسی واپسی قدرت الٰہی سے باہر ہے تو یہ جھوٹ اور تصریحات قرآن وحدیث کے خلاف ہے۔

قرآن عظیم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں ہے:

﴿وَأُبْرِءُ الأَكْمَهَ والأَبْرَصَ وَأُحْيِـيُ الْمَوْتَى بِإِذْنِ اللّٰهِ﴾

[ال عمران:س ۳.ت ۴۹]

میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور برص والے کو اچھا کرتا ہوں، اور مردوں کو زندہ کرتا ہوں۔

رئیس صاحب بتائیں کہ اعجاز مسیحائی سے زندہ ہونے والے عالم برزخ سے پلٹ کر دنیا میں آئے یا نہیں؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں ہے:

﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَى لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ثُمَّ بَعَثْنَاكُم مِّن بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾

[البقرة:س ۲.ت ۵۵].

اے یہودیو! تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہم تو خدا کو دیکھے بغیر ایمان نہ لائیں گے، تو تم کو ایک کڑک نے پکڑ لیا اور تم دیکھتے ہی رہ گئے، پھر تم کو تمہاری موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا کہ تم اپنے خدا کا شکر ادا کرو۔

رئیس صاحب بتائیں ! کیا یہ سرمہ بصیرت بھی ان کی بے نور نگاہوں کے لیے کافی نہیں، ستر آدمی دیکھتے ہی دیکھتے مر گئے، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا، قدرت خداوندی سے دوبارہ جی آٹھے، کیا یہ بھی برزخ سے دار دنیا میں واپسی نہیں۔

حضرت عزیر علیہ السلام کا ذکر قرآن عظیم میں ان الفاظ میں ہے:

﴿ فَأَمَاتَهُ اللّٰهُ مِئَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْماً أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِئَةَ عَامٍ﴾ [البقرة: س ۲. ت ۲۵۹]

اللہ تعالیٰ نے سو سال تک کے لیے حضرت عزیر علیہ السلام کے جسم سے روح نکال لی پھر انہیں زندہ اٹھا کر پوچھا، کتنے دن یہاں ٹھہرے رہے، آپ نے عرض کی ایک دن یا اس سے کچھ کم، حکم ہوا سو سال تک آپ اسی عالم میں رہے۔

رئیس صاحب غور فرمائیں یہ سو سال کی موت کے بعد دوبارہ زندگی کا کارواں رواں دواں ہو جاتا۔ عالم برزخ سے واپسی نہیں تو کیا ہے۔

احادیث معراج میں تصریح ہے:

''وقد رأيتني في جماعة من الأنبياء، فإذا موسىٰ قائم يصلي، وإذا عيسىٰ قائم يصلي، وإذا ابراهيم قائم يصلي، فحانت الصلاة فأممتهم.''

(الشفاء: ۱/۳۵۰)

میں نے شب معراج خود کو انبیا کی جماعت میں پایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے، پھر نماز کا ٹائم ہوا تو میں نے ان سب پیغمبروں کی امامت کی۔

بولیے گذشتہ انبیائے کرام کا عالم برزخ سے اپنے اپنے مقامات کو چھوڑ آنا، اور بیت المقدس میں رسول اللہ ﷺ کی اقتدا میں نماز پڑھنا کس درجہ طویل مسافت کی سیر ہے، تو رئیس صاحب اس کو کیا کہیں گے؟۔

پس اسی طرح اگر حضور ﷺ بھی اپنے جسد عنصری کے ساتھ عالم برزخ سے اس عالم میں تشریف لائیں تو کیا شرعی قباحت لازم آئے گی؟ یہ عجیب لطیفہ ہے کہ رئیس صاحب کو ہر موقف میں صرف یک طرفہ نصوص نظر آتے ہیں، قرآن عظیم میں ایسے ہی موقعہ پر ارشاد ہوا:

﴿أَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾

[البقرة: س ۲. ت ۸۵] .﴾

کیا بعض کتاب اللہ پر ایمان لائے اور بعض کا کفر کرتے ہو۔

(۲) مسئلہ حیات النبی ﷺ میں مولوی عبدالرؤف صاحب کے یہاں بیان میں تضاد تھا، اپنی کتاب ''تردید حاضر و ناظر'' میں کہیں انہوں نے یہ لکھا تھا، کہ شہدا کے لیے قرآن عظیم میں بل أحياء آیا ہے، اس لیے وہ قبروں میں زندہ ہیں اور رسول اللہ کے لیے انک میت آیا ہے اس لیے وہ مردہ ہیں، کہیں یہ لکھا تھا کہ انبیا اپنی قبر میں زندہ نہیں رہتے اور اس کو حدیث شریف کا مضمون بتایا تھا، کہیں یہ لکھا تھا کہ حیات انبیا کے مسئلہ میں کوئی جان نظر نہیں آئی۔ اور ایک جگہ یہ بھی لکھا تھا کہ اپنی قبر میں ابدی راحت اور سرمدی آرام کے ساتھ ہیں۔

الشاہد ص: ۲۳۰ تا ۲۷ میں ہم نے اسی تضاد کو اجاگر کیا تھا، اور انبیا کی موت کے سلسلہ میں ان کے نظریہ کی تنقید کی تھی۔ مولوی رئیس صاحب نے اس کو ہماری زیادتی قرار دیا ہے، کہ ہم نے فاضل رحمانی اور دیگر علماے وہابیہ پر یہ الزام لگایا ہے کہ یہ لوگ حضور ﷺ کے قبر میں زندہ رہنے کے قائل نہیں ہیں، پھر سب کی طرف سے حیات برزخی کے سلسلہ میں یہ عقیدہ ظاہر کیا ہے:

''ہم بالفرض تمام انبیا بلکہ مومنین و شہدا کی حیات برزخی کے قائل ہیں اور پورا عقیدہ رکھتے ہیں کہ مرنے والا اپنے اپنے مرتبہ اور اعمال کے اعتبار سے عالم برزخ میں زندگی گزار رہا ہے۔ اور یہ کہ انبیاء و مرسلین اور شہدا کی لاش کو مٹی نہیں کھاتی، ہاں یہ عقیدہ کہ دنیاوی اعتبار سے انبیا کو مردہ نہ سمجھنا چاہیے تو اس کے باطل ہونے میں کوئی شک نہیں۔ یہ صرف بریلویوں کا اختراعی اور نوایجاد عقیدہ ہے۔ [ابطال، ص: ۹۶]

اس کے بعد جورگ وہابیت اچھلی تو اسی قسم کی آیتوں کی تلاوت شروع کر دی جس میں انبیاے کرام علیہم السلام پر موت طاری ہونے کا بیان ہے، اور اسی تضاد کا اظہار کیا جس کا شکار مولوی عبدالرؤف صاحب ہوئے ہیں۔

مولوی رئیس صاحب نے جہاں تک ہمارے الزام لگانے کی بات کہی ہے، اس کی صحت وسقم کا اندازہ ہماری کتاب کے مذکورہ بالا صفحات کا مطالعہ کر کے لگایا جا سکتا ہے، اور مولوی رئیس صاحب کے غلط بیانی کی داد دی جا سکتی ہے، ہمیں حیرت ہے کہ یہ شخص تصنیفی دیانت اور علمی

امانت کے خون پر کس درجہ جری ہے، اور خلاف واقعہ الزام تراشی کرتے ہوئے اس کو ذرا بھی خدا کا خوف نہیں ہوتا۔

بتو بتاؤ خدا کو جواب کیا دو گے　　خدا کے بندوں پہ یہ ظلم بندہائے خدا

مگر ہم بحث کو مختصر کرنے کے لیے رئیس صاحب کی تمام چالوں سے قطع نظر تسلیم کرتے ہیں۔ یہ حضرات بقول رئیس احمد صاحب انبیائے کرام کی برزخی زندگی کے قائل ہیں، لیکن اس دنیاوی زندگی جیسا نہیں سمجھتے، اور یہی علمائے اہل سنت و وہابیہ کا مابہ الاختلاف ہے، پھر بھی رئیس صاحب اتنا کہہ دینے سے عہدہ برآنہ ہوں گے، نہ اس کو بریلویوں کا نوایجاد عقیدہ کہہ دینے سے نجات ملے گی، کیوں کہ مولوی عتیق الرحمٰن صاحب مغفور کا ایک قرض فاضل رحمانی اور ان کے وکیل مولوی رئیس صاحب پر سوار ہے، جس کو نہ انہوں نے چکایا نہ مولوی رئیس صاحب نے ہاتھ لگانے کی ہمت کی۔

مولانا عتیق الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب میں رسول اللہ ﷺ کے قبر انور میں دنیاوی زندگی کے ساتھ زندہ رہنے پر شیخ محقق علی الاطلاق مولانا عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے حوالہ سے تمام علما اسلام کا اجماع نقل کیا تھا، اپنی کتاب الشاہد میں میں نے بھی اس موضوع پر فاضل رحمانی کو جھنجھوڑا تھا، لیکن جواب دیتے وقت وہ تو خیر کیا بولتے مولوی رئیس احمد صاحب بھی ذھول میں مبتلا ہو گئے، اس لیے رئیس صاحب کو اس اجماع کا جواب تو دینا ہی پڑے گا، اور یہ بھی بتانا ہوگا کہ مولانا عبدالحق محدث دہلوی اور ان کی روایت کے مطابق سارے علمائے اسلام کب سے بریلوی ہو گئے؟ کیوں کہ آپ کی تحقیق میں تو یہ عقیدہ بریلویوں کا تھا۔

مولانا رئیس صاحب آپ نے یہ حدیث تو سنی ہوگی: ”كفى بالمرء كذباً أن يحدث بكل ماسمع.“ آدمی کے جھوٹے ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ ہر سنی سنائی بات کو بیان کر دے، تو جب سنی سنائی کا یہ حکم ہے تو آپ کے اس تراشیدہ صاف نمودہ درافواہ رسیدہ کا کیا حکم ہوگا؟۔

قبر میں تشریف آوری:

بخاری شریف میں ایک حدیث ہے:

"((إن العبد إذا وضع في قبره وتولیٰ عنه أصحابه وأنه يسمع قرع نعالهم أتاه ملكان، فيُقعدانه، فيقولان: ما كنت تقول في هذا الرجل(لمحمد)؟فيقول: أشهد أنه عبده ورسوله، فيقال له: أنظر مقعدک من النار، قد أبدلک الله لک مقعدا من الجنة، فيراهما جميعاً...وفي ذكر الكافر: ويضرب بمطارق من حديد فيصيح يسمعها من يليه غير الثقلين."

[مشکوٰۃ باب اثبات عذاب القبر]

بندہ جب قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھی دفن کر کے واپس ہوتے ہیں اور وہ جانے والوں کے قدموں کی آواز سنتا ہے اسی وقت دو فرشتے آتے ہیں، اور پوچھتے ہیں کہ تو اس آدمی (رسول اللہ) کے بارے میں کیا کہتا ہے، وہ کہے گا میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں، تو اس سے کہا جاتا ہے کہ تو اپنا جہنم والا ٹھکانا دیکھ اس کے بجائے اللہ نے تجھے جنت میں ٹھکانا بخشا، تو وہ جنت اور دوزخ دونوں کو دیکھتا ہے.....اور کافر کے بیان میں یہ ہے کہ فرشتے اس کو لوہے کے گرز سے ماریں گے جس کے چیخ کی آواز آدمی اور جن کے علاوہ آس پاس کی ساری مخلوق سنتی ہے۔

(۱) اس حدیث میں ہے کہ قبر میں مردہ زندہ ہوتا ہے، اور دو فرشتے آتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس گڈھے میں سانس لینا ممکن نہیں، مردے کے علاوہ کسی کی گنجائش نہیں، مردہ زندہ کیسے ہوتا ہے اور مردہ کے علاوہ دو دو فرد سماتے کیسے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ساری واردات مردے پر خواب وخیال میں گذرتی ہیں؟۔

جمہور اہل اسلام کا جواب ہوگا خاموش کہ قبر میں جو کچھ گذرتا ہے یہ خواب وخیال نہیں ایک حقیقت نفس الامری ہے، کیا تم نے حدیث نہیں سنی، اللہ تعالیٰ نے روک دیا ورنہ جن وانس مردوں کی پکار سنتے۔ رہ گئے تمہارے سوالات اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عالم برزخ کا معاملہ ہے، اس کو دنیا پر قیاس نہ کرو، وہ یہاں سے ہماری سمجھ میں نہیں آئے گا، جس طرح ماں کے پیٹ کا بچہ اس عالم دنیا کی وسعت اور حوادث کا اندازہ پیٹ میں رہ کر نہیں لگا سکتا، اسی طرح اس دار دنیا سے عالم برزخ کی حقیقتوں کا اندازہ نہیں کر سکتے، یہ بات تو تب سمجھ میں آئے گی جب آدمی اس عالم میں پہونچے گا۔

(۲) اسی حدیث میں یہ بھی ہے کہ مردے کو اٹھا کر بٹھائیں گے۔ آپ پھر حیرت سے دریافت کریں گے اگر یہ امر واقع ہے تو قبر میں اتنی جگہ کہاں ہے اور اس کا امکان کیوں کر ہے؟ پھر وہی جواب ملے گا: خاموش عالم برزخ کا ہر امر واقعی اور حقیقی ہے، خواب وخیال کی یہاں گنجائش نہیں، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ عالم برزخ کی واردات کو دار دنیا پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔

(۳) اسی حدیث میں ہے، مردے کو جنت اور دوزخ دونوں دکھائی جائیں گی۔

آپ حیران ہو کر سوال دہرائیں گے، جنت جس کی وسعت میں ساتوں آسمان اور زمین سما جائیں، وہ یہاں قبر میں کہاں؟ جواب ہو گا وہ واقعی جنت ہی کو دیکھے گا، تم اس کو اس دنیا میں قبر کے اندر نہ تلاش کرو، نہ قبر کے آس پاس ڈھونڈو، یہ عالم برزخ کی بات ہے جو ہماری اس دنیاوی زندگی میں ہم سے دور ہے۔

(۴) اسی حدیث میں کافر کے لیے گرز کا ذکر ہے اور اس کے چیخنے کا بیان ہے، بعض روایتوں میں مومن کے لیے ستر ستر گز قبر کے وسیع ہونے کا بیان ہے۔ وہ بھی واقعی، حقیقی اور نفس الامری ہے۔ الغرض اس قسم کی جتنی چیزوں کا ذکر ہے سب کا تعلق واقع اور حقیقت سے ہے، خواب وخیال سے نہیں۔

سوال یہ ہے کہ اسی حدیث میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف اشارہ کر کے پوچھیں گے کہ یہ کون ہیں؟ تو کیا اشارہ کرتے وقت حقیقۃً رسول اللہ ﷺ کی ذات مردہ کے سامنے ہوتی ہے، یا مردہ کے دماغ میں رسول اللہ ﷺ کا جو تصور اور خیال ہے اس کی طرف اشارہ ہوتا ہے؟۔

اگر آپ اس سوال کے جواب میں یہ کہنے لگیں کہ رسول اللہ واقعۃً وہاں موجود نہ ہوں گے، بلکہ مردے کے دماغ میں حضور کا جو تصور ہے اس کی طرف اشارہ ہوگا، کیوں کہ ہر مردے کی قبر میں حضور ﷺ کا تشریف لانا ایک امر محال ہے۔

تو میں آپ سے پوچھنا چاہوں گا کہ اس موقع پر کیا آپ کا جواب ایمان دارانہ ہے، برزخ میں پیش آنے والی کون سی چیز ہے جو آپ کے عقل میں آرہی ہے، مگر آپ نے سب کو واقعی اور حقیقی مانا، اور سب کو عقل کے خلاف ہوتے ہوئے برزخ کے حوالہ کیا تو صرف ذات رسول کے سلسلہ میں آپ کی یہ عقل کہاں سے کود پڑی، اور یہاں آپ عالم برزخ کو کیوں بھول گئے۔

اس لیے اس پوری حدیث کے پس منظر میں ایک فطری بات یہی ہے کہ، جب قبر کا ہر

منظر آپ نے واقعی مانا تو یہ اشارہ بھی واقعی ہوگا، اور اشارہ کے وقت ذات رسول بھی وہاں موجود ہوگی۔ نیز خیال وتصور کی طرف اشارہ تو اس شخص کے لیے ممکن ہوگا جو مسلمان ہو، اور جس کے تصور میں رسول اللہ ﷺ کا خیال رہتا ہے، لیکن ایک غیر مسلم جو پیغمبر اسلام کے بارے میں کبھی سوچتا ہی نہیں، جو مرتے وقت بھی اپنے دیوتاؤں کے تصور میں مرا، بھلا مرنے کے بعد یک بیک اس کے خیال میں رسول اللہ ﷺ کا تصور آنے کا کیا موقع ہے، کہ اشارہ خیال کی طرف مانا جائے، اور یہ سوال تو سبھی سے ہوگا، ہاں یہ عین ممکن ہے اور فطری بھی کہ جس طرح شناخت کے وقت متعلقہ شخص کو سامنے کر کے پوچھا جاتا ہے، اس کو پہچانتے ہو؟ اسی طرح حضور ﷺ کو بھی مردے کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، مومن چوں کہ زندگی بھر ان کے اوصاف سنتا رہا، ان کے خیال میں مست رہا، مرتے دم بھی ان کے تصور میں سرشار رہا کہ قبر میں زیارت ہوگی، دیکھتے ہی پکار اٹھے گا: هو عبد الله ورسوله۔

آج پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسی گور کی رات ہے اس گل سے ملاقات کی رات

اور کافر چوں کہ زندگی بھر ان سے سروکار نہیں رکھتا تھا، اس لیے اس کو کہنا پڑے گا: ''هاها لا أدري'' افسوس میں نہیں جانتا۔

اور اسی بات کی تائید زبان وبیان کے اصول سے بھی ہوتی ہے، چناں چہ عربی زبان میں لفظ ''هـــذا''، محسوس، مبصر اور قریب کی چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اور یہ اس لفظ کے حقیقی معنی ہیں، تو قبر میں جس ذات پاک کی طرف لفظ ''هـــذا'' کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے، اس کو قریب بھی ہونا چاہیے، نظر بھی آنا چاہیے، اور محسوس بھی ہونا چاہیے، اور کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنی سے پھیر کر مجازی معنی مراد لینے کے لیے کوئی قرینہ بھی ہو۔

حدیث مذکورہ بالا میں جب دیگر اشیا کے خلاف عقل ہوتے ہوئے بھی آپ نے حقیقی معنی مراد لیا ہے، تو اس لفظ ''هـــذا'' کے حقیقی معنی مراد لینے سے بھی عقل مانع نہیں ہوسکتی۔ اور حدیث میں معنی حقیقی کے خلاف مجازی معنی مراد لینے پر کوئی قرینہ بھی نہیں ہے، انہیں وجوہ کی بنا پر علماء کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ قبر میں حضور ﷺ بنفس نفیس موجود ہوں گے۔ اور انہیں کو دکھا کر انہیں کی طرف اشارہ کر کے منکر نکیر کہیں گے: ''ماتقول في هذا الرجل'' اس آدمی کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ قسطلانی میں ہے:

''والقائل به إنما استند لمجرد أن الإشارة لا تكون إلا للحاضر، ولكن يحتمل أن يكون الإشارة لما في الذهن فتكون مجازاً.''

[حاشیہ مشکوٰۃ، ص:۲۴]

اور حضور کے قائل نے اس بات پر بھروسہ کیا کہ ''ھـــذا'' کا اشارہ محسوس، مبصر کی طرف ہی ہوتا ہے، لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ اشارہ موجود فی الذہن کی طرف ہو اور معنی مجازی مراد ہوں۔

ہم یہاں نہایت ادب سے امام قسطلانی سے عرض کریں گے، حضور آپ کی امامت وسیادت برحق، اور فضل وکمال سر اور آنکھ پر لیکن لفظ ''ھذا'' کو یہاں اپنے معنی حقیقی سے پھیرنے والا کون سا قرینہ ہے۔ ارشاد فرمایا جائے گا، اگر کوئی قرینہ نہیں ہے تو معنی مجازی کا قول تحکم ہوگا، اور حقیقی حضور کا قول کرنے والے برحق ہوں گے۔

حضرت عبد الحق محدث دہلوی نے بھی یہ قول نقل کیا ہے، مگر تھوڑے تصرف کے ساتھ وہ فرماتے ہیں: ''یا باحضار ذات شریف وے درعیان بایں طریق کہ در قبر مثالی از حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حاضری ساختہ باشد''۔

یا نفس الامر میں آپ کی ذات مبارکہ قبر میں حاضر کی جاتی ہے، اس طور پر کہ حضور کو آپ کے جسم مثالی کے ساتھ لایا جاتا ہو۔

حضرت شیخ کا منشا اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ وہ لفظ ''ھـــذا'' کو حقیقی معنی پر ہی محمول کرتے ہیں، اسی لیے آپ کی ذات شریف کو قبر میں حاضر کرنے کی بات کرتے ہیں، تا کہ لفظ ''ھذا'' کے تینوں معانی کا تحقق ہو۔ آپ محسوس ہوں، دیکھے بھی جائیں، اور قریب بھی ہوں، لیکن یہ بات انہیں مستبعد معلوم ہوئی کہ جسد عنصری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ہی ہے جو اس دنیا میں رہا، اور اب مدینہ منورہ میں قبر شریف میں ہے۔ اور مردے ہر دم اور ہر جگہ ہوتے ہیں، اور بات عالم برزخ کی ہے جہاں ایک شخص کے متعدد جسم ہو سکتے ہیں، اور اس میں کوئی استبعاد نہیں، اس لیے فرمایا: حضور ہر قبر میں لائے جاتے ہیں، لیکن جسد عنصری کے ساتھ نہیں عالم برزخ کے جسم مثالی کے ساتھ۔

یہی وہ چیز ہے جس کو رئیس صاحب نے اپنی کم علمی سے فوٹو اور تصویر سمجھ رکھا ہے، اس عبارت میں مثال کا ترجمہ فوٹو اور تصویر ہو ہی نہیں سکتا، کیوں کہ شیخ نے فرمایا: ''احضار ذات

شریف وے درعیاں" قبر میں حضور کی ذات پاک لائی جاتی ہے، بھلا فوٹو کو بھی کوئی ذات کہتا ہے، فوٹو فوٹو ہے آدمی کی ذات نہیں ہوسکتا، مگر ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ رئیس صاحب اس قسم کے معاملات میں قابل عفو ودرگزر ہیں، بے چارے اپنے مبلغ علم بھر ہی تو بات کر سکتے ہیں۔

قسطلانی نے ایک قول اور نقل کیا:

"قیل یکشف للمیت حتی یری النبي ﷺ." [حاشیہ مشکوٰۃ: ص ۲۴]

میت اور حضور کے درمیان حجاب اٹھادیا جاتا ہے تو میت رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا ہے۔

امام قسطلانی بھی اس قول کی یہی توجیہ کرتے ہیں کہ "ھذا" محسوس مبصر کے لیے ہے۔

اس واسطے از روے لفظ حدیث قبر میں مردے کو رسول اللہ ﷺ کا محسوس ہونا اور نظر آنا ضروری ہے، اس توجیہ پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ "ھــذا" کے مفہوم میں مشار الیہ کا قریب ہونا بھی تو ضروری ہے، اور جب حضور ﷺ اپنی قبر اطہر میں ہوتے ہیں اور مردہ اپنی قبر میں تو حجابات اٹھنے کے باوجود قرب کہاں ہوا۔ اس لیے "ھــذا" سے اشارہ کی کیا سبیل ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دور کی چیز بھی دیکھنے والے کو قریب محسوس ہوتی ہے، جیسے چاند حقیقت مین زمین سے تقریباً ڈھائی کروڑ میل دور ہے، لیکن دیکھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ میل دو میل کی دوری پر ہوگا اور وہ کہہ اٹھتا ہے "ھــذا الھلال واللہ. واللہ العظیم." چاند یہ رہا، اسی طرح گو حقیقت میں سرور عالم ﷺ اپنی قبر میں ہوتے ہیں، لیکن دیکھنے والے کو قریب محسوس ہوتے ہیں اور فرشتے انہیں دکھا کر کہتے ہیں: "ماتقول في ھذا الرجل"

میں یہ مانتا ہوں کہ علما نے اس احتمال کا بھی ذکر کیا ہے کہ اشارہ سید عالم ﷺ کے اس خیال کی طرف ہے جو مرنے والے کے ذہن میں ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ بھی مذکورہ بالا احتمالوں کی طرح ایک احتمال ہی ہے، جیسا کہ قسطلانی نے تصریح کی ہے:

"ویحتمل أن یکون الإشارة لما في الذھن."

پھر اسی کو ترجیح ہو اور اوپر والے احتمالات متروک ہوں، آخر ایسا کیوں ہوا، وجہ ترجیح کے بغیر ایسا نہیں کیا جاسکتا۔

رہ گئے ہمارے رئیس صاحب ان کو تو اپنے من کی کوئی بات مل جانی چاہیے، پھر صحت

وسقم سے قطع نظر وہی بات ان کے لیے وحی الٰہی ہوجاتی ہے، امام قسطلانی کی ''معہود فی الذہن'' والی عبارت خود ہی نقل کرتے ہیں، اور اس بات پر ہمارا مذاق بھی اڑاتے ہیں کہ ہم نے احتمالات کا سہارا لیا ہے، گویا آپ نے اشارہ والی بات جو کہی ہے وہ کوئی نص قطعی ہے، احتمال ہونے میں سبھی برابر ہیں، اس لیے اس کا طعنہ دینا بے کار ہے۔

رئیس صاحب بڑے فخر سے کہتے ہیں: امام قسطلانی نے کہا حضور اور مردے کے درمیان سے پردہ اٹھانے کا کوئی ثبوت ہی نہیں، میں کہتا ہوں، کیا کسی روایت میں ایسا ہے کہ پردہ نہیں اٹھے گا۔ بلکہ معہود فی الذہن کی طرف اشارہ ہوگا؟ نہیں ہے، تو پھر موجود ذہنی کی طرف اشارے والی بات کا بھی تو کوئی ثبوت نہیں ہوا، پھر اس پر آپ کیوں اترا رہے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ کسی روایت میں منصوص طریقہ پر نہ یہ لکھا ہے کہ جسد عنصری کے ساتھ آپ قبر میں تشریف لائیں گے، نہ منصوص طور پر یہ ہے کہ وجود ذہنی کی طرف اشارہ ہی کیا جائے گا، صرف یہی ایک حدیث ہے کہ ''ھذا الرجل'' کہہ کر ان کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔ اور اس کے وہ چاروں معنی بیان کیے گئے ہیں اور ہر ایک نے اپنے اپنے ذوق کے موافق مراد لے کر اس کی کچھ ترجیحات شمار کرائیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عقل ونقل کی کسوٹی پر اس کو پرکھا جائے کہ دلائل کس کا ساتھ دے رہے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا کہ لفظ کو اس کے حقیقی معنی سے پھیرنے کے لیے معنی حقیقی کا عقلاً محال ہونا اور قرینہ صارفہ کا موجود ہونا ضروری ہے، اور اس معاملہ میں معنی حقیقی کا مراد لینا تو اس لیے محال نہیں کہ اس سے بڑے بڑے محالات کو خود آپ نے اسی حدیث میں عالم برزخ کا معاملہ کہہ کر قبول کرلیا ہے۔ تو صرف ایک امر کو خلاف عقل کہہ کر کیسے رد کرسکتے ہیں۔ اور حدیث میں قرینہ صارفہ کا تو کہیں دور دور تک پتہ نہیں ہے، اس لیے ہم مجبور ہیں کہ معنی حقیقی مراد لیں۔

مگر رئیس الاحرار صاحب کے قربان جایئے وہ اپنے نام کی طرح بالکل بے قید وآزاد نکلے، انہوں نے ایک سند ڈھونڈ نکالی کہ بے قرینہ لفظ ''ھذا'' کے مجازی معنی خود حدیث میں مراد لیے گئے ہیں، آپ تحریر کرتے ہیں:

''قیصر روم نے مدینہ سے سیکڑوں میل دور پر ابوسفیان سے پوچھا: ''ما ھذا الرجل

الذي بعث فيكم ''تو کیا قیصر روم نے حضور کو سامنے لاکر کھڑا کر دیا تھا؟۔

[ابطال، ص:۱۰۰۔۱۰۱]

نہیں صاحب بالکل سامنے لاکر کھڑا نہیں کیا تھا، لیکن وہ آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے تھے کہ دور دور تک رسول اللہ ﷺ اپنے جسد عنصری کے ساتھ یہاں موجود نہیں ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر ''ھذا'' کے معنی وہ موجود شخص لیتے تو یہ بات مشاہدہ کے خلاف ہوتی۔ اور یہی مشاہدہ کی تکذیب وہاں قرینہ بن گئی کہ ''ھذا'' کے حقیقی معنی نہیں بلکہ مجازی معنی مراد ہیں۔ پھر دوسرے قرائن بھی ہیں، رسول اللہ ﷺ کا خط ہرقل کے پاس پہونچا تھا، اور ہرقل نے اسی کی تفتیش کے سلسلہ میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو اپنے دربار میں بلایا تھا۔ پس اس ماحول میں لازماً یہ خیال آنا ضروری تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ہی پوچھ گچھ ہوگی۔ ایسی حالت میں اس نے ''الرجل'' کہا تو ذہن لامحالہ رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

یہاں منکر نکیر کے سوال کے وقت کس نے عالم برزخ میں جاکر مشاہدہ کیا ہے کہ یہاں رسول اللہ ﷺ عیاناً موجود نہیں کہ ''ھذا'' کے معنی مجازی مراد ہونے پر اس کو قرینہ قرار دیا جائے۔

رئیس صاحب نے احتیاطاً ایک حدیث اور ڈھونڈ نکالی جس میں ایسے الفاظ ہیں جن کو رئیس صاحب نے حقیقت کے خلاف معنی مجازی مراد لینے کا قرینہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

''امام محمد طبرانی کی روایت میں ہے کہ مردے سے جب ''ماتقول في هذا الرجل'' کہا جاتا ہے تو وہ پوچھ لیتا ہے: ''من'' تو جواب ملتا ہے کہ ''محمد'' اگر آپ موجود ہوتے تو اس سوال و جواب کی کیا ضرورت؟۔ [ابطال، ص:۱۰۱]

مگر ہمیں افسوس ہے کہ رئیس صاحب کی یہ کوشش بھی رائگاں ہی گئی، کیوں کہ یہ سوال و جواب وہاں موجود نہ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا، کیوں کہ آپ کے وہاں موجود ہونے کے بعد بھی، آپ کو دیکھ کر اور محسوس کر کے بھی آدمی آپ کے بارے میں پوچھ سکتا ہے، کہ جن کو مجھے دکھا رہے ہو یہ کون ہیں، اور اس کا خود رئیس صاحب کو بھی اعتراف ہے، وہ خود لکھتے ہیں: ''پھر یہ ضروری نہیں ہے کہ جس نے آپ کو (زندگی میں) نہ دیکھا ہو، وہ آپ کو پہچان ہی لے''۔

تو عین ممکن ہے کہ ایسے ہی لوگوں کے لیے وہ سوال و جواب ہو، جو دیکھنے کے بعد بھی

آپ کو نہ پہچان پائیں گے، کیوں کہ عام اور صحیح ترین روایتوں میں تو اس کا کوئی ذکر نہیں، پس جب موجودگی کے بعد یہ سوال وجواب ہوسکتا ہے تو یہ سوال وجواب عدم موجودگی کا قرینہ کیسے بن سکتا ہے؟۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حدیث مذکور میں لفظ ''ھـذا الـرجل'' کے مندرجہ ذیل مطالب ہوسکتے ہیں:

(۱) آپ ہر مردے کی قبر میں اپنے جسد عنصری کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔

(۲) جسد عنصری کے ساتھ تو نہیں البتہ جسم مثالی کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔

(۳) آپ کسی مردے کی قبر میں تشریف نہیں لاتے اپنی قبر انور میں ہی تشریف فرما ہوتے ہیں، لیکن ہر مردے کے سامنے سے حجابات اٹھا دیے جاتے ہیں اور وہ اپنی قبر سے ہی حضور ﷺ کا دیدار کر لیتا ہے۔

یہ تینوں معانی لفظ ''ھـذا'' کے حقیقی معنی کے ترجمان ہیں، اور بلا قرینہ معنی حقیقی سے انحراف جائز نہیں۔

(۴) آپ کہیں موجود نہیں ہوتے، ہر مردے کے ذہن میں رسول اللہ ﷺ کا جو خیال ہے اسی کی طرف اشارہ ہے، ان معانی کے مالہ وما علیہ پر بحث گزر چکی۔

اب ذرا پلٹ کر حاضر وناظر کے معنی پر بھی اک نگاہ ڈالی جائے، اور رئیس صاحب کے ریمارک کی قدر وقیمت کا اندازہ لگایا جائے۔

(۱) قوت قدسیہ والا ایک جگہ رہ کر تمام کو اپنے کف دست کی طرح دیکھے (شاہد ص:۴۷) یہ معنی یہاں حدیث کے مذکورہ بالا معانی میں سے تیسرا معنی ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ وہاں آپ ایک جگہ ہیں اور سارے عالم کو دیکھ رہے ہیں۔ اور یہاں بھی آپ ایک جگہ ہیں اور سارے عالم کے مردے آپ کو دیکھ رہے ہیں، یعنی دونوں طرف سے انکشاف ہے۔

اس پر یہ کہنا کہ ''ایک چاند سارے عالم کے گھر میں کہاں اتر آتا ہے'' زبان وبیان اور عام محاورہ کو منہ چڑھانا ہے، کیوں کہ یہ عام محاورہ ہے کہ ''چاند ایک ہی جگہ ہے مگر جہاں جاؤ اس کو موجود پاؤں گے۔ مندرجہ ذیل شعر:

والقمر من حيث التفت رأيته　　　يعطيك في عينيك نوراً ثاقباً

اسی حقیقت کی ترجمانی ہے اور حاضر و ناظر سے ہمارا ایک مطلب یہ بھی ہے:

(۲) ایک آن میں تمام عالم کی سیر اس جسم کے ساتھ جو قبر میں مدفون ہے، (الشاہد، ص:۲۷) یہ معنی ٹھیک وہی ہے جس کو یہاں معانی حدیث میں (۱) پر درج کیا گیا۔

(۳) ایک آن میں تمام عالم کی سیر جسم مثالی کے ساتھ (الشاہد ص:۲۷) یہ معنی یہاں (۲) سے بیان ہوئے۔

پس ثابت ہوا کہ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کا اور دلائل کے ساتھ حدیث مذکور کو بھی اپنی تائید میں پیش کرنا ایک وجہ وجیہہ رکھتا ہے اور اس کے خلاف کی خامہ فرسائی فضول گوئی میں داخل ہے۔

مرا گفت کہ اے نازنیں زپردہ برآ — بغمزہ برصف مرداں شیر افگن زن

معجزہ وقتی یا دوامی:

اس عنوان کی تقریب یہ ہے کہ مولوی عتیق الرحمٰن خاں صاحب مرحوم نے حضور سید عالم ﷺ کے علم عام و تام کے اثبات کے لیے دو حدیثیں پیش کی تھیں:

(۱) ''فوضع كفه بين كتفي فوجدت برد أنامله بين ثدي فتجلى لي كل شيء وعرفت.'' (صحیح بخاری:۲/۱۵۵)

اللہ تعالیٰ نے اپنا دست قدرت میرے شانوں کے درمیان رکھا تو میں نے وصول فیض اپنے سینے میں محسوس کیا، تو ہر چیز میرے لیے روشن ہوگئی اور پہچان لیا۔

(۲) ''لا تسئلوني عن شيء إلا نبأتكم وأنا في مقامي هذا.''
(مسند امام احمد:۲/۵۰۳)

جب میں منبر پر ہوں تم مجھ سے جو پوچھو گے بتاؤں گا۔

ان حدیثوں پر مولوی عبدالرؤف صاحب کے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں حدیثوں میں ایک خاص وقت میں انکشاف اور تعلیم کا ذکر ہے، لہٰذا منطق کی اصطلاح میں یہ قضیہ وقتیہ ہوا۔ اور ایسے احکام اسی وقت تک محدود رہتے ہیں جس وقت کا ذکر اس جملہ میں ہو۔ اس لیے جب تک یہ انکشاف رہا مثلاً پہلی حدیث میں خواب کے اندر اور دوسری حدیث میں قیام منبر تک اسی وقت تک حضور ﷺ کو علم مشاہدہ رہا جب وہ وقت ختم ہوا وہ علم و مشاہدہ ختم

ہوا۔ اور آپ اس انکشاف سے پہلے جس طرح بے خبر تھے ایسے ہی اب بھی بے خبر ہو گئے۔

ہم نے اس کے جواب میں کہا تھا اولاً:۔ آدمی کو اسی کام میں ہاتھ ڈالنا چاہیے جسے وہ جانتا ہو، آپ نے خواہ مخواہ منطق کی اصطلاح استعمال فرمائی اور فضیحت میں پڑے، قضیہ وقتیہ میں حکم بشرط الوقت ہوتا ہے، اور حدیث "تجلی لي کل شيء" میں وقت اس انکشاف کی شرط نہیں ہے، صرف ظرف ہے، اس لیے اس کو آپ کا قضیہ وقتیہ کہنا غلط ہے۔ اور آپ اپنے معلومات پر نظر ثانی کریں۔

اور ثانیاً:۔ کھینچ تان کر اگر وقتیہ بھی ہو جائے، تو دوسری حدیث میں قیام کی شرط اخبار کے لیے ہے، تو آپ کا خبر دینا قیام منبر تک مخصوص رہے گا۔ نہ کہ اس کا جاننا۔ اور ہمارا استدلال حدیث کے لفظ أنبأتکم سے نہیں ہے، حضور ﷺ کے قول "لا تسئلوني عن شيء" سے ہے کہ جو چاہو پوچھو؟ اس لیے آپ کا اعتراض اس پر بھی بے موقع ہی ہے۔

ابطال میں مولوی رئیس احمد صاحب نے معجزات کے عنوان سے جو بات ذکر کی ہے، وہ گویا ہمارے انہیں مواخذوں کا جواب ہے کہ معجزات وقتی بھی ہوتے ہیں کہ جس وقت اس کا ظہور ہوا اسی وقت کے لیے، نہ اس کے پہلے نہ اس کے بعد، اور حاضر و ناظر ہونا بھی ایسے ہی معجزات میں ہے جو وقتی ہیں، اس لیے اگر کسی حدیث میں آپ کا کامل علم و انکشاف ثابت ہو بھی تو اس کا مطلب صرف تھوڑی دیر کے لیے علم انکشاف ہوتا ہے بعد میں نہیں۔

رئیس صاحب کی اس بات پر ایک سوال تو وہ ہے جسے ہم نے مولوی عبد الرؤف صاحب سے کیا تھا جواب تک لا جواب ہے، اور جس سے مولوی صاحب کی وکالت کے باوجود رئیس صاحب بھی دم سادھے رہے۔ وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کے اسی علم و انکشاف کو تو آپ لوگ شرک کہتے ہیں، تو کیا کوئی شرک ایسا بھی ہے جو تھوڑی دیر کے لیے ہو تو شرک نہیں؟۔

دوسرا قابل ذکر لطیفہ یہ ہے کہ بعض معجزات وقتی ہوتے ہیں اس پر تو رئیس صاحب نے بڑی گرما گرم بحث کر ڈالی، اور منکر پر کفر کا فتویٰ بھی لگا دیا، حالانکہ ان کا خصم بھی اس سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن دوسرا مقدمہ کہ معنی حاضر و ناظر رسول اللہ کا وقتی معجزہ ہے اس سے صاف دامن بچا گئے، نہ کوئی عقلی دلیل پیش کی نہ نقلی، اور بے چارے پیش بھی کہاں سے کرتے، دلیل تو قرآن و حدیث میں اس بات کی ہے کہ یہ آپ کا دوامی معجزہ ہے۔ ملاحظہ ہو:

یہ امت کا اجماعی مسئلہ ہے کہ قرآن عظیم رسول اللہ ﷺ کا دوامی معجزہ ہے، اسی قرآن عظیم میں ہے: ﴿ونزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شيء. ﴾ ہم نے آپ پر کتاب اتاری جس میں ہر چیز کا کھلا بیان ہے، تو جب تک قرآن ہے تب تک یہ بیان اور اسی وقت تک رسول اللہ ﷺ کا علم پس علم رسول دوامی ہوا۔

اور حدیث شریف میں ہے ''إن اللہ قد رفع لي الدنیا، فأنا أنظر إلیها وإلی ماھو کائن فیها إلیٰ یوم القیامة. '' دنیا میرے سامنے لائی گئی تو میں اس میں جو کچھ قیامت تک ہے دیکھتا رہوں گا۔

اس حدیث مبارک پر مولوی عبد الرؤف صاحب نے تنقید بھی کی جس کا جواب ہم نے الشاہد میں دیا، وہ تو چپ ہیں ہی مولوی رئیس احمد صاحب مولوی عبد الرؤف صاحب کے وکیل بھی خاموش رہے جس کا مطلب یہی ہے کہ یہ حدیث ان حضرات کو تسلیم ہے، پس یہ حدیث تو الحمد للہ ہمارے دعویٰ کا عین بیان ہے۔

اس لیے وقتی اور دوامی معجزہ کی موشگافی مولوی رئیس صاحب کے لیے وبال ہی ثابت ہوئی۔ ﴿وکذلک العذاب ولعذاب الآخرة أکبر لو کانوا یعلمون﴾.

ہاں یہ علم وانکشاف باری تعالیٰ کے علم وانکشاف کی طرح نہیں کہ ایک آن کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو، توجہ نہ رہے تو یہ امور آنکھوں سے اوجھل بھی ہوجاتے ہیں، اور ذہن سے نکل بھی جاتے ہیں، مگر ایسے ہی کہ پھر توجہ ہوئی تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے پھر منکشف فرما دیتا ہے جیسا کہ سفر معراج میں بیت المقدس کے علم سے وہاں کے وقت در پیش ہوا جس کا حوالہ خود رئیس صاحب نے بھی دیا ہے: ع

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

پسینہ اور سایۂ رسول:

اس سلسلہ میں مولوی رئیس احمد صاحب کا خاص اعتراض یہ ہے کہ ان امور کو مسئلہ حاضر وناظر سے کوئی تعلق نہیں، گذارش ہے کہ ان امور کو اس مسئلہ کے ثبوت میں پیش بھی تو نہیں کیا گیا ہے، ان کا حوالہ تو صرف اس لیے دیا گیا تھا کہ آپ صاحبان ہر معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کو عام انسانوں پر قیاس کرنا چھوڑ دیں، ان کی بارگاہ بہت عالی اور ذات نہایت بلند ہے۔

نسبتے نیست بہ ذات تو بنی آدم را　　زانکہ از عالم وآدم تو چہ عالی نسبی

فہرست مضامین "الشاہد"

REPLY TO M. RAYEES

☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆

الشاهد

ہماری دیگر مطبوعات

حواشی امام احمد رضا

مطلع القمرین